اہنامہ

زاویہ

یویارک

مبر ۲۰۰۰ء

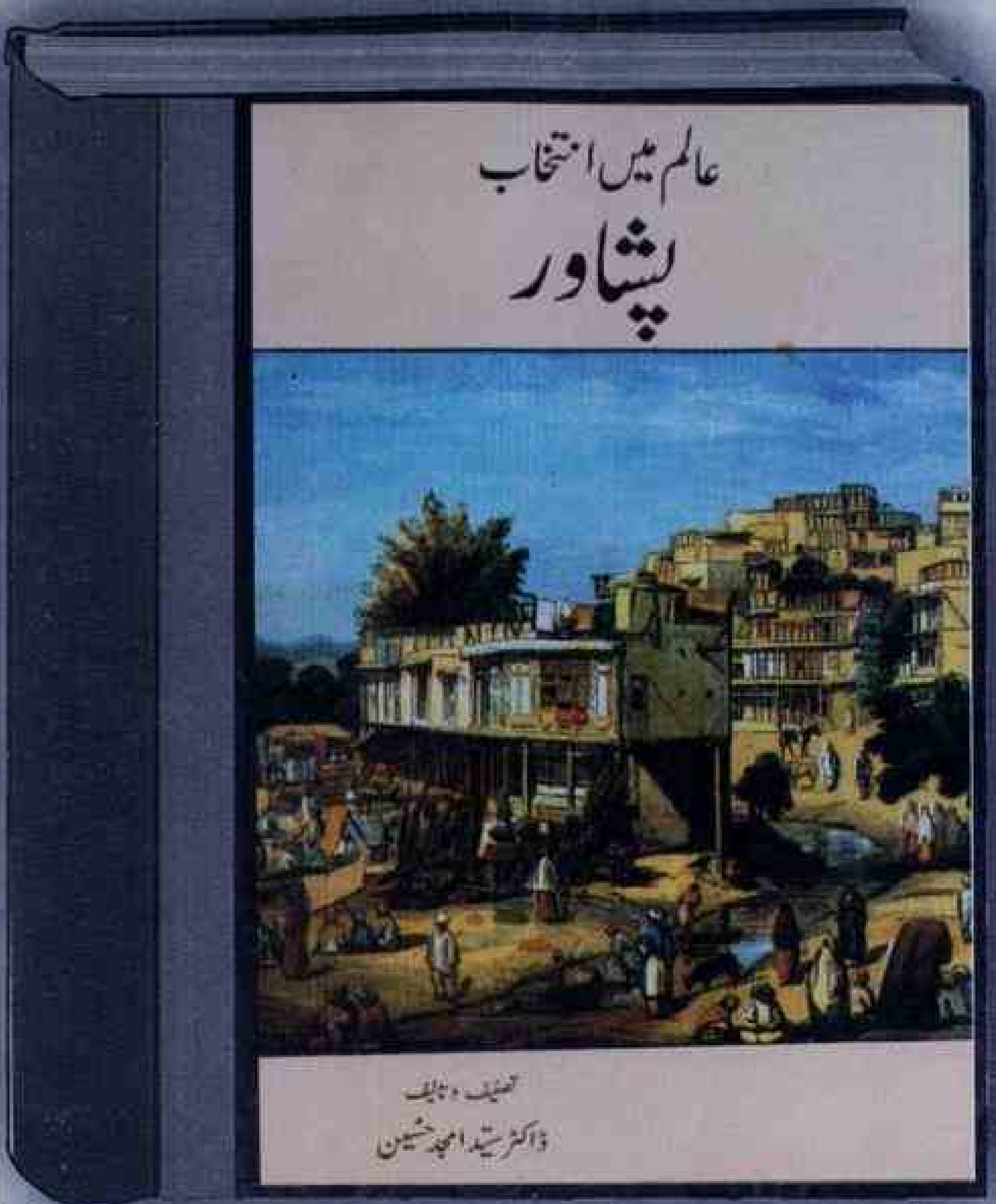
عالم میں انتخاب
پشاور
تصنیف و تالیف
ڈاکٹر سید امجد حسین

"یک شہر آرزو"

کے بعد

ڈاکٹر سید امجد حسین

کی دوسری گرانقدر تالیف

"عالم میں انتخاب"

"ڈاکٹر سید امجد حسین اس تالیفی کارنامے پر آج کے علاوہ آئندہ نسلوں کی بھی تحسین کے مستحق ہیں۔" .... احمد ندیم قاسمی

امجد کا عشق صرف **Nostalgia** تک محدود نہیں، اس نے ایک تخلیق کار کی طرح اس خوشبوؤں کے شہر (پشاور) سے محبت کی ہے...... عموماً یہ کام "اگلے بندے دا" نہیں ہوتا کہ بعض موضوعات اپنے وزن کے اعتبار سے بڑے ادارے یا اکادمیاں ہی کر سکتی ہیں۔ مگر امجد کا عشق.............. بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را : احمد فراز

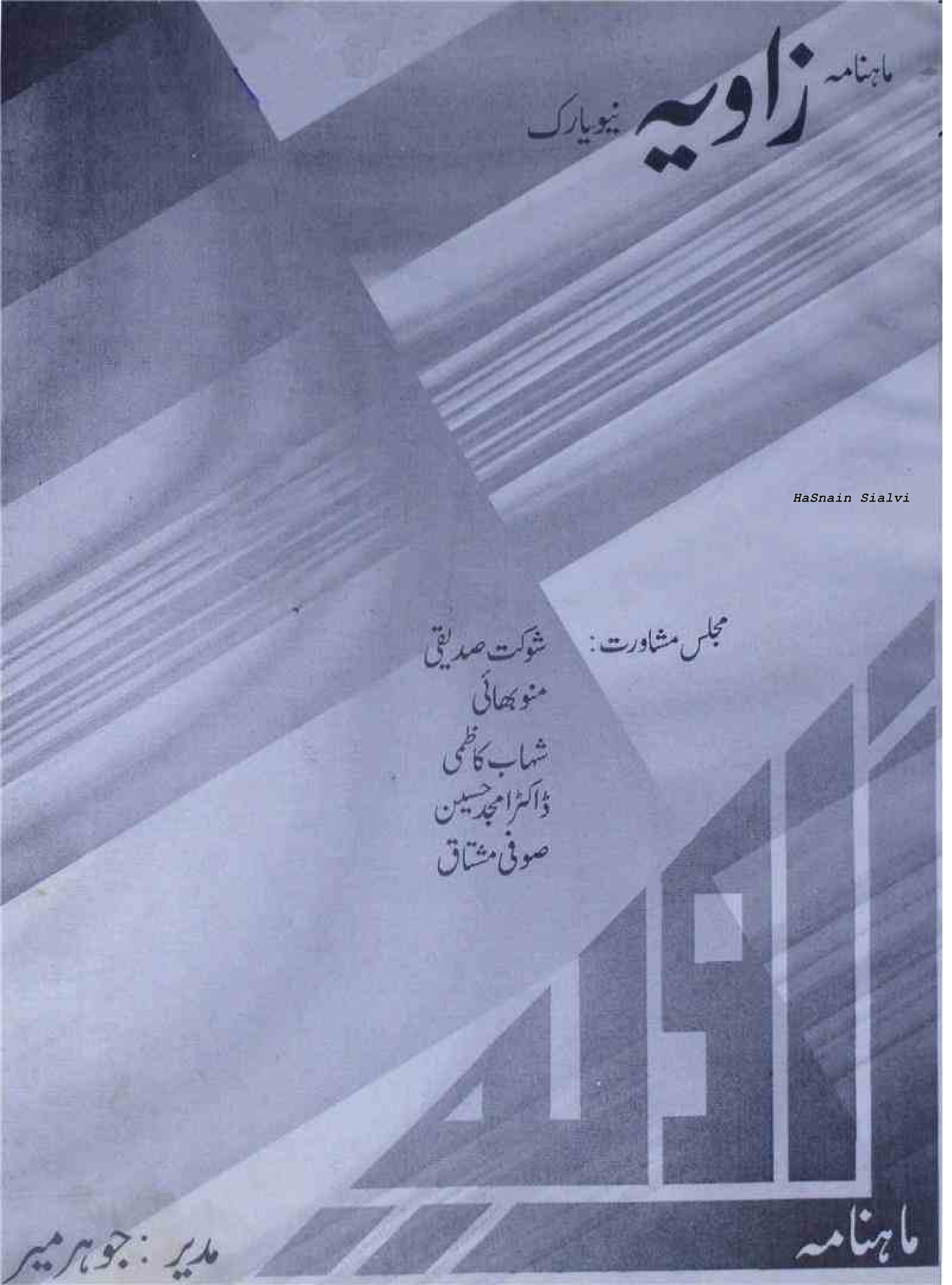

ماہنامہ

زاویہ نیویارک

HaSnain Sialvi

مجلس مشاورت:
شوکت صدیقی
منو بھائی
شہاب کاظمی
ڈاکٹر امجد حسین
صوفی مشتاق

ماہنامہ

مدیر: جوہر میر

جلد اوّل……شمارہ اوّل

نائب مدیر : وزیراں سومرو
منتظم : مرزا اعظم بیگ
کمپوزنگ اینڈ ڈیزائننگ : میاں محمد مدثر
سرورق : شہزاد تسنیم
پبلشر : زاویہ پبلی کیشنز

فون، فیکس : 718-565-8646
قیمت فی پرچہ : 4 ڈالر
سالانہ معہ ڈاک : 60 ڈالر
سمندر پار : 100 ڈالر

رابطہ : Zawia Publications
80-15, 41 Ave, Suite 420
Elmhurst, NY 11373
ای میل : monthlyZavia@altavista.com

ماہنامہ

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

حرفِ آغاز

ماہنامہ ”زاویہ“ کا پہلا شمارہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں ہمارا آپ کی رائے سے متفق ہونا اس لئے ضروری نہیں ہے کہ ایک آدھ غلطی کے ارتکاب کا حق تو سبھی کو حاصل ہوتا ہے اور ہمیں تو یہ اعتراف کر لینے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی کہ اس شمارے میں ہم وہ سب کچھ پیش نہیں کر سکے جو پیش کرنا چاہتے تھے، سچی بات ہے یہ ممکن بھی نہ تھا۔

آپ اسے ایک تجربہ یا تجربے کی ابتداء کہہ سکتے ہیں، ایک ایسے تجربے کی ابتداء جو محض ایک ادبی پرچہ شائع کر دینے کے شوق تک محدود نہیں، جو اس جذبے کا حاصل ہے کہ پاکستان اور بیرونِ پاکستان اردو شعروادب کے قارئین کو عالمی (عصری) شعروادب اور تخلیق کے رجحانات اور میلانات سے آگاہ کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت سے شائع ہونے والے مؤقر جرائد نے حتی المقدور یہ فرض پہلے ہی ادا کر چھوڑا ہے۔ ہمارے تجربے کیلئے غالبًا یہی کچھ رہ گیا ہے کہ ہم ماہنامہ ”زاویہ“ میں تازہ ترین امریکی، لاطینی، یورپی، افریقی اور دیگر خطوں کا منتخب ادب، اردو شعروادب کے پہلو بہ پہلو پیش کریں اور سیاسی، ثقافتی، نسلی، لسانی، تاریخی اور جغرافیائی تضادات سے ماوراء انسان کی فکری (سماجی یا معاشرتی حوالے سے) وحدت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس یقین کے ساتھ کہ یونان اور پاکستان کا درمیانی فاصلہ ایک عام یونانی اور پاکستانی کے درمیان حائل نہیں ہے۔ امریکہ کے اریزونا کے دشت اور سندھ کے میر پور خاص کے دلدلی صحراؤں میں رہنے والوں میں کوئی تضاد نہیں۔ شمالی کیرولائنا کے کسانوں اور جنوبی پنجاب اور ڈیرہ اسماعیل خان کے کسانوں میں بہت کچھ مشترک ہے۔ نیویارک سٹی کے کوڑے دانوں میں سے روٹی کا ٹکڑا اور کوکا کولا کے دو گھونٹ تلاش کرنے والوں اور پاکستان کے ٹھنڈے چولہوں پر فاقے سینکنے والوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مارکیٹ اکانومی کی طلائی زنجیروں میں جکڑے ہوئے امریکی اور پاکستانی تاجروں، سرمایہ داروں، صنعتکاروں اور اجارہ داروں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

یہ بتانا تو یاد ہی نہیں رہا کہ ماہنامہ ”زاویہ“ ایک غیر جانبدار جریدہ نہ ہوگا، یہ جانبدار ہوگا اور دنیا بھر کے مظلوموں کا طرفدار ہوگا، انسانی حقوق کی آواز ہوگا کیونکہ ہمارے نزدیک ظالم و مظلوم، حاکم و محکوم،

فیضیاب اور محروم کے درمیان غیر جانبداری، ظالموں اور حاکموں کے جرائم میں شریک ہونے کے مترادف ہے۔ اور تجربے کا یہ معیار کوئی پہلا اور نیا معیار نہیں، دنیا کے ادب میں یہ معیار صدیوں پہلے سے قائم چلا آرہا ہے۔

اس شمارے میں نیویارک کے حلقۂ ارباب ذوق اور مقامی ادیبوں اور شاعروں کیلئے جناب سید ضمیر جعفری مرحوم کی شفقت اور محبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ انہوں نے اپنی سانسوں کی آخری پونجی اسی شہر میں لٹائی تھی۔ سو ان کی یادوں کا چراغ روشن رکھنے کیلئے ماہنامہ "زاویہ" کی ابتدا انہیں کے نام نامی سے کرنی مناسب تھی۔ اس شمارے میں ماہنامہ چہار سو، ادب لطیف اور روزنامہ پاکستان سے استفادہ کیلئے تہ دل سے شکر گزار ہیں۔

اس شمارے میں جناب شہاب کاظمی کا بجھارتوں کی صنف گم گشتہ کے بارے میں تحقیقی مقالہ "چیستان" بہت فکر انگیز اور دلچسپ تحریر ہے۔ جناب شہاب کاظمی نے اس بھولی بسری صنف شاعری کی اہمیت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ تاریخ ادب اردو میں اس صنف شاعری کا بہت سرسری طور پر ذکر کیا گیا ہے حالانکہ اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے یہ زیادہ توجہ کی مستحق تھی۔

تنازعات کے بارے میں کچھ ایسی تحریریں جمع کی گئی ہیں جو دلچسپ ہونے کے علاوہ اختلاف رائے کو دعوت دے سکتی ہیں۔ اختلاف رائے کی ہمیں ضرورت بھی ہے کہ اس سے اتفاق رائے کی شعوری خواہش جنم لیتی ہے جو اتفاق رائے کے جبری تقاضوں سے مختلف اور بہتر نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اس باب میں قارئین کی آراء کا احترام کیا جائے گا اور ایسی تحریروں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی جو ہمیں سچائی کے اظہار اور سچائی کی تلاش میں مدد دے سکیں۔

کنکھیات کے باب میں ظاہر ہے کتابوں پر تبصرے ہی کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر تبصروں کیلئے کتابیں بھجوانے کی استدعا کی جاتی ہے مگر ہم اس تکلف کی پابندی نہ کریں گے۔ ہم کسی بھی مطبوعہ تحریر پر تبصرہ کرسکتے ہیں۔ جس سے کسی کا متفق ہونا ضروری نہ ہوگا۔

ج۔ م

HaSnain Sialvi

ترتیب

یادش خیر

آپ کا ضمیر	امجد اسلام امجد	10
اسلام آباد کا ضمیر	رشید نثار	12
سید ضمیر جعفری کی یاد میں	نسیم سحر	14
سید ضمیر جعفری سے ایک ملاقات	ڈاکٹر اعجاز راہی	16
ضمیر جعفری مافی الضمیر کے آئینے میں	علی منور عدیم	19
بیاد سید ضمیر جعفری	جمیل یوسف	23
جانِ محفل تھا خدا بخشے ضمیر	ڈاکٹر سید تقی عابدی	28
سو گئے داستاں کہتے کہتے	جوہر میر	31
بیاد ضمیر جعفری (نظم)	جوہر میر	32
غزل	سید ضمیر جعفری	33
علامہ اقبال سے ٹیلی فون پر بات	سید ضمیر جعفری	36
خطوط (بنام: اشرف میاں بنام: جوہر میر بنام: آغا جان امجد حسین)	سید ضمیر جعفری	37

مضامین

چیستان اور پہیلیوں کی شاعری (ایک تحقیقی جائزہ)	شباب کاظمی	46
عہد یوسفی اور روبن ڈیلیا کی چھاؤں	علی منور عدیم	59
شاعر ادیب اور میڈیا	جوہر میر	62

غزلیں

احمد فراز	68
افتخار نسیم	70
حلیم قریشی	72
اشرف میاں	72
شباب کاظمی	73
عشق لاللپوری	74
انور شعور	74
عباس تابش	75
حسن عابد	75
ریحانہ قمر	76
شوکت فہمی	76
رندھیر سنگھ	77

HaSnain Sialvi

افسانے

انگلش چینل کا پیراک .... ڈاکٹر ستیہ پال آنند 80
صلیب ملامت .... ارشاد احمد صدیقی 83
چیونٹیوں کی قطار .... امر محبوب مچا 93
ایک تھی لڑکی .... افتخار نسیم 95

نظمیں

ستیہ پال آنند 100
افتخار نسیم 102
گوہر سلطانہ عظمیٰ 102
شیخ ایاز 103
منصور احمد 103
شمشیر الحیدری 104
ریحانہ قمر 105
حسن مجتبیٰ 107
احمد سلیم 106

تنازعات

منیر نیازی ایک مد خود غلط .... جوہر میر 110
علامہ بشیر حسین ناظم کیلئے 10 ہزار روپے انعام کی پیشکش .... ناصر زیدی 112
خیال کا سفر یا توارد؟ .... ناصر زیدی 114
پروین شاکر پر ظلم .... جوہر میر 116

کتابیات

نیویارک میرے آگے پر ایک نظر .... پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق 120
اردو رپورتاژ کی ایک تاریخ .... پروفیسر اشرف بخاری 122

یادش بخیر

ماہنامہ

HaSnain Sialvi

آپ کا ضمیر

امجد اسلام امجد

اللہ بخشے ضمیر جعفری مرحوم اپنے خط کا اختتام ہمیشہ انہی تین لفظوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ گزشتہ تقریباً دو ماہ سے ان کے حوالے سے یہ رشتہ ہماری آپ کی اس دنیا سے کم و بیش منقطع ہو چکا تھا اور وہ بقول غالب اس طرح زندہ تھے کہ۔

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

مگر اردو ادب پر بالعموم اور اس کی مزاحیہ شاعری پر بالخصوص جو اثرات سید ضمیر جعفری مرحوم نے مرتب کئے ہیں وہ انہیں اکبر الہ آبادی کے بعد اردو مزاحیہ شاعری کا سب سے بڑا شاعر قرار دینے کیلئے بہت کافی ہیں۔ جہاں تک ان کی سنجیدہ شاعری اور نثر کا تعلق ہے اس کا مرتبہ و مقام ایسا ہے کہ اگر جعفری صاحب مزاحیہ شاعری نہ بھی کرتے تب بھی ان کا شمار اپنے عہد کے لکھنے والوں کی پہلی صف میں ہی ہوتا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کثیر الجہات ہونے کے ساتھ ساتھ بلا نویس اور زود نویس بھی ہو اور اس کے باوجود اس کی تحریر کا معیار ہمیشہ اور ہر جہت میں بلند رہے۔ یہاں تک کہ ان کی غیر رسمی، شخصی ڈائری کے اوراق بھی جو ان کی ذاتی یادداشتوں پر مبنی اور مشتمل ہیں اور برادرم آصف محمود کی وساطت سے گزشتہ دنوں کتابی شکل میں سامنے آئے ہیں اپنے اندر ایسی کشش، جاذبیت، عصری تاریخ کو دبے ساختگی رکھتے ہیں کہ انہیں بلا کھٹکے اعلیٰ ادبی تحریروں اور شہ پاروں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ بے ساختگی سے یاد آیا کہ 1982ء میں شام بہار ٹرسٹ انبالہ والے راجندر ملہوترہ کے مشاعرے میں ہم ان کے ہم سفر تھے وہ اپنے بھاری بھرکم جثے کے باوجود ذہنی اور جسمانی سطح پر انتہائی چاق و چوبند تھے اور اپنے موٹاپے کے بارے میں اس خوشدلی اور بے تکلفی سے گفتگو کرتے تھے کہ ہم نے بھی شہ پا کر موٹے لوگوں کے بارے میں کچھ لطائف پیش کر دیئے نہ صرف یہ کہ انہوں نے دل اور منہ کھول کر ان کی داد دی بلکہ اسی حوالے سے ایک اپنا شعر بھی سنایا کہ۔

یہ بڑھاپا تو مجھ کو خدا نے دیا
ہے مٹاپا مگر میرا خود ساختہ

اسی سفر کے دوران انہوں نے عطاء الحق قاسمی اور ہمارے بارے میں وہ مشہور جملہ کہا تھا کہ "لگتا ہے جب تم دونوں کو جملے بازی کیلئے کوئی تیسرا نہیں ملتا تو تم ایک دوسرے کو ہی تختہ مشق بنا کر آپس میں نیٹ پریکٹس کرتے رہتے ہو۔"

ضمیر جعفری مرحوم ایک بذلہ سنج آدمی تھے۔ شوخی، شرارت اور جملے بازی ان کی شخصیت اور فن دونوں کا طرہ امتیاز تھا مگر اس کے باوجود ذاتی سطح پر وہ ادبی آداب اور رشتوں کے احترام اور تقدس کے غیر معمولی طور پر قائل تھے۔ فوج کی ملازمت نے ان کی زندگی میں ایک عجیب طرح کا ڈسپلن اور حفظ مراتب کا احساس پیدا کر دیا تھا جس کو ایک عظیم مزاح نگار کی فطری بے ساختگی کے ساتھ ساتھ چلانا ممکن کی حد تک مشکل تھا مگر جعفری صاحب نے زندگی بھر آگ اور پانی کے اس میل کو جس طرح نبھایا اور جاری رکھا یہ ان کی شخصیت کا ایک ایسا جوہر تھا جس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

اپنی 83 سالہ بھرپور زندگی میں جو کم و بیش پہلی جنگ عظیم سے لے کر اس صدی کے آخری برس تک جاری رہی انہوں نے بہت دنیا دیکھی۔ اس کے نشیب و فراز کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا اور اس کے ہر ہر دور کو اپنی تحریروں میں اپنے تاثرات کے ساتھ محفوظ کر دیا ان کے لکھے ہوئے واقعات اور کردار ایسے ہیں کہ ان کی قلم کی نوک پر آنے کے بعد خواہ مخواہ ان میں ایک طرح کی دلچسپی اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ "اردو پنچ" کے تازہ شمارے میں جو ایک طویل تعطل کے بعد ان کی نگرانی میں دوبارہ شائع ہوا ہے انہوں نے "پہلی دھنک" کے زیر عنوان اپنے گاؤں سے متعلق ابتدائی یادوں کو قلم بند کیا ہے یوں تو یہ ساری تحریر لاجواب ہے لیکن اس میں جن دو ریٹائرڈ فوجی بزرگوں کا نقشہ انہوں نے کھینچا ہے وہ ایسا ہے کہ اردو خاکہ نگاری میں اس پائے کی تحریریں شاید ایک ہاتھ کی انگلیوں پر آ جائیں۔

ہمارا ضمیر صاحب سے نیاز مندی کا شرف تقریباً تیس برس پر محیط ہے اس سارے عرصے میں ہم نے انہیں ایک اعلیٰ تخلیقی شخصیت، بلند پایہ انسان اور انتہائی مشفق سنیئر پایا ہے۔ بزرگ اس لئے نہیں کہا کہ وہ عمر اور درجے کے اعتبار سے تو یقیناً ہمارے بزرگ تھے مگر اپنے جونیئرز کے درمیان وہ اس طرح رہتے تھے کہ ان کی محبت، بے تکلفی اور طبعی شگفتگی کا ہالہ اس فرق کو درمیان سے گزرنے ہی نہیں دیتا تھا۔

چند برس قبل سرگودھا کے ایک مشاعرے میں وہ غلطی سے ہمارے جوتے کا ایک پاؤں پہن کر چلے گئے جو کئی دن کی تلاش بسیار اور ہمارے دوست چوہدری افتخار احمد (جو ان دنوں وہاں ایس پی پولیس تھے) کی کوششوں سے معلوم اور بازیاب ہوا۔ ہم نے ایک ملاقات میں جعفری صاحب سے پوچھا کہ آپ کا جوتا نمبر [illegible] والا تھا اور ہمارے [illegible] والا، پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ آپ کو مغالطہ ہو گیا۔ اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولے اس پاپی پیٹ کی وجہ سے کہ یہ کم بخت کئی برسوں سے ہمارے اور ہمارے پاؤں کے نیچے واقع دھرتی کے درمیان دیوار بنا ہوا ہے۔ دونوں جوتے ساتھ ساتھ پڑے تھے کسی عقیدت مند کو آٹوگراف دینے کے دوران دھیان جوتوں سے ہٹ گیا اور چونکہ مٹاپے کی وجہ سے چال ویسے ہی "افتاں و خیزاں" ہے اس لئے گھر پہنچ کر جوتا اتارنے سے پہلے پتہ ہی نہیں چل سکا کہ ہم نے کیا پہنا ہوا ہے۔ پھر مسکرا کر بولے "چلیں اب اسی بہانے ہم دونوں جوتا بدل بھائی بن گئے ہیں"۔

مزاحیہ شعر و ادب پر گزشتہ دو دس بہت بھاری پڑتے ہیں لیکن جعفری صاحب کی رحلت سے تو گویا ایک پورا عہد ختم ہو گیا ہے۔ میر نے کہا تھا ۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

سو سید ضمیر جعفری جو ہمارے درمیان ہمارے "ضمیر" کی طرح سے زندہ تھے، جسمانی طور پر تو ہم سے جدا ہو گئے ہیں مگر ان کی سدا بہار اور زندگی آموز تحریریں یقیناً ہمارے ضمیروں کو زندہ اور خوبصورت رکھیں گی کہ بقول اقبال ۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

وفات سے چند ماہ قبل انہوں نے اسلام آباد میں طویل قیام کے بعد رخت سفر باندھا تھا کہ وہ بڑھاپے کے دن (جن کا تعلق صرف ان کے جسم سے تھا کہ ذہن اور قلم کی سطح پر وہ اب بھی جوانوں کو شرماتے تھے) اپنے گاؤں کی فضا اور بیٹوں اور ان کی اولادوں کے درمیان گزاریں۔ اس موقع پر انہوں نے جو نظم لکھی تھی اس کے چند شعر نذر قارئین ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اسلام آباد محض ایک استعارہ تھا، دراصل وہ ہم سب کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

بزم یاراں الوداع، شہر نگاراں الوداع
اے سواد مہرباناں، دوستداراں، الوداع

سرخوشی راتوں کی، صبحوں کی جوانی اس نے دی
مجھ کو میری ساری عمر زندگانی اس نے دی

تیرے رومانوں کے شبد اشلوک گنتا جاؤں گا
تیرے دریائے سواں کے ساتھ بہتا جاؤں گا

شام رخصت آ گئی اس شہر خوش اوقات سے
میں نے رکھی جس کی پہلی اینٹ اپنے ہاتھ سے

پھر نہ جو آئیں گے وہ ایام یاد آئے بہت
وقت جب کم رہ گیا تو کام یاد آئے بہت

جانا مشکل تھا پر اک منظر بلاتا ہے مجھے
ماں کا آنگن، ایک کچا گھر بلاتا ہے مجھے

ساتھ کتنی نازش ایام لے جاؤں گا میں
کتنے چہرے، کتنے خواب اور نام لے جاؤں گا میں

نغز گویان خوش الفاظ و خوش افکاراں، سلام
میرے خوابوں پر برستے موسم باراں، سلام

◆ ◆ ◆

غزلیات فارسی غالب

منظوم اردو ترجمہ

ڈاکٹر خالد حمید (ایم ڈی)

اسلام آباد کا ضمیر

رشید نثار

اسلام آباد جب آباد نہیں تھا۔ ابھی اس کے بلیو پرنٹ تیار ہو رہے تھے، رنگ و لہر کا تغزلات کے پس منظر میں پاکستان کا "ضمیر" بھی ہلکی ہلکی روشنی کی صورت میں موجود تھا۔ جب اسلام آباد کی آبادی شروع ہوئی تو پاکستانی "ضمیر" دارالحکومت کے ترقیاتی ادارے میں فکریاتی حرکت کی زیریں لہر بن کر اہلِ پاکستان کی اجتماعی نمائندگی کرتا رہا۔

اسلام آباد آج مسلم امہ کا مرکزی شہر ہے۔ اس شہر کے بارے میں مدنی شاہ لطیف نے انکشاف فرمایا کہ ڈھائی صدی بعد یہاں ایک شہر آباد ہو گا جو پوری مسلم دنیا کے اجتماعی جذبات کی نمائندگی کرے گا۔ یہ شہر آباد ہو گیا اور پیشین گوئی بھی پوری ہو گئی۔

اس شہر کو نظریاتی بنانے میں مذکورہ پاکستانی ضمیر کی ادبی فنکاری اور تخیلی بت کاری نے یگانگت کا آہنگ بخشا ہے۔ چنانچہ ادب، سماج، زندگی، دوستی اور کشمیر کے معاملے میں اسلام کے ضمیر کی جانکاری کو اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

پاکستانی تخیلی پیکر کا بنیادی عنصر سید ضمیر جعفری ہے جس نے پیدائش سے لے کر اسلام آباد کو شہر الوداع کہتے وقت جبلی اضطرار اور داخلی حقیقت کو نیا جنم دیا۔ جب سید ضمیر جعفری CDA کا ڈائریکٹر انفارمیشن تھا تو اس وقت بھی اس نے شہر کے خوش آئند مستقبل کیلئے کبھی پسپائی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور یہی بات تو یہ ہے کہ ایک تنہا ذہن نے اسلام آباد کو جسمانی شبیہ اور مکمل اسلامی تصور عطا کیا تھا۔

سید ضمیر جعفری کو اپنی اوائل عمری میں دیکھا تو اس وقت بھی وہ بہ رنگ دکھائی دیتے وہ جوانی میں بوڑھے ادیبوں کے پیر و مرشد تھے لہٰذا ہر کہ و مہ ان کا قدم بوس تھا وہ ایک رکھ رکھاؤ کے ساتھ انسان کے اجتماعی جذبات کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ پاکستانی ادب میں ہمیشہ نیا پن لے کر آتے رہے۔ پرانے پنجابی پوٹھوہاری الفاظ کو موتیوں کی طرح جڑتے تھے اور لفظ کو Coin کر کے معنی کو وقت کی قید سے آزاد کر دیتے تھے۔

انہوں نے مزاح سے زیادہ سنجیدہ ادب لکھا مگر انہیں شہرت ان کے Epic Culture کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ وہ جب فوج میں تھے تو ان کی دوستی سویلین حضرات کے ساتھ تھی اور جب وہ سویلین ہو گئے تو ان کے احباب میں فوجی سرِفہرست تھے۔ ان اسماء میں بریگیڈیئر گلزار اور کرنل محمد خان بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ مگر ایک اہم نکتہ یہ کہ ان کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے اور وہ جگت بزرگ کی حیثیت سے نوجوانوں، بوڑھوں اور حاکموں کے درمیان یکساں طور پر مقبول تھے۔ چنانچہ سید ضمیر جعفری واحد منفرد شخصیت ہیں جن کی جاذبیت میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا تاہم انہیں یہ جاذبیت محض فنکارانہ صلاحیتوں کی بنا پر حاصل نہ ہوئی بلکہ اپنی شخصیت کی انفرادیت انہوں نے خود تشکیل کی تھی اور اپنا زمانہ خود پیدا کیا تھا۔ ان کی شخصی خصوصیت اپنے کھرے پن کی شہرت رکھتی تھی لہٰذا ان کے جسم و جان میں کوئی تضاد نہیں تھا اور نہ ہی وہ فکری اختلاف رکھتے تھے البتہ مسخ شدہ صورتیں، غلط معاشرتی انتظامات اور بدحالیاں انہیں زیادہ مرغوب رہیں۔ لہٰذا انہوں نے شاعری کے حوالے سے ایک ذمہ داری کو قبول کیا ہوا تھا۔ اس طرح ان کی شاعری Depression کے خلاف ایک تحریک کی صورت اختیار کرتی رہی اور اب ان کا مزاح ناقابلِ فراموش بن کر ادبی اثرات اور میلانات کی آماجگاہ بن گیا ہے۔

سید ضمیر جعفری ہیئتِ اجتماعی سے الگ تھلگ تھے ان کے اندر ایک مجرد انسان چھپا ہوا تھا۔ جس نے انہیں ایک خاص تمدن اور ماحول میں قید کر رکھا تھا۔ لہٰذا عبدالعزیز فطرت، عزیز ملک، نذیر شیخ سے ان کی محبت لافانی تھی ...... اور جب وہ ترتیب و تحسین کی بات کرتے تو مولانا چراغ حسن حسرت کو پیر و مرشد کہہ کر انہیں خراج پیش کرتے مگر مولانا حسرت کو پیر و مرشد کہنے والا ضمیر ایک دن بذاتِ خود پیر و مرشد تسلیم کیا گیا اور یہ کتنی عظمت کی بات ہے کہ اپنے عہد میں سید ضمیر جعفری نے پُرشکوہ زندگی بسر کی ہے۔

سید ضمیر جعفری نے کئی ادوار دیکھے، بہت سے عہد، بہت سی شخصیات اور ممالک کی سیر کی۔ لہٰذا ان کی شخصیت میں نسلوں کے تجربات اور ترقی و تہذیب کے حیاتی عناصر بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ شاید ذی ارادہ انسان تھے کہ انہوں نے اپنے لیے ارتقائی سیڑھی خود تیار کی تھی ---- اور جب اپنی ضرورتوں کو سمیٹنے کا وقت آیا تو اسلام آباد کو الوداع کہنے میں انہوں نے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ سید ضمیر جعفری اپنے دوستوں، ہم جنسوں اور ہم عصروں کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ان کی زندگی میں کوئی Complex نہیں تھا بلکہ تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کا کھل کر اظہار کرتے اور خوش اسلوبی کے ساتھ فن اور اقدار کو تحفظ بخشتے چونکہ وہ مہذب انسان تھے اور خاندانی اعتبار سے آسودہ حال لہٰذا ان کے فکر و احساس میں ذاتی مسرت، فراغت اور آزادی کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ ان کی زندگی کی ترکیب میں اضطرار نہیں، مکمل ٹھہراؤ اور ایک ناموس موجود تھا۔ لہٰذا وہ بھرپور زندگی کے ساتھ اپنے عہد کو متاثر کرتے رہے ہیں۔

وہ جب تمام مفروضوں کو تیاگ کر اسلام آباد میں رہائش پذیر ہو گئے تو ان کی زندگی طبعی آہنگ کا درجہ اختیار کر گئی کیونکہ وہ زندگی کی بقا کیلئے مختلف تحریکات کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ کسی Walk کا معاملہ ہو یا کشمیر کا تصفیہ وہ غیر ارادی طور پر قافلوں اور کاروانوں کے سرخیل بنائے جاتے رہے۔ انہوں نے کبھی کسی الجھن، کسی شے، کسی ازلی تصور کو مغالطہ نہیں بنایا اور اپنے پیر و مرشد چراغ حسن حسرت کی طرح تمام عالم کو حسن، حقیقت اور خیر تقسیم کرتے رہے۔ اس طرح انہیں اسلام آباد کے واحد فرد کی حیثیت میں لاثانی اور مرکب جمالیاتی Image حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ اسلام آباد کے منفرد انسان تھے (اس لحاظ سے انہیں اسلام آباد کا ضمیر کہا جا سکتا ہے)

ان کی شخصیت اور زندگی کو فارسی کا یہ شعر محیط ہے ۔۔

جمال معنی ز زلف ست و خط و عارض و خال
ہزار نکتہ دریں کاروبار و دلداری ست

سید ضمیر جعفری کے بغیر اسلام آباد اب اس طرح ہے جیسے ذہن اپنے ضمیر سے خالی۔ لہٰذا یہ سوال بہت اہم ہو جاتا ہے کہ سید ضمیر جعفری کے بغیر اسلام آباد اپنی بالیدگی کو برقرار رکھ سکتا ہے کہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں اسلام آباد کا دوسرا اسم نامہ "ضمیر" ہے چنانچہ ایک رومانوی تصرف کی روشنی میں کسی عالم مثال کو تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ تاہم اسلام آباد جسے لوگ "کوفہ" کہتے ہوئے نہیں جھجکتے اور اسے شہرِ بے رساں کا خطاب دے کر اپنے شدید ردِ عمل اور Depression کا اظہار کرتے ہیں۔ تشنج کے عالم میں اس شہرِ بے رساں نے ایک زندہ Legend کو الوداعی سلام پیش کر کے ایک اعلیٰ روایت کو قائم کیا ہے۔ یہ مثال اس لئے بھی یادگار ہے کہ اسلام آباد فطری تقاضوں سے آشنا نہیں ہے یہاں تقاضے بھی حکمرانوں کے ہیں اور گماشتے بھی انہیں کے ہیں، مگر سید ضمیر جعفری نے جب الوداعی سلام کا ارادہ کیا تو حکمرانوں سے زیادہ ان سے محبت کرنے والے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں نے اپنے اپنے طور پر انہیں خراجِ تحسین پیش کر کے الوداع کہا تو اب تک اسی محبت کے آہنگ میں اسلام آباد گونج رہا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اسلام آباد کے لالہ زاروں سے ابھی تک کوئی دوسرا اردوی ضمیر جعفری کی ہیئت میں جنم نہیں لے سکا۔ حالانکہ وہی کشت پر نمو بہار ہے اور وہی لالہ زار اسلام آباد ہے۔ بیدل نے کہا تھا۔

صد قطرہ و موج محو طوفاں گرد
کز دریا گوہری نمایاں گرد
فطرت عمری بکند تگ و تاز ہوس
تا نقش لب بدو و انساں گرد

ان اشعار کی روشنی میں سید ضمیر جعفری زندہ جاوید حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ان کا مزاح اور نثری تخلیقات فطرتِ انسانی کی گہرائی میں اتر جاتی ہیں۔ اس طرح وہ بذاتِ خود عصر موجود کی بندشوں سے آزاد بلکہ زمان و مکاں کی حد بندیوں سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔

آج اسلام آباد اپنے عروج پر داد جہاں بانی کا باعث ہے۔ اس بین الاقوامی شہر میں سید ضمیر جعفری کا نام ادب، صحافت اور تصوف کی زندہ علامت کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ مگر سید ضمیر جعفری کی وفات سے اس شہر کے رستوں اور خیابانوں میں سناٹے کی آواز گونج رہی ہے۔ دولت و ثروت کی چہل پہل، علوم و فنون کی ہماہمی ایک باطنی سناٹے کی آواز یا ہو، یا ہو کی بازگشت بھی سنائی دے رہی ہے۔ اہلِ پاکستان محبت کرنے والے ایک انسان سے محروم ہو گئے ہیں ۔

مائے نی میں کنوں دساں درد وچھوڑے دا حال

◆ ◆ ◆

ماہنامہ زاویہ

آئندہ شمارے میں

مرزا غالب کا قمار خانہ
چوہدری اصغر علی کوثر
نٹنی منتم (نگار خانہ)

سنسکرت شاعر: راموور گپت کی مشہور نظم
ترجمہ: میرا جی
دیباچہ: سعادت حسن منٹو

اردو افسانے میں ابلاغ کا مسئلہ
ڈاکٹر اعجاز راہی

افسانے

رشید امجد، ڈاکٹر اعجاز راہی،
منشا یاد، امر محبوب ٹیپو

نظمیں، غزلیں
تنازعات اور کتابیات

سیدّ ضمیر جعفری کی یاد میں

نسیم سحر

سیدّ ضمیر حسین شاہ ولد سید حیدر شاہ ضلع جہلم کے ایک گاؤں چک عبدالخالق میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش عموماً یکم جنوری 1917 لکھی گئی ہے مگر یہ حتمی تاریخ اس لئے نہیں کہ خود بقول ضمیر جعفری "ہماری پیدائش کی تین تاریخیں سننے میں آتی رہیں۔ دو تاریخیں 1915ء میں اور ایک 1916ء میں مہینہ کسی کو یاد نہیں رہا۔ آخر یکم جنوری 1917ء اختیار کر لیا گیا۔ اب کہیں یکم جنوری 1916ء اور کہیں یکم جنوری 1917ء لکھا ملتا ہے۔ آپ نے لوئر مڈل کا امتحان گاؤں ہی سے پاس کیا، میٹرک جہلم سے، ایف اے اٹک سے اور بی اے اسلامیہ کالج لاہور سے۔ آپ کے بزرگ ایران سے پہلے ملتان آئے یہ کوئی تین سو برس قبل کی بات ہے پھر وہاں سے آکر اس گاؤں میں آباد ہو گئے اور اب بھی وہیں آباد ہیں۔ ضمیر جعفری کہتے ہیں "ہمارے خاندان پر اتنا عروج کبھی آیا ہی نہیں کہ زوال بھی آئے"۔

ضمیر جعفری نے حصول تعلیم کے بعد ضلع کلرکی اختیار کی، پھر حکومت ہند میں ذرا اونچے درجے کی کلرکی کی۔ جنگ عظیم دوم چھڑی تو فوج میں بھرتی ہو گئے اور کپتان کے عہدے پر فائز ہو کر جنوب مشرقی ایشیائی کمان (ہیڈ کوارٹرز سنگاپور) میں تعینات ہوئے۔ آپ کا تعلق شعبہ تعلقات عامہ سے تھا جس میں ان دنوں حکومت برطانیہ نے بہترین شاعر اور ادیب اکٹھے کئے ہوئے تھے مثلاً مجید ملک، کرنل فیض احمد فیض، میجر چراغ حسن حسرت، کیپٹن ن م راشد، میجر آغا بابر، کرنل مسعود احمد اور کمانڈر حسن عسکری (ابن سعید) 1948ء میں پاکستان واپس آئے۔ 1949ء میں کپتانی سے استعفیٰ دے دیا اور راولپنڈی سے کرنل مسعود احمد اور کیپٹن انعام قاضی کی شراکت میں ایک روزنامہ اخبار "بادِ شمال" جاری کیا مگر وہ مالی دشواریوں کی وجہ سے ایک برس تک بھی نہ چل سکا۔ پھر 1951ء میں آپ کو سیاست میں جانے کی سوجھی اور جہلم کے دیہاتی حلقے سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے مگر ہار گئے اور پھر عمر بھر سیاست کے خارزار میں قدم رکھنے کا نام نہیں لیا۔ اور 1952ء میں دوبارہ فوج میں کمیشن لے لیا جہاں سے 1966ء میں میجر کے رینک سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ فوج میں ملازمت کے پہلے دور میں آپ نے 1948ء میں جنگ کشمیر میں اور دوسرے دور میں 1965ء کی جنگ ستمبر میں عسکری خدمات سر انجام دیں۔ 1966ء میں آپ دارالحکومت کے ترقیاتی ادارے سی ڈی اے میں ڈائریکٹر شعبہ تعلقات عامہ مقرر ہوئے۔ پندرہ برس تک آپ نے اس حیثیت میں اہم خدمات سر انجام دیں۔ پھر کچھ عرصہ آرام کرنے کے بعد پاکستان نیشنل سنٹر میں ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے وہاں سے ہٹے تو افغان مہاجرین کے محکمے میں مشیر رہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان سے بھی وابستہ رہے اور پھر ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا زیادہ وقت ادبی سرگرمیوں کیلئے وقف کر دیا۔ [illegible] میں ان کا قیام اسلام آباد میں ہی رہا مگر عمر بھر کی محنت کے باوجود اپنی درویشانہ فطرت کے باعث اپنا مکان نہ بنا سکے اور آخر جب وہ اسلام آباد سے اپنے بیٹے کے پاس کراچی جانے لگے تو اسلام آباد کی تمام ادبی تنظیموں نے مل کر ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑی تقریب کا اہتمام کیا جس کی یادیں مدتوں تازہ رہیں گی۔ کراچی میں وہ اپنے بڑے بیٹے بریگیڈیئر سید احتشام ضمیر کے پاس رہے کچھ عرصے کے بعد وہ دوسرے بیٹے سید امتنان ضمیر کے پاس امریکہ چلے گئے اور وہیں سرطان کی بیماری کا علاج کرا رہے تھے کہ جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

آپ کی ادبی خدمات اور آپ کی تمام تصانیف کا احاطہ شاید ایک مضمون میں نہ کیا جا سکے تاہم ذیل میں ان کی شائع شدہ کتب کی ایک فہرست دی جا رہی ہے (جو مکمل نہیں کہی جا سکتی)۔

شاعری

کارزار
لہو ترنگ
جزیروں کے گیت
نعت نذرانہ
ولایتی زعفران
ضمیریات
مسدس بدحالی
نشاط تماشا

کھلیان
ارمغان ضمیر
قریہ جاں
بھنور اور بادبان
گورخند
ضمیر ظرافت
من مندری
گہوارہ

من بانسری
من میلہ
من کے تار
کھڑ شیر خان
مافی الضمیر
زبور وطن
پاک فوج کو سلام
وہ پھول جس کا نام نہیں

نثر

اڑتے خاکے (انشائی مضامین)
کتابی چہرے
حرف و حکایت (تالیف)
آخری سیلوٹ (تالیف)
سفر نامہ + خسر نامہ
نظر غبارے
شیر محمد شاہ (سوانحی خاکہ)
جاپانی جنگ کی لنگوٹی

ہندوستان میں دو برس
آفتاب معرفت
آنریری خسر (ناولٹ)
مٹھاپانی
حفیظ نامچہ
مثنوی سقوط پاکستان
خدوخال
شاہی حج

ملایا اور ملایا کے لوگ
جنگ کے رنگ
گورے کالے سپاہی
سورج میرے پیچھے (سفرنامہ)
ضمیر حاضر ضمیر غائب
کنگرو دیس میں (سفرنامہ)
اوقیانوس کے پار (سفرنامہ)
مارشل لاء اپنی آخری منزل پر

آپ نے اپنی زندگی میں بے شمار ادبی پرچوں کی ادارت کی۔ [illegible] میں روزنامہ احسان لاہور

اور مولانا چراغ حسن حسرت کے منفرد نکاہی ہفت روزہ "شیرازہ" لاہور کی مجلس ادارت میں شامل رہے۔ ہفت روزہ "سدا بہار" لاہور کے ایڈیٹر رہے۔ روزنامہ "باد شمال" راولپنڈی تو خود ہی نکالا تھا۔ اس کے علاوہ "نیرنگ خیال" راولپنڈی اور مشہور مزاحیہ ماہی رسالے "اردو پنچ" راولپنڈی کی مجلس ادارت میں بھی شامل رہے۔ گذشتہ کئی برسوں سے راولپنڈی سے شائع ہونے والے ایک خوبصورت دوماہی ادبی پرچے "چہار سو" کے چیف ایڈیٹر تھے جس کے ایڈیٹر معروف افسانہ نگار گلزار جاوید ان کے روحانی شاگردوں اور عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ ضمیر جعفری نظم و نثر میں بے تحاشا شائع ہوتے رہے ہیں۔ خاکوں اور مزاحیہ مضامین اور سفرناموں کے علاوہ ان کا روزنامچہ بھی کئی پرچوں میں مسلسل شائع ہوتا رہا جس کا عنوان "ضمیر کی ڈائری" تھی۔ جنگ راولپنڈی میں "رنول رنگ" اور "ضمیریات" کے عنوان سے بھی مستقل کالم لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ بقول شخصے آپ نے "قلب نگاری" کا بھی ایک لنگر کھول رکھا تھا مگر اپنی بے شمار کتابوں کا دیباچہ لکھنے کیلئے بھی آپ کے پاس وقت نہ تھا۔ اپنے کلام نظم و نثر کو خود ترتیب دینے سے بھی گریزاں رہتے تھے حالانکہ زندگی بھر میں آپ نے بہت کچھ لکھا۔ دراصل آپ کے اندر درویشی کی صفات ننھیال کی طرف سے در آئی تھیں۔ ان کا سلسلہ پنجابی کے ایک انتہائی مقبول درویش شاعر سلطان العارفین پیر سید محمد شاہ صاحب سے ملتا تھا جن کے پنجابی ابیات اور جن کی لکھی ہوئی ہیر آزاد کشمیر، پوٹھوہار اور دھنی کے علاقوں میں ہیر وارث شاہ سے بھی زیادہ مقبول ہے اور "ہیر دی ہیر" کے عنوان سے یہ تصنیف ان علاقوں کے لوگوں کے دلوں میں دھڑکن بن کر گونجتی ہے۔ "من کے تار" کے عنوان سے ضمیر جعفری نے پیر سید محمد شاہ کی اس مقبول ترین کتاب کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ ضمیر جعفری میاں محمد بخش سے بھی بے حد متاثر تھے اور ان کی لازوال مثنوی "سیف الملوک" کو اردو نظم میں منتقل کرنا بھی آپ کا ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ بنیادی طور پر آپ کو علمی وراثت اپنے دادا سید احمد شاہ سے عطا ہوئی تھی جو ضلع جہلم کے قلعہ رہتاس کے واحد اور تاریخی مدرسے کے پہلے ہیڈ ماسٹر تھے۔ مزاح نگاری کی طرف آنے کی بنیادی وجہ ضمیر کے اپنے کہنے کے مطابق یہ تھی کہ انہوں نے اپنے والد محترم کو عمر بھر کبھی کھلکھلا کر ہنستے نہیں دیکھا جس کے رد عمل میں مزاح کا جذبہ پروان چڑھا۔ ان کے شعروں میں نمی دریائے جہلم کی عطا ہے جو ان کے چک کے قریب سے گزرتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سید ضمیر جعفری کی شاعری کے چھتنار درخت نے زندگی کے صحرا میں دور دور تک چھاؤں کر رکھی ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں یہ آواز مسلسل، منفرد اور معتبر رہی ہے اور اس نے شعوری طور بھی اور لاشعوری طور پر بھی اپنے بہت سے ہم عصروں اور اپنی آنے والی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ انہیں لامحدود شہرت حاصل ہوئی ہے اور انہوں نے اپنے زیر سایہ پروان چڑھنے والے پودوں کو بھی درخت کا روپ دینے میں ان کی صلاحیتوں کی آبیاری کی اور انہیں آگے بڑھایا، ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ضمیر جعفری ہر محفل نظم و نثر کی جان اور آن اور مان رہے، جہاں بھی گئے پاکستان کی پہچان رہے۔

پاکستان اور کشمیر سے ان کا لگاؤ ایمان کی حد تک شدید ہے۔ یہاں ان کے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ **1931**ء میں جب آپ ابھی آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے اور آپ کی شاعری کی مسیں بھیگ رہی تھیں تو آپ اسکول کے سالانہ جلسوں میں نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ انہی دنوں کشمیر میں راجہ ہری سنگھ کے خلاف بھی تحریک شروع ہوئی تھی اور جہلم سے کشمیر کی طرف جتھے روانہ ہونے لگے جو گرفتار کرلئے جاتے تھے۔ ضمیر جعفری نے ایک باغیانہ نظم ایسے ہی ایک جلسے میں پڑھی تو پولیس پکڑ کر تھانے لے گئی۔ اتفاق سے وہاں ایک مجسٹریٹ صاحب موجود تھے جو ان کے کرایہ دار تھے۔ انہوں نے ضمیر جعفری کو بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ مگر کشمیر کے ساتھ ان کا یہ جذباتی تعلق ختم نہیں ہوا اور بہت بعد جب حکومت ہند نے ان کی مزاحیہ شاعری پر انہیں اکبر الہ آبادی ایوارڈ دینے کا اعلان کیا جس کے ساتھ ایک خطیر رقم بھی دی جاتی ہے۔ تو ضمیر جعفری نے کشمیر میں بھارتی حکومت کے کردار پر احتجاجاً ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا۔ پاکستان بننے سے قبل وہ **1936**ء میں مشہور ادب نواز شخصیت ادیب اور "ہمایوں" کے ایڈیٹر شیخ سر عبدالقادر سے "ہمایوں گولڈ میڈل" لے چکے تھے۔ **1967**ء میں حکومت پاکستان نے آپ کو تمغۂ قائداعظم اور **1985**ء میں تمغۂ برائے حسن کارکردگی دیا۔ آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے گاؤں کو شہر سے ملانے والی سڑک کا نام ضلع کونسل نے ان کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔

ضمیر جعفری ایک انتہائی وضعدار، شریف النفس اور مرنجان مرنج شخصیت تھے۔ انہوں نے اگرچہ زیادہ شہرت مزاحیہ شاعری کی وجہ سے پائی مگر جب ان کا سنجیدہ کلام "قریۂ جاں" کے عنوان سے شائع ہوا تو سنجیدہ ادبی حلقوں کو بھی چونکا گیا کہ وہاں بھی ان کے کلام کی معنویت اور تہہ داری کا اور ان کی قادر الکلامی کا وہی عالم تھا۔ دراصل بات وہی ہے جو ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہی ہے کہ "جیسے پانی ٹھنڈا ہو یا گرم بنیادی طور پر پانی ہوتا ہے، اس طرح شاعری مزاحیہ ہو یا سنجیدہ اگر شاعری ہے تو از دل خیزد بر دل ریزد کے مصداق عمل اثر کرتی ہے۔ ان کے دونوں انداز کے کلام کو ملا کر دیکھئے تو عہد حاضر کی ایک بھاری بھر کم شخصیت آپ کے نہاں خانۂ دل میں شعر پڑھتے ہوئے وارد ہوگی۔

زیست کو مت جستہ جستہ دیکھنا
یہ تو ہے جنگل میں رستہ دیکھنا

خود ضمیر جعفری اپنے بارے میں کچھ یوں رائے دیتے ہیں۔

"میرا قریبی حلقہ احباب واضح طور پر تین گروہوں میں تقسیم ہے، ایک وہ جو میری سنجیدہ شاعری کو پسند اور مزاحیہ کو ناپسند کرتا ہے ایک وہ جو مزاحیہ شاعری کو کار خوش گردانتا ہے اور ایک وہ جو میرے اس سارے عمل ہی کو اکارت سمجھتا ہے۔"

مگر ظاہر ہے کہ شاعری یا ادب اس تیسرے حلقے کیلئے تو لکھا ہی نہیں جاتا۔ ضمیر کی شاعری کا ایک قابل ذکر حصہ قومی یا وطنی شاعری پر مشتمل ہے اور یہ کوئی لاشعوری رویہ نہیں، شعوری رویہ ہے کیونکہ ان کا نظریہ تھا کہ "آزادی اور سلامتی کیلئے تلوار کا سہارا لازمی تو ہوتا ہے لیکن میں تلوار کی آزادی کا حامی نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ قلم کی طاقت بھی جنگ ختم کرنے کیلئے استعمال کرنی چاہیے، جنگ کیلئے نہیں ـــ قلم سے تو قومی نظمیں لکھنی چاہئیں، قوم کو گرمانا چاہیے۔"

لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ضمیر جعفری نے اپنی آخری سانس تک قوم کو ہنسایا بھی، گرمایا بھی اور اسے سنجیدگی سے سوچنے پر بھی آمادہ کیا۔ اور اب یہی آواز جو عجیب مترنم لہجے میں خود ہنسے بغیر اپنا کلام مشاعروں میں پڑھ کر سامعین کو فلک شگاف قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتی تھی ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئی۔

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

ریاض سے مجھے مخدوم شبنم مناروی کا فون تعزیت کیلئے آرہا ہے، میں راولپنڈی فون کر رہا ہوں کہ گلزار جاوید کے غم میں شریک ہوسکوں۔ بعض اوقات ادبی رشتے خاندانی رشتوں سے قریب ہوتے ہیں۔

◆ ◆ ◆

سید ضمیر جعفری سے ایک ملاقات

ڈاکٹر اعجاز راہی

سید ضمیر جعفری سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی؟ یہ تو اب قصہ پارینہ ہوا۔ مگر ان سے آخری ملاقات اس دن ہوئی۔ جب وہ افتخار عارف کی دعوت پر مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے مرکزی دفتر کے لان میں اپنے ہاتھوں سے پودا لگانے آئے تھے اور افتخار عارف نے ہمیں بھی ازراہ محبت اس سادہ سی تقریب میں مدعو کر لیا تھا۔ سید ضمیر جعفری بظاہر ایک پودا لگا رہے تھے۔ حاضرین اپنے ہاتھ اٹھا کر اس پودے کے پھلنے پھولنے اور جوان ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے اور آج جب ضمیر جعفری ہم میں موجود نہیں، تو مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے وہ ایک پودا نہیں لگا رہے تھے بلکہ دانش گاہ ہست و بود میں اپنی بہجت فکر کا ایک ایسا جانشین مقرر کر رہے تھے جو ان کے بعد زندگی کی گھمبیر دوپہروں میں گھنیری چھاؤں سے ان کی ان محبتوں کا سلسلہ دراز رکھ سکے، جو وہ زندہ سانسوں کے ساتھ اپنے دوستوں میں تقسیم کرتے رہے تھے۔

کہتے ہیں جو آنکھ اوجھل ہوا پہاڑ اوجھل ہوتا ہے مگر بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو آنکھ اوجھل ہوں تو دل میں اتر جاتے ہیں اور جب تک دل پمپ کرتا ہے۔ وہ یادوں کے تسلسل میں زندوں کی طرح زندہ رہتے ہیں۔ ضمیر جعفری بھی ایک ایسے ہی محبت کرنے والے تھے کہ جب تک ان سے محبت کرنے والے زندہ ہیں، وہ زندہ رہیں گے۔

میری ضمیر جعفری سے ملاقات کب ہوئی؟ شاید اب یہ یاد کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ تاہم قریب جانے اور دور ہونے کے سلسلے ایسے رہے کہ ان سے ہر دوسری ملاقات پہلی ملاقاتوں کی تجدید کرتی رہی کہ پھر وہ جہاں بھی ہوتے میری نیاز مندی اور ان کی شفقت ایک مستقل تعلق خاطر میں بدلتی رہی۔

ان کا نام ویسے میرے ذہن کی زنبیل میں موجود تھا اور پہلی بار پوری شدتوں کے ساتھ اس وقت سامنے آیا جب ایوب خانی مارشل لاء زوروں پر تھا۔ اسلامی جمعیت طلباء اور قومی جمعیت طلباء کے درمیان چپقلش خاصی شدت پکڑتی جا رہی تھی۔ اسلامی جمعیت کا فکری تناظر مولانا مودودی کی سوچ سے مرتب تھا اور قومی جمعیت کا خمیر ترقی پسند نظریات سے اٹھا تھا۔ جس کے پیچھے امین مغل، ایرک سپرین، عابد حسن منٹو اور منہاج الدین جیسے جید سکالرز کھڑے تھے۔ مارشل لاء کے خلاف ردعمل صرف طلباء تک محدود ہو کر رہ گیا تھا کہ ایبڈو کی زنجیروں نے پاکستانی سیاستدانوں کی زبانیں اس طرح بند کر دی تھی جس پر آگے چل کر شاید ایسی ہی کسی صورتحال کو دیکھ کر جنرل ضیاء الحق نے کہا تھا کہ میں جب چاہوں پاکستانی سیاست کے کرتا دھرتا دم ہلاتے ہوئے میرے پیچھے چلنے لگیں۔ خیر اسلامی جمعیت اور قومی جمعیت کے مابین آویزش اس طرح تھی کہ قومی جمعیت کو دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا حکومت اور جمعیت دونوں کے ساتھ، ردعمل شدید تھا۔

جب بھی حکومت کے خلاف ردعمل ہو تو ردعمل کی کمر توڑنے کیلئے دیگر حربوں کے ساتھ گرفتاریاں ایک لازمی جزو ہوتی ہیں۔ قومی جمعیت کے کئی نوجوان گرفتار ہوئے جن میں آج کے ممتاز صحافی الفتح ویکلی مرحوم کے ایڈیٹر ارشاد راؤ بھی تھے۔ انہیں پولیس کی سخت گیری سے گزار کر پنجاب اسمبلی کی بلڈنگ کے ایک کمرے میں جو اس علاقے کے سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا دفتر تھا۔ پیش کیا گیا۔ جہاں ادھیڑ عمر کا ایک کیپٹن موجود تھا۔ جس نے پولیس کی طرح سرخ سرخ آنکھیں دکھانے کی بجائے بڑی شفقت سے کرسیوں پر بٹھایا اور "نظریہ ضرورت" کے تحت انہیں سزا سنانے کی بجائے کمال پدرانہ شفقت سے ملک، قوم اور نوجوان نسل کی ذمہ داریوں پر ایک لیکچر دیا اور انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔ جب ان لوگوں کی ہتھکڑیاں کھلیں تو وہ حیران و ششدر کبھی پولیس اور کبھی اس ادھیڑ عمر کیپٹن کو دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے اور انہیں تھانے کے انسپکٹر سے مارشل لاء کا یہ کیپٹن اچھا لگا۔ یہ سید ضمیر جعفری تھے اور یہ کیپٹن ضمیر جعفری نہ ہوتے تو شاید انہیں وہ انسپکٹر زیادہ اچھا لگتا، جو ہتھکڑی تو ڈال سکتا تھا سزا انہیں سناتا۔

ضمیر جعفری کے ساتھ یہ میرا پہلا تعارف تھا اور جب یہ غائبانہ ملاقات باقاعدہ ملاقاتوں میں بدلی تو وہ فوج سے سبکدوش ہو کر سابق مجاہدین بن چکے تھے۔ ان سے پہلی ملاقات یا پہلے بالمشافہ تعارف کے محرک ممتاز شاعر اور نیرنگ خیال کے مدیر سلطان رشک تھے۔ جن کی دوستی ایک مثال اور سید جعفری سے محبت بے مثال رہی۔ ان کے ہاں ضمیر جعفری سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اور پھر یہ سلسلہ عشروں پر پھیلتا چلا گیا۔

مجھے آج زندگی میں پہلی بار یہ مشکل پیش آ رہی ہے کہ میں کسی دوست کے بارے میں سوچوں کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہنے کو کوئی بات نہ ہو یا پھر اتنی باتیں ہوں کہ ذہن کو گنجلک کر دیں۔ میں دوسری کیفیت کا شکار ہوں۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ میں اپنی بات کا آغاز سلطان رشک کے ہاں اس واقعہ سے کروں، جب میں اور سلطان رشک دونوں ہی ادب میں نووارد تھے، تو سلطان رشک نے ضمیر جعفری سے میرا تعارف کرانا چاہا تو سید ضمیر جعفری نے درمیان سے ہی بات اچک لی اور کہا کہ میں حلقہ ارباب ذوق کے اجلاسوں میں بہت کم جاتا ہوں۔ ایک بار گیا تو یہ صاحب کسی پر یوں تنقید کر رہے تھے، جیسے غصے میں بھرا ہوا کوئی پٹھان درخت پر کلہاڑیاں چلا رہا ہو اور اسے یہ بھی پتہ نہ چلے کہ درخت کب کا گر چکا ہے۔ یا پھر غدیر ترک کی اس شام سے ذکر آغاز کروں۔ جب میر خانے میں (سید ضمیر جعفری جو ہر میر کے گھر کو حجرہ میر اور میر خانہ کہتے تھے) ملے تو ہم دونوں کے درمیان برسوں سے حائل حجاب و امتیاز کے تمام پردے گر گئے تھے اور ہم تادیر ان کی سنجیدہ شاعری سے محظوظ ہوتے رہے۔ اس شام احباب نے ان پر پابندی عائد کر دی تھی کہ ان سے مزاحیہ شاعری کی بجائے ان کی "اصل شاعری" سنی جائے گی۔ پھر وہ سناتے رہے اور ہم سنتے رہے۔ ہم سنتے رہے اور وہ سناتے رہے۔ میرے

نزدیک ضمیر جعفری کا اصل حوالہ ان کی سنجیدہ غزل کی سندرتا اور کوملتا سے منکشف ہوتا ہے۔ اور یہی روپ ان کا تسخیر کن بھی ہے۔

یہ میرا مقتدرہ قومی زبان میں ملازمت کا زمانہ تھا۔ ایک بار وہ تشریف لائے تو حسبِ معمول ڈاکٹر وحید قریشی سے ملاقات کے بعد دیگر احباب کے کمروں سے ہوتے ہوئے میرے کمرے میں بھی پہنچے۔ باتوں باتوں میں میں نے ان سے کہا کہ جب کوئی صوفی یا دوحیاتی دنیا کو تیاگتا ہے تو اس کی نظریں ایک نئے اور بہتر آفاق و آدرش پر ہوتی ہیں۔ مگر آپ نے مزاحیہ شاعری کا یہ کیموفلاج کیوں کر رکھا ہے۔ وہ قدرے حیرت سے میری طرف نیم وا آنکھوں سے دیکھتے رہے اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتے میں نے خود ہی اپنی بات مکمل کر دی کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور تغزل کے صاحبِ اسلوب تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے مزاحیہ شاعری میں پناہ کیوں لے رکھی ہے۔ میری بات سن کر انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک طویل قہقہہ لگایا اور پھر سنجیدہ ہو کر بولے لوگ ابھی تک مجھے ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانتے ہیں میرا جواب تھا، قبلہ لوگ کب پہچانتے ہیں، آپ کی شاعری انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور وہ اس ضمیر جعفری کی تلاش کرتے ہیں جو کہتے تھے ۔۔

مدت کے بعد اس نے سرِ انجمن ضمیر
دیکھا نگاہِ عام سے اور خاص کر دیا

مصلحت کا جبر ایسا تھا کہ چپ رہنا پڑا
ورنہ اسلوبِ زمانہ پر ہنسی آئی بہت

ایک لمحہ بھی مسرت کا بہت ہوتا ہے
لوگ جینے کا سلیقہ ہی کہاں رکھتے ہیں

ہر نظر بس اپنی اپنی روشنی تک جا سکی
ہر کسی نے اپنے اپنے ظرف تک پایا مجھے

خدا معلوم دل کو جستجو ہے کن چیزوں کی
نہ جانے کن ستاروں کی ضیاء کو دیکھتا ہوں میں

اپنی خبر نہیں ہے بجز اس قدر مجھے
اک شخص تھا کہ مل نہ سکا عمر بھر مجھے

ضمیر جعفری اپنے اشعار میری زبان سے سن کر کچھ خاموش سے ہو گئے۔ شاید سوچنے لگے ہوں کہ پٹھان زادے نے کھلا اور کھا کر شاعری کا روگ کیوں پال لیا ہے کہ شاعری تو وجہ رسوائی کے باعث توقیر کب تھی۔ یا پھر شاید وہ یہ سوچ رہے ہوں کہ وہ شخص جو عمر بھر مجھے نہیں مل سکا اسے کیسے مل گیا۔ اور آج برسوں بعد بھی میں سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ آخر ضمیر جعفری نے اصل ضمیر جعفری کو مزاحیہ شاعری کی صلیب پر کیوں چڑھا دیا تھا۔ کیا محض شہرت کیلئے؟ شہرت کیلئے تو جزیروں کے گیت بھی کافی تھے اور کھلیان بھی۔ خیر میں نے جعفری صاحب سے کہا کہ وہ شخص جو آپ کو عمر بھر نہیں ملا، ملتا بھی کیسے کہ اسے تو آپ نے گھر سے نکال دیا تھا اور اب وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا ہے۔ اب آپ کو کہاں ملے گا۔ انہوں نے ایک طویل خاموشی کے بعد اک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا چلو پٹھان زادے، وہ مجھے ملے نہ ملے یہ تو یقین ہوا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ تو میں نے کہا محفوظ ہاتھوں میں نہیں دلوں میں۔

ضمیر جعفری فوجی تھے مگر لانگ مارچ چیونٹیوں کے انداز میں کرتے۔ دشمن فتح کرتے تو دل بھی تسخیر کر لیتے۔ 1997ء کے اواخر میں انہوں نے امریکہ پر چڑھائی کر دی اور 52 میں سے کم از کم نصف ریاستوں میں جھنڈے گاڑتے ہوئے جب نیویارک پہنچے تو میں بھی دل کے پیچ و خم میں الجھا وہاں موجود تھا۔ ان دنوں نیویارک میں حلقہ اربابِ ذوق زوروں پر تھا۔ برف باری نے نیویارک شہر کی صورت بگاڑ کر رکھ دی تھی، مگر اتوار کی شام جیکسن ہائیٹس میں ہونے والے حلقے کے اجلاسوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ چنانچہ شام کے وقت جوہر میر کا فون آیا کہ آج سید ضمیر جعفری آرہے ہیں، تم جلدی آجانا اور میں اجلاس سے قبل ہی جوہر میر کے پاس پہنچ گیا۔ سید ضمیر جعفری حلقے کے اجلاسوں کو میر خانہ اور جوہر میر کے گھر کو حجرۂ میر کہتے تھے اور جواباً جوہر میر کہتے کہ جب ضمیر جعفری آتے ہیں تو غریب خانہ پیر خانہ بن جاتا ہے۔ اس اجلاس کی مجھے صدارت کرنا پڑی اور روایت یہی ہے کہ جب پیر آئے تو مرید بھی پر توقیر ہو جاتے ہیں اور اچھا ہوا صدارتی اختیارات کو بروئے کار لا کر میں نے ان کی ہی نہیں ان لوگوں کی بھی جو سید ضمیر جعفری کو محض مزاحیہ شاعر سمجھتے تھے، اس ضمیر جعفری سے ملاقات کرا دی اور جب دوسری شام جوہر میر کے پیر خانے میں اکٹھے ہوئے تو سید ضمیر جعفری نے اپنے چہرے پر پھیلی ابدی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا پٹھان زادے تم اپنے دل کے پیچ و خم سیدھے کرانے آتے ہو یا مجھے سیدھا کرنے۔ جواب میں ایک قہقہہ پڑا اور پھر یہ شام میری زندگی کا سرمایہ بن گئی۔ تمام تعظیمات، تمام احترامات کے باوصف اس شام میں وہ تمام تکلفات و امتیازات کی دیوار گر گئی جو شاید یہ شام نہ آتی تو میرے اور ان کے درمیان آج بھی قائم ہوتی۔ اور آج کے بعد میں کہاں سے ضمیر جعفری کو لاتا اور ان کو ان کے اصل تشخص کے ساتھ مل پاتا۔ میری ان سے دہ سالوں کی عقیدت پر اس ایک شام کی رفاقت ہر لحاظ سے بھاری تھی کہ اس شام انہوں نے شاعری بھی سنائی اور باتیں بھی۔ ہم نے ان کے تخلیقی پہلو کو بھی دیکھا اور مجلسی سبھاؤ کو بھی۔ اس شام انہیں دوستوں کے ہجوم میں گھرا ہوا بھی پایا اور درونِ ذات اکیلا بھی۔ حیرت تھی کہ وہ ہم سب کے درمیان اس قدر اکیلے کیوں ہیں۔ یہ عجب تھا کہ جب وہ باتیں کرتے تو ہم ان کا مخاطب ہوتے اور جب شعر سناتے تو یوں لگتا جیسے انہوں نے ہم سب کو منہا کر دیا ہے اور براہِ راست مکالمے پر اتر آئے ہیں۔ اور پتہ نہیں یہ مکالمہ وہ ذات سے کرتے تھے یا ہمزاد سے یا اس ماضی سے جو ان کے حال میں بدستور گزرا ہوا تھا یا پھر ان کا مخاطب وہ ضمیر جعفری تھا جو ہجومِ عاشقاں میں محبوبِ آرزو کی صلیب پر تنہا کھڑا تھا۔ اب پتہ نہیں کہ میری محسوسات خود میرا Illusion تھا یا لمحۂ معجزہ کہ جہاں ذات کی پہنائیاں عیاں ہو کر وارد ہو رہی تھیں۔ تاہم یہ شام میرے زاویہ ادراک میں ضمیر جعفری کو بند یا مندروں کی گھنٹیاں بجاتے دیوارِ گریہ سے چپٹے اور درگاہوں پر منت سماجی میں دھنستی رہی تھیں۔

جوہر میر اور اشرف میاں کہتے ہیں کہ ہجوم طالباں میں گھرا ہوا آدمی جب زندگی کی آخری سرحد پر پہنچا تو بالکل اکیلا کھڑا تھا۔ وہ اپنی شریکِ حیات کی دیکھ بھال کیلئے بالکل اکیلا اور جب اس کے اپنے دیکھ بھال کی باری آئی تو وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ اتنا اکیلا جیسے دشمنوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد سپاہی اکیلا رہ جاتا ہے۔ اور جنگ میں لگے ہوئے سارے زخم پھر سے ہرے ہو کر درد بن جاتے ہیں۔ اس کی آواز گنگ ہو جاتی ہے۔ اعصاب بان کی چارپائی کی طرح ڈھیلے اور آنکھیں تھک سی جاتی ہیں۔ آنکھیں تھک جائیں تو آدمی پورا کا پورا تھک

جاتا ہے۔ اور سید ضمیر جعفری اپنے آخری لمحوں میں اپنے چہرے پر لبوں کی مسکراہٹ سجاتا تو نہیں بھولے۔ مگر ان کی آواز انہیں بھول گئی تھی۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے خود اپنی زبان پر تالے لگا دیئے ہوں کہ زندگی بھر خوشیاں بانٹنے والا ضمیر جعفری زندگی کی آخری حد کی آخری سرحد پر کھڑا وہ کچھ نہ کہہ دے جو وہ دیکھ رہا تھا جو بیت رہا تھا، جو بیت گیا تھا یا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ شخص جو عمر بھر اسے مل نہ سکا تھا، زندگی کے آخری لمحوں میں اس کا ہمسفر بن گیا ہو اور ایسا ہوتا ہے جب انسان برسوں بعد خود سے ملے، تو پھر خود سے ہی ہم کلام ہو جاتا ہے اور سب سے بے کلام۔ ذات ہی مخاطب اور ذات ہی مقابل آجاتی ہے۔ کون جانے انہوں نے سوچا ہو کہ زندگی بھر رشتے نبھاتے نبھاتے جو چند آخری سانس بچے ہیں، انہیں زبان کی نظر کرنے کی بجائے ذات میں ڈبو لیا جائے۔ کہ وہ شاید یہ بھی جانتے تھے کہ لوگ آنے والوں کی نسبت جانے والوں سے جلد بیزار ہو جاتے ہیں خواہ اردگرد کے لوگ خون کے رشتوں سے ہی کیوں نہ بندھے ہوں پھر آدمی خود بھی سوچنے لگتا ہے۔

کون کب تک ان کھنڈر ہوتے جزیروں میں رہے
کون رشتوں کو نبھائے سرگرانی کی طرح

پھر وہ چپ چاپ آنکھیں موند لیتا ہے اور سید ضمیر جعفری نے یہی کچھ کیا آخر وہ کب تک رشتوں کو نبھاتے جو گرانقدر تو تھے گراں بار بھی تھے۔ جو آسودہ روح تھے، سوہان روح بن رہے تھے۔ سو وہ ایک لفظ زبان سے ادا کئے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور میں جن سے ان کا کوئی نظریاتی رشتہ نہیں تھا، اپنے دل میں ان کے لبوں کی خاموشی اور دل کی دھڑکنوں کو اب تک محسوس کرتا ہوں کہ یہ دل جو ہے نا، یہ ذات، مذہب، فکر اور نظریے کو نہیں مانتا۔ میرا ضمیر جعفری کے ساتھ محبت کا اور احترام کا رشتہ تھا جو شاید آخری سانس تک رہے۔

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

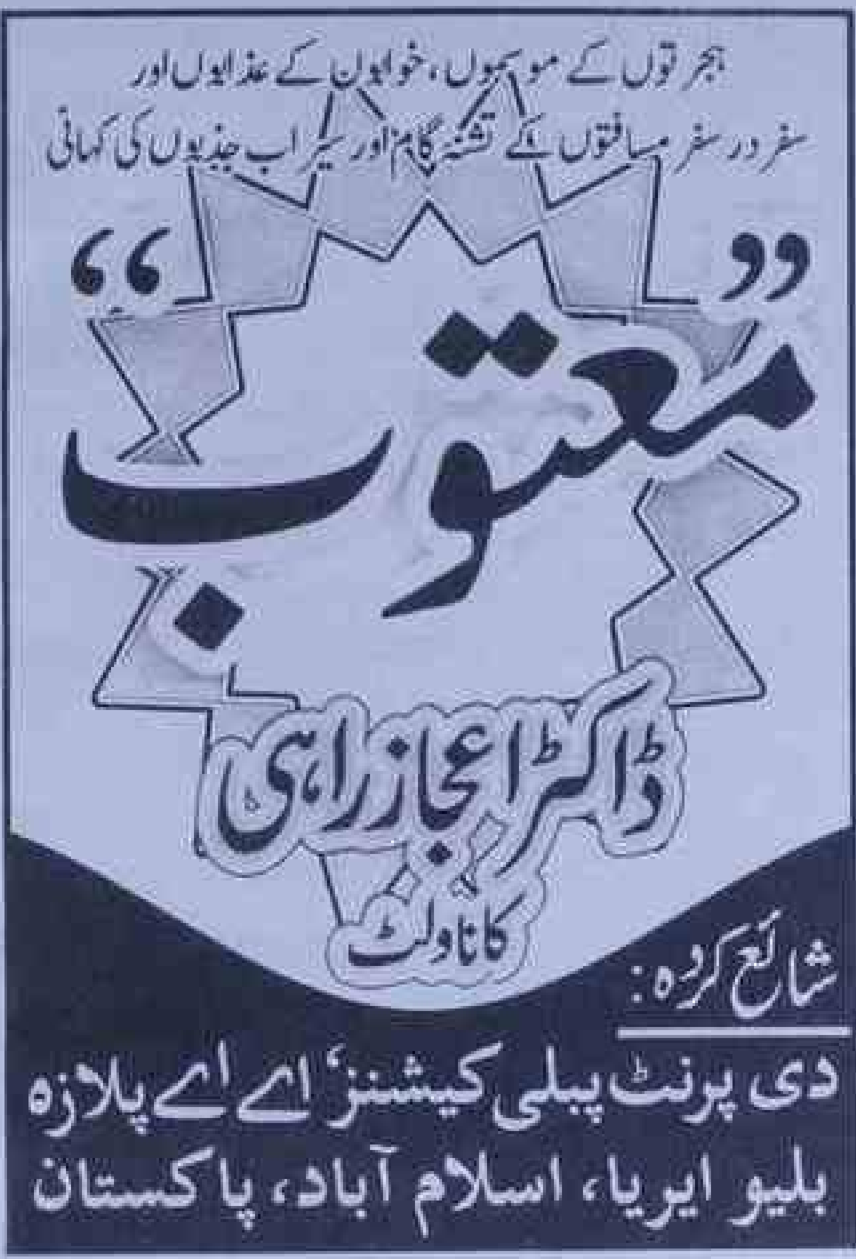
ہجرتوں کے موسموں، خوابوں کے عذابوں اور
سفر در سفر مسافتوں کے تشنہ گام اور سیراب جذبوں کی کہانی
"معتوب"
ڈاکٹر اعجاز راہی
کا ناولٹ
شائع کردہ:
دی پرنٹ پبلی کیشنز، اے اے پلازہ
بلیو ایریا، اسلام آباد، پاکستان

سید ضمیر جعفری نیویارک میں احباب کے ہمراہ

ضمیر جعفری "مافی الضمیر" کے آئینے میں

علی منور ندیم

جناب ضمیر جعفری جنہیں مرحوم کہتے ہوئے آج بھی تامل ہوتا ہے، طنز و مزاح نگاری میں ایک مستند مقام رکھتے ہیں۔ انہیں یہ مقام کسی اچانک حادثے یا میڈیا پروموشن کی بنیاد پر نہیں ملا اس کے پیچھے ان کی انتھک جدوجہد اور طنز و مزاح نگاری سے مستقل وابستگی کی طویل داستان ہے۔ جعفری صاحب کے طنزیہ مزاحیہ کلام کی پہلی کتاب کا نام "مافی الضمیر" ہے یہ کتاب سن 70ء کے اوائل میں مارکیٹ میں آئی تھی، جعفری صاحب اس کتاب کی اشاعت سے قبل بحیثیت مزاح نگار اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ سن پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں کے دوران مشاعروں میں جعفری صاحب نے سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ مزاحیہ کلام پیش کرنا شروع کر دیا تھا لیکن ان دونوں عشروں کے دوران طنز و مزاح نگار کی منفرد پہچان تسلیم نہیں ہوئی تھی۔ ایوب خان کے زمانے میں ریڈیو کے ایک مشاعرے میں جعفری صاحب نے اپنی مزاحیہ غزل جس کی ردیف "پیدا کرو" ہے پیش کی تھی، اس غزل کے یہ دو شعر اسی زمانے میں بہت مشہور ہو چکے تھے۔

شوق سے لخت جگر، نور نظر پیدا کرو
ظالمو تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو
میں بتاتا ہوں زوال اہل یورپ کا پلان
اہل یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

پہلا شعر پاکستان میں آبادی کی بڑھتی ہوئی رفتار اور گندم کی قلت کے سبب امریکہ سے سرخ گندم کی درآمد کے پس منظر میں خوب مزا دیتا تھا، دوسرا شعر مسلمانوں کے زوال اور پسماندگی کے حوالے سے آج بھی مزا دیتا ہے۔ جعفری صاحب کی کتاب "مافی الضمیر" مارکیٹ میں آنے کے بعد طنز و مزاح نگاری میں ان کے مستقل مقام کا تعین ہوا۔ اس کے بعد جعفری صاحب نے طنز و مزاح میں جو کام کیا ہے اسے بیان کرنے کیلئے کہا جا سکتا ہے کہ "سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کیلئے"۔ یہاں گفتگو کو جعفری صاحب کی پہلی کتاب "مافی الضمیر" تک محدود رکھا جا رہا ہے۔ ضمیر جعفری صاحب اپنی کتاب "مافی الضمیر" کے پیش لفظ میں اس کتاب کی طباعت کے وقت تک اپنی مزاحیہ شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "جب بھی میں پلٹ کر اپنی کاوش پر نظر ڈالتا تو شعر کے علاوہ میں خود بھی اپنی نظر سے گرنے لگتا، یوں محسوس ہوتا کہ جو بات کہنا چاہتا تھا کہہ نہیں سکا، بات جس طرح کہنا چاہتا تھا اس طرح نہیں کہہ سکا، فکر کے راستے پر ایوان معنی کے اندر داخل ہوتا تو کیا، ڈیوڑھی کے دربانوں سے علیک سلیک کی نوبت بھی مشکل سے آتی تھی اور فنی تزئین و تہذیب کے اعتبار سے بیشتر تخلیقات کا گویا ..... آگا بھی کھل رہا تھا اور پیچھا بھی کھل رہا تھا۔"

ضمیر جعفری صاحب کا اپنی تخلیقات اور نگارشات کے بارے میں ایسا تردد کرنا کوئی احساس کمتری یا تخلیقی بے بضاعتی کا اظہار نہیں، ہر بڑے سے بڑا لکھنے والا اسی طرح تشنگی اور اپنی ناتمامی کا احساس رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ فی زمانہ ایسے افراد بھی نظر آتے ہیں کہ وہ چار الٹی سیدھی نگارشات اور چند غیر معیاری ادبی ذوق رکھنے والوں کی داد و ستائش سن کر اپنے آپ کو شیکسپیئر، ملٹن، غالب اور میر کے ہم پلہ سمجھنے لگتے ہیں۔

بقول جعفری صاحب وہ "اپنے کلام کو کتاب میں ڈھالنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ان کے دو قریبی دوست کرنل محمد خان اور میجر صدیق سالک ایک روز ان کے گھر آئے اور مزاحیہ شاعری کا سارا پلندہ اٹھا کر لے گئے۔ اس کے بعد میجر صدیق سالک نے منظومات کو مسودے کی صورت میں ڈھالنے کا اور کرنل محمد خان نے انتخاب کلام اور اشعار کی معنوی ترتیب دینے کا فریضہ انجام دیا۔ کرنل شفیق الرحمن اور بریگیڈیئر گلزار بھی تھے، جو اشعار کی سلامی لیتے ہوئے مسودے اور منصوبے کی دیکھ بھال کرتے رہے۔" ضمیر جعفری صاحب اپنے دوستوں کے تعاون پر دلچسپ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب مصنف کی زندگی ہی میں کچھ اس طرح شائع ہو رہی ہے جیسے مصنف کے انتقال کے بعد شائع ہوتی۔" جعفری صاحب اپنی کتاب کی اشاعت کو گاؤں میں شادی بیاہ کی تقریب سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں "احباب کی لگن لگاوٹ اور ریل پیل کو دیکھ کر میرے ذہن میں بے اختیار اپنے گاؤں میں شادی بیاہ کی بعض تقریبات کا نقشہ تازہ ہو جاتا تھا جن میں گھر والوں نے صرف شادی کی تاریخ ہی کا اعلان کیا تھا باقی سارے انتظامات برادری کے لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے، کوئی چارپائیاں جمع کر رہا ہے، کوئی بستر، کوئی برتن۔"

ضمیر جعفری صاحب پر گفتگو کرتے ہوئے اور طنزیہ مزاحیہ ادب میں ان کے مقام کا تعین کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے دو اہم سوالات کا جواب ضرور حاصل کر لینا چاہیے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ ادب کیا ہے؟ اور دوسرا سوال یہ ہے ادبی طنز و مزاح کیا ہے؟ فی زمانہ ادب کے حوالے سے مزاج کچھ اس طرح ہو گیا ہے کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" ہوئی ہے، اپنے آپ کو ادیب، تخلیق کار اور مزاح نگار کہلانے کے خبط میں مبتلا ہے۔ کب کوئی تحریر ادب ہوتی ہے اور کب ادب کی بلند سطح تک پہنچنے سے قاصر رہتی ہے، اس کا سمجھنا ضروری ہے۔ وہ تحریریں جو ادب میں شمار ہوتی ہیں، غیر ادبی تحریروں سے اپنی ہیئت اور معنویت میں مختلف ہوتی ہیں، ان دونوں میں کئی بنیادی فرق ہے۔ زمانہ قدیم سے ادب اسے سمجھا جاتا ہے جس میں حسن لطیف کی تشکیل ایک مخصوص زبان اور طرز بیان کے ذریعے ہو سکتی ہو۔ ادبی تحریروں کی پہچان یہ ہے کہ اس میں ہیئت اور مخصوص طرز بیان کے علاوہ قاری کو اپنی تحریری گرفت میں لینے کی اثر پذیری، ادبی مواد، اخلاقی اور سماجی

شعور، ذات سے کائنات تک کے وہ معاملات جن کا تعلق انسانی جذبات یا ذہنی و قلبی واردات سے ہو موجود ہوتے ہیں اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو ادب کو غیر ادب سے علیحدہ کرتی ہیں۔ تحریروں کی ہیئت اور مخصوص طرزِ بیان میں بظاہر جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ ہمارے حسِ لطیف کی تسکین تو کرتے ہیں لیکن ہیئت اور طرزِ بیان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ ان الفاظ کے پیچھے کچھ مخفی مفہوم اور معانی بھی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ادیب جذبے، فکر، سوچ، خیال آفرینی کے ساتھ ساتھ ماورائی حیات کی تخلیق و تشریح بھی کرتا ہے۔ ماورائی حیات وہ حیات ہوتی ہیں جن کا ادراک ہم صرف اپنے تخیل یا تصور کے واسطے سے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ یعنی یہ حیات عالم موجودات میں کہیں بھی موجود نہیں ہوتی ہیں لیکن ہم ادبی تحریروں کے ذریعے انھیں محسوس کرتے ہیں۔ ہر بڑی چھوٹی ادبی تحریر کی یہی خصوصیت ہوتی ہے اور ادبی تخلیقات کا یہی وہ بنیادی جوہر ہے جو اسے غیر ادبی تحریروں سے ممتاز کرتا ہے۔ بات کو مختصر کرنے میں میر تقی میر کا شعر ؎

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

پیش کیا جا سکتا ہے۔ عالم موجودات میں دل اور جاں سے دھواں اٹھنا خلاف واقعہ امر ہے لیکن شاعر کی ماورائی حسیت نے اپنے تخیل کے ذریعے اس کو محسوس کیا ہے۔ غالب کے کلام میں ماورائی حیات کی کثرت ہے اسی وجہ سے غالب، غالب ہے۔ ان کے دیوان کا پہلا شعر ہی یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقش کو فریادی کی صورت میں دیکھنا، کائنات کی تخلیق کو شوخی، تحریر کی طرح پڑھنا اور ہر تصویر کو پیکریت کی ایسی حالت میں دیکھنا کہ وہ کاغذی پیرہن پہنے ہوئے ہے، اتنی تخیل آفرینی غالب ہی کر سکتا ہے۔ مگر غالب نے اپنی حسیت کو اپنے شعر میں اس طرح ڈھال دیا ہے کہ قاری عالم تخیل میں غالب کی انگلی پکڑے پکڑے عالم حیات کی سیر کرتا نظر آتا ہے۔ فیض کہتے ہیں ؎

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

بادِ نوبہار کا یہ انتظار کرنا کہ شاعر کا محبوب گلشن میں آ جائے تو وہ فطرت کے حسن کو سنوارنے کا کام شروع کرے۔ گلوں میں رنگ بھرے جائیں، کونپلیں پھوٹیں، سبزہ لہلائے، بادِ نوبہار چلے عقلی اور عملی طور پر غیر منطقی ہے مگر شاعر نے اپنے تخیل کی مدد سے نئی حسیت کی تخلیق کی اور اس طرح شاعر کا عالم تصور حقیقی دنیا سے مختلف لیکن ایک محسوس وجود کا حامل ہو گیا۔

یہ اشعار ماورائی حسیت کی تخلیق کرتے ہیں اس کیلئے شاعری میں تشبیہ اور استعارے سے، کہانیوں میں کردار اور منظر نگاری سے اور طنز و مزاح نگاری میں حرکات، واردات اور واقعات سے مدد لی جاتی ہے۔ ہر طرح کی ادبی تحریر قاری کی ماورائی حسیت کو تحریک دیتی ہے۔ اس عمل میں ادیب کی ماورائی حسیت اور قاری کی ماورائی حسیت ایک مقام پر جا کر ابلاغ اور ترسیلِ ابلاغ میں یکجا ہو جاتی ہیں، یہی وہ عمل ہے جسے ہم "معیاری ادبی تخلیق" کہہ سکتے ہیں۔

ادبی طنز و مزاح نگاری کو سمجھنے کیلئے ہمیں سب سے پہلے تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کا یہ قول ذہن میں رکھنا ہوگا کہ طنز و مزاح نگاری محض ہنسنے ہنسانے کا نام نہیں ہے۔ ہنسانے کا کام تو کسی اسٹیج یا سرکس کا کامیڈین یا جوکر بھی کرتا ہے لیکن ہم اسے ادبی طنز و مزاح کا نام و رتبہ نہیں دے سکتے۔ ادبی طنز و مزاح کو پہلے تو اوپر بیان کئے ہوئے ادب کے وسیع مفہوم اور اس کی واضح تعریف پر پورا اترنا چاہیے اور دوسری اہم بات یہ کہ ادبی طنز و مزاح کے اندر نیکی کا جذبہ بھی کارفرما ہونا چاہیے۔ نیکی کا وہ جذبہ جس سے کسی خامی، برائی یا بدراہی کی اصلاح یا نشاندہی ہو سکتی ہو اسی لئے کہا جا سکتا ہے ادبی طنز و مزاح گلیشیر کی طرح ہوتا ہے کہ جتنا الفاظ کے پردوں سے باہر نظر آتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ مفہوم الفاظ کے پیچھے ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ ادبی طنز و مزاح کے اندر گہرا دکھ اور درد چھپا ہوا ہوتا ہے۔ خود ضمیر جعفری صاحب نے اپنی مزاح نگاری کے بارے میں کہا ہے کہ ؎

میرے شعرِ تر پہ ہنس لینے کے بعد
دیدۂ اہلِ نظر — تر ہو گیا

یہ خصوصیت جناب ضمیر جعفری کے علاوہ دنیا کے جتنے بھی بڑے بڑے طنز و مزاح نگار ادیب ہیں ان سب کے ہاں موجود ہے۔ ان تحریروں کے ظاہری معنی و مطالب کے پیچھے بہت بڑے بڑے مسائل کی نشاندہی اور زندگی کے بہت بڑے بڑے سوالات ملتے ہیں۔ جب ہی وہ ادبی طنز و مزاح نگاری کے کھرے معیار پر پورا اترتے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو ہمیں انھیں ادب سے خارج کرنا ہوگا۔

ضمیر جعفری صاحب کی کتاب "مافی الضمیر" ادبی طنز و مزاح نگاری کے معیار پر پورا اترتی ہے بظاہر پہلی نظر میں اس میں چند ہنسنے ہنسانے والی باتیں ہیں مگر جب آپ کرید کرتے کرتے الفاظ کے پیچھے جھانک کر دیکھتے ہیں تو آپ کو زندگی کے، حیات کے، معاشرے کے، عہد حاضر کے، مشرقی و مغربی تہذیب کے اور مجموعی طور پر انسانی فطرت کے بڑے بڑے مسائل اور ناسور نظر آتے ہیں جن کا احساس کرتے ہوئے آپ کی آنکھیں نم بھی ہو سکتی ہیں۔

مافی الضمیر کے چند اشعار کے اعادے اور ان کے پیچھے چھپے ہوئے معانی و مطالب کی نشاندہی ہو جائے تو بات سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ جعفری صاحب کا ایک شعر سنئے، یہ شعر انھوں نے الیکشن کے حوالے سے اپنی نظم "میرا انتخابی منشور" میں لکھا ہے ؎

اُدھر پہ کھول کر سارے "مسامات خردمندی"
مناسب حد میں رکھیں گے "زن آزادی و زرمندی"

ہمارے کسی سیاسی لیڈر کا قوم کے "مسامات خردمندی" کھولنے کا دعویٰ اپنی جگہ بذات خود کتنا مضحکہ خیز ہے اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی زن آزادی اور زرمندی کو مناسب حد میں رکھنے کا منشور ہمارے سیاسی کلچر کے پیچھے اصل حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک اور شعر ہے ؎

آدمی سے سلوک دنیا کا
جیسے انڈا تلا کرے کوئی

انڈا تلنا ایک عام سا فعل ہے لیکن اس عمل کیلئے پہلے انڈے کو توڑا جاتا ہے پھر اس کو پھینٹا جاتا ہے پھر اس کو گرم گرم توے یا فرائی پان پر کھولتے ہوئے تیل میں ڈال کر الٹا پلٹا جاتا ہے۔ ان سارے عوامل کا نام انڈا تلنا ہے۔ ہمارے عہد میں دنیا کا آدمی سے ایسا ہی کچھ سلوک ہے۔ اگر ہم سنجیدگی سے سوچیں اور معنی کی گہرائی کا اندازہ کریں تو ہمیں اپنے عہد اور طرز تپاک دنیا دیکھ کر اس شعر کے اندر ایک آشوبِ روزگار محسوس ہوگا اور آنکھیں نم ہو جائے گی۔ ایک اور شعر دیکھیں ۔

مدوجزر زندگانی کی بدولت آگیا
ہر قدم پہ دو قدم پیچھے سرک جانا مجھے

بظاہر جعفری صاحب نے اپنی کم ہمتی کا ذکر کر کے اپنی شخصیت کا خاکہ اڑایا ہے اور ماورائی حیثیت کو کام لاتے ہوئے تصور کی آنکھ سے ایسے انسان کی رفتار کا نقشہ کھینچا جو ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ لیکن جعفری صاحب نے مدوجزر زندگانی کیوں کہا یہ تو کسی سمندر کا ذکر کر رہے ہیں اب ہمیں سمندر کی خاصیت کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ سمندر سے جب زمین حاصل کی جاتی ہے تو اس کے آگے پشتے باندھ دیتے ہیں، سمندر ان پشتوں کو بہالے جانے کی قوت رکھنے کے باوجود اپنی وسیع الظرفی کا ثبوت اس طرح دیتا ہے کہ زمین چھوڑ کر خود پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اب ہمیں شاعر کم ہمت نظر نہیں آتا، شاعر تو اپنی وسیع الظرفی کا ذکر کر رہا ہے اور شاعر کی زندگی میں مدوجزر پیدا کرنے والے لوگ بہت چھوٹے لوگ لگنے لگتے ہیں، ان کی حالت پر افسوس اور ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اب غزل کا ایک شعر دیکھیں ۔

یہ تیرے حقے کی ٹوپی تیرے سر پر تھی کبھی
یہ نہیں ہے وہ تو پھر وہ ہے کہاں مجھ سے نہ پوچھ

حقے کی آگ جلانے کیلئے اس کے اوپر مخروطی ٹوپی رکھ دی جاتی ہے شاعر اپنے مخاطب کے سر پر ٹوپی نہ دیکھ کر کہتا ہے کہ مجھے لگتا ہے حقے کے سر پر رکھی ہوئی ٹوپی وہی ٹوپی ہے جو کبھی تیرے سر پر ہوا کرتی تھی اور اگر یہ ٹوپی وہ ٹوپی نہیں ہے تو تیری ٹوپی کہاں گئی، مجھ سے نہ پوچھ۔ یہاں مجھ سے نہ پوچھ میں یہ اشارہ بھی ہے کہ مجھے معلوم ہے تیری ٹوپی کہاں ہے لیکن مجھ سے نہ پوچھ تو بہتر ہے۔ ٹوپی، پگڑی اور طرہ ہماری تہذیب اور شرافت کی علامت اور نشانی ہوا کرتے تھے۔ ہم نے اپنی تہذیب اور شرافت کو کس طرح تباہ کیا ہے اس شعر میں اس المیے کی نشاندہی ہے اور یقیناً یہ کوئی ہنسنے والی بات نہیں ہے۔ ایک اور شعر دیکھیں ۔

انگیٹھوں پہ طمانچے، آنگنوں میں راکھ دیکھ
کاروبار شہر تو بالٹیاں مجھ سے نہ پوچھ

اس شعر کے مخفی معنوں اور المیے کا ذکر کرنے سے بہتر ہے کاروبار شہر تو بالٹیاں کی عملی مثالیں دیتے ہوئے یہ کہا جائے کہ گزشتہ دس برسوں کے اندر بے نظیر اور نواز شریف حکومتوں نے کتنے انگیٹھیوں پر طمانچے مارے اور کتنے آنگنوں میں راکھ بکھیری ہے۔ ان کارناموں کو یاد کر کے اس صورتحال پر ہنسیں یا روئیں، آپ پر منحصر ہے۔ جعفری صاحب کی ایک اور نظم کے دو شعر دیکھیں ۔

کبھی اک سال میں ہم غلغلِ اقبال کرتے ہیں
پھر اس کے بعد جو کرتے ہیں وہ قوال کرتے ہیں

ہم نے علامہ اقبالؔ کا جو حشر کیا ہوا ہے وہ اس شعر سے واضح ہے۔ سرکاری سطح پر سال میں ایک بار اقبالؔ کی عظمت کے گن گائے جاتے ہیں پھر سارا سال قوال علامہ اقبالؔ کی تال جاتے رہتے ہیں۔ ان قوالوں میں مذہبی بازی گروں، سیاسی شعبدہ بازوں کے علاوہ اور کون کون شامل ہے یہ الگ المیہ ہے۔ اسی نظم کا ایک اور شعر ہے ۔

جہاں کی تیز رفتاری کو کچھ روکا تو ہے ہم نے
ہمیں جو آج کرنا ہے وہ اگلے سال کرتے ہیں

ہم مسلمانوں اور خاص کر پاکستانیوں کے ایک مخصوص رویے کی طرف اشارہ ہے۔ اس المیے پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ یہ شعر دیکھیں ۔

نظر کی عیب جوئی، دل کی ویرانی نہیں جاتی
یہ دو صدیوں کی عادت ہے یہ آسانی نہیں جاتی

ہندوستان دو سو سال غلام رہا۔ اس غلامی نے ہماری کیا ذہنیت بنا دی ہے اس کا ذکر ہے۔ جعفری صاحب کی ایک اور نظم شہر کی سڑکوں کے بارے میں ہے۔ سڑک کہ رفتار اور ترقی کی علامت ہوتی ہے اس میں جگہ جگہ گڑھے پڑے ہیں، وہ کہتے ہیں ۔

کھڑی اونچائیوں کے پیٹ میں گہرائیاں دیکھو
گڑھوں کی جا بجا بھرائیاں، چٹائیاں دیکھو
ہم ان سے حلم و صبر و ضبط کا پیغام لیتے ہیں
کہ جب چلتے ہیں کم از کم خدا کا نام لیتے ہیں

ان اشعار میں جب چلتے ہیں کم از کم خدا کا نام لیتے ہیں کا لطف لیں، ضمیر جعفری صاحب کی ایسی ہی باتوں سے متاثر ہو کر میں نے انہیں اپنا روحانی استاد مانا ہے۔ ضیاء الحق کے زمانے میں حکم آیا تھا کہ ہر فنکشن کی ابتداء قرأت سے کی جائے۔ لوگوں نے اس پر اس طرح عمل کیا کہ ناچ گانوں کے فنکشنوں سے پہلے تلاوت کرائی جانے لگی، اس پر میں نے کہا تھا۔

سرکاری حکم اترا ہے حکم وحی کے ساتھ
اب اس کے بعد قوم کا مولا بھلا کرے
قرأت سے ہو رہی ہے ہر ایک شے کی ابتداء
بسم اللہ کہہ کے بائی بھی مجرا کیا کرے

ضمیر جعفری صاحب کا ایک اور شعر دیکھیں۔ اس شعر میں شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں کے بوجھ سے دبے ہوئے شخص کی حالت پر بھرپور طنز ہے ۔

عمر بھر صحرا نوردی کی مگر شادی نہ کی
قیس دیوانہ بھی تھا کتنا سمجھ دار آدمی

جعفری صاحب کا ایک اور مزیدار شعر دیکھیں ۔

زاہد کو مے پلا کے پشیماں ہے ضمیر
نقد و گناہ دونوں ہمارے حساب میں

یعنی شاعر نے تو دوستی میں زاہد کو اپنی جیب سے شراب پلائی اب زاہد کہہ رہا ہے کہ شاعر نے گناہ کر دیا یعنی نقد تو خرچ ہوا ہی تھا، شراب پینے کا گناہ بھی شاعر کے حساب میں لکھا گیا۔ اب یہ شعر دیکھیں ۔

میاں رمضان گردن تک تو کچھ کچھ ٹھیک آتے ہیں
مگر پھر بعد کی گڑبڑ میں سر پیدا نہیں ہوتا

اگر میاں رمضان کا مطلب آج کے دور کا مسلمان لیا جائے تو آپ کو اپنے اطراف ایسے دو چار ضرور نظر آئیں گے جن کے ہاں بعد کی گڑبڑ میں سر پیدا ہی نہیں ہوا۔ اب "مافی الضمیر" سے کچھ اشعار بغیر کسی تبصرے کے پیش ہیں، پڑھیں اور لطف لیں ۔

آج کل منبر رسولؐ پر بھی
لوگ ہیں السطور رہتے ہیں

یوں جمعہ لیلقاء سے بنتے رہے ضمیر
لیٹے رہے کبھی تو کبھی دیکھتے رہے

اتارو طاق سے ان میں بھی جھانکو ان میں بھی دیکھو
مبادا شعر بیٹھا ہو، پرانے مرتبانوں میں

نیڈیوں کو کاش اہلِ مدرسہ
علم سے پہلے کوئی شعور دیں

کوئی رومی، کوئی رازی، کوئی اقبال پیدا کر
کہ شہروں کی بڑائی ان کے میناروں میں ہوتی ہے

وہ تراشِ زلف و ابرو ہو کہ محرابِ قبا
ہے زنانے میں وہی عالم جو مردانے میں ہے

جناب شیخ یوں چلتے ہیں علم و فضل کو لے کر
کسی ٹھیلے سے جیسے کوئی الماری نہیں جاتی؟

شیخ جی کے حق میں یہ مانگو دعا اے دوستو!
ان کو روٹی بھی خدا بخشے، دل روشن کے ساتھ

کھلتا نہیں یہ بھید کہ بزمِ سخن میں لوگ
طبلے کے ساتھ ہیں کہ سخنور کے ساتھ ہیں

ہائے کس کمسن پہ کس موسم میں دل آیا ضمیر
اس کو فیشن چاہیے، فدوی کو پنشن چاہیے

سچ ہے مشرق اور مغرب ایک ہو سکتے نہیں
اس طرف بیوی کھلی ہے، اس طرف شوہر کھلا

چل رہی ہے مشین مغرب میں
اور مشرق میں چل چلاؤ ہے

مفلسی میں جس کی ڈاڑھی بڑھ گئی
زینتِ محراب و منبر ہو گیا

دریدہ دامنوں، خستہ گریبانوں کی باتیں ہیں
غزل میں جتنی باتیں ہیں، مسلمانوں کی باتیں ہیں

بھائی مولا بخش کس کس فلمے کو ووٹ دے
بھائی مولا بخش کو اپنا بھی نام آتا نہیں

بہ فیضِ کثرتِ اولاد وہ نوبت بھی آ پہنچی
کہ اب منے کی ماں، شوہر کی ماں معلوم ہوتی ہے

وہ کہتے ہیں کہ دنیا امن و آسائش کی جنت ہے
چلو ہم آج ان کو آج کا اخبار دیتے ہیں

ضمیر جعفری صاحب کی کتاب "مافی الضمیر" سے یہ چیدہ چیدہ اشعار لئے گئے ہیں۔ اوپر کی سطور میں ماورائی حسیت کو اولی تخلیق کا بنیادی جوہر کہا گیا ہے۔ اگر جعفری صاحب کے اشعار قاری کی فکر اور احساسات کو کچھ سوچنے کچھ سمجھنے کی تحریک دیتے ہیں تو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان کی نگارشات نے اپنا حق ادا کر دیا۔ اکبر الہ آبادی کے بیشتر اشعار میں بھی یہی کیفیت ہے انہیں بھی پڑھ کر قہقہہ نہیں ابھرتا لیکن سوچنے اور سمجھنے کیلئے بہت دیر تک قاری کا ذہن ان اشعار کی گرفت میں رہتا ہے۔ درج بالا اشعار پڑھ کر جناب ضمیر جعفری کی نگارشات کے معیار اور اشعار میں مخفی معنوی گوشوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان

بقیہ صفحہ نمبر 43 پر

بیادِ سید ضمیر جعفری

جمیل یوسف

پچھلے دنوں جب سے پیر و مرشد سید ضمیر جعفری کے انتقال پر ملال کی خبر آئی ہے ان کی یادوں کا ایک ہجوم ہے جو ذہن کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ یادیں کم و بیش گذشتہ 42 سالوں پر محیط ہیں۔ ان سے پہلی ملاقات 1957ء میں ہوئی تھی جب میں گورنمنٹ کالج چکوال میں سال دوم کا طالب علم تھا، وہ کالج کے مشاعرے میں تشریف لائے تھے۔ بزم ادب کا سیکرٹری ہونے کے ناطے شاعروں کے استقبال کا خوشگوار فریضہ میرے سپرد تھا، یہ اتنا بڑا اعزاز تھا کہ پورے شہر میں کوئی شخص اپنے سے زیادہ خوش قسمت نظر نہیں آ رہا تھا، جعفری صاحب اس طرح محبت اور شفقت سے پیش آئے جیسے کوئی اپنے چھوٹوں سے ملتا ہے۔ ان دنوں شعر و سخن میں میرے انہماک کا یہ عالم تھا کہ مشاعرے میں سنی ہوئی اکثر نظمیں اور غزلیں مجھے زبانی یاد ہو جایا کرتی تھیں۔ جعفری صاحب نے اپنے مخصوص ترنم میں دو نظمیں سنائیں۔ "پرانی موٹر" اور "ضمیر کا گھر"۔ وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جعفری صاحب گول مٹول سے ایک معصوم بچے کی طرح بڑی سنجیدگی سے اپنے شعر ترنم سے سنا رہے تھے۔ سامعین تھے کہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ میں تو اسی وقت سید ضمیر جعفری کی مزاحیہ شاعری پر ایمان لے آیا تھا۔ اس طرح کے شعر نہ کہیں پہلے پڑھے تھے نہ سنے تھے۔ ان کی دونوں نظمیں یاد ہو گئیں۔ میں کئی دنوں تک تمام گردشوں میں ان نظموں کے اشعار گنگناتا رہا اور ہر کسی کو سناتا رہا۔

پکڑ کر بھی جاتی ہے جکڑ کر لائی جاتی ہے
وہ کہتے ہیں کہ پھر بھی اس میں موٹر پائی جاتی ہے

اور

لکڑی کے نصف بٹ میں بسیرا ہے آج کل
فدوی بشر نہیں ہے بٹیرا ہے آج کل

"فدوی بشر نہیں ہے بٹیرا ہے آج کل" اس طرح کا مصرع کسی اور شاعر نے آج تک نہیں کہا نہ کہہ سکتا ہے اس لئے کہ مزاحیہ شاعر اکثر دوسروں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ جعفری صاحب کا اسلوب خاص یہ ہے کہ وہ دوسروں پر ہنسنے کی بجائے خود اپنے آپ پر ہنستے ہیں۔ انہوں نے مزاح میں دوسروں پر نہیں خود پر ہنسنے کی طرح ڈالی ہے۔ ہمیں اپنے حال پر ہنسنا سکھایا ہے۔ اپنے آپ پر نظر ڈالنے کی روش اختیار کی ہے۔ خود احتسابی کی راہ دکھائی ہے۔ یہ ان کی عطا ہے، دوسروں پر تو سب ہنستے ہیں اپنے آپ پر ہنسنا اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ خود اپنے حال پر ہنسانا ہی دراصل خالص مزاح ہے جس پر طنز کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور اگر جعفری صاحب کسی دوسرے شخص کو اپنے مزاح کا موضوع بناتے بھی ہیں تو ان کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ جو شخص ان کے مزاح کا نشانہ بنتا ہے وہ باقی لوگوں کے مقابلے میں زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے مگر میرے ذہن میں ایسے اشعار بہت ہی کم ہیں جن میں انہوں نے اپنے علاوہ کسی دوسرے شخص کی کسی کیفیت یا ہیئت کذائی سے مزاح پیدا کیا ہو۔ اکثر یوں ہوا ہے کہ جس کیفیت سے وہ مزاح اخذ کرنا چاہتے ہیں پہلے اسے اپنے آپ پر طاری کرتے ہیں پھر اس کیفیت میں از سر تا پا شرابور اپنے آپ کو یکایک سامنے لا کر دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ دوسروں کی دل آزاری کے وہ کبھی مرتکب نہیں ہوئے۔ نہ تحریر سے نہ تقریر سے۔ نہ کسی بھرے جلسے میں نہ کسی نجی محفل میں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی کی دل آزاری کرنے کے اہل ہی نہ ہوں۔ کسی کے خلاف بات کرنا، کسی پر تنقید کرنا، حتیٰ کہ برائی کو برائی کہنا کسی کی غلطی یا زیادتی کی نشاندہی کرنا کسی پر نکتہ چینی کرنا ان کی فطرت میں ہی نہ تھا، وہ کوئی ایسی بات بھی نہیں کرتے تھے جس سے کسی کا دل دکھنے کا اندیشہ ہو۔ غائب یا حاضر میں نے ان کی زبان سے کبھی کوئی بات کسی کے خلاف نہیں سنی۔ میں نے کئی دفعہ کئی لوگوں کی کمینگی اور بدنیتی کا ذکر کر کے ان کو بھڑکانے کی کوشش کی۔ انہیں بتایا کہ فلاں شخص آپ کے خلاف یہ کارروائی کر رہا ہے مگر وہ کبھی کسی کے خلاف بات کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ بلکہ بسا اوقات ایسا ہوا کہ میں نے کسی کی برائی بیان کی وہ میری بات کاٹ کر اس کی اچھائی بیان کرنے لگ گئے۔ ایسے موقعوں پر ان کی گفتگو کا انداز کچھ اس طرح ہوتا۔ "نہیں! جمیل آپ نے غور نہیں کیا اس کے رویے کی وجہ وہ نہیں جو آپ سمجھے ہیں، اس نے دراصل کسی اور وجہ سے ایسا کیا ہو گا، اس کی کوئی مجبوری ہو گی، وہ برا آدمی نہیں۔" ضمیر جعفری صاحب نے ایسے موقعوں پر ہمیشہ مجھے مشکل میں ڈالا۔ اگر کسی کی کج روی کا کوئی ناقابل تردید اور واضح ثبوت سامنے آ جاتا تو جعفری صاحب بس اتنا کہتے "یار اس نے ایسا کیوں کیا ہے، اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اور پھر موضوع گفتگو بدل دیتے۔

سید ضمیر جعفری کے فرزند ارجمند بریگیڈیئر احتشام ضمیر نے ایک دفعہ بتایا کہ میں جب گورڈن کالج میں پڑھ رہا تھا تو ان دنوں مجھے سگریٹ نوشی کی لت پڑ گئی۔ گھر میں سگریٹ کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر ابا جان کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ صاحبزادہ صاحب سگریٹ کا شوق فرمانے لگے ہیں۔ ایک دن میں صبح سویرے کالج کیلئے نکلنے لگا تو ابو نے گولڈ لیف کی ایک ڈبی جو غالباً وہ ایوان صدر سے لائے تھے کیونکہ اس پر پریذیڈنٹ ہاؤس لکھا تھا میری طرف بڑھا دی کہ یہ لو۔ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ابو! سگریٹ کی ڈبیا میں بھلا اسے کیا کروں گا؟" وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ "اچھا تم نے اسے کچھ نہیں کرنا، پھر بھی لے جاؤ پرنسپل کو دے دینا۔" گویا جعفری صاحب اپنے بیٹے کو بھی براہ راست یہ جتانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس کی سگریٹ نوشی سے آگاہ ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ پریشان ہو جائے۔ اپنے چھوٹوں پر ہی کیا موقوف ہے محبت اور شفقت کا یہی رویہ وہ ہر ایک کے ساتھ روا

رکھتے تھے۔ وہ سراپا محبت تھے کوئی ان کی محبت کا اہل ہو یا نہ ہو ان کی محبت اور شفقت سورج کی روشنی کی طرح سب کیلئے تھی، ان کا اسلوب حیات اس مشہور مصرعے کی مجسم اور جیتی جاگتی تصویر تھا ۔

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جعفری صاحب کے چاہنے والوں نے بھی ان سے بڑی محبت کی۔ جہاں جاتے لوگ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ ان کے آگے بچھے چلے جاتے۔ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے رہے ایک طرف، عام لوگ بھی جو محض ان کی صورت سے آشنا تھے بڑے شوق اور تپاک سے ان کی طرف لپکتے۔ مجھے ان کے ساتھ کئی دفعہ سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ہر پڑاؤ پر یا دوران سفر بھی بعض اوقات ان کی پذیرائی ایسی گرمجوشی اور محبت سے کی جاتی کہ یہ صورتحال خلاف توقع نہ ہونے کے باوجود کئی دفعہ مجھے حیران کر دیتی، کسی نمائشی سیاسی لیڈر کا استقبال تو بالکل مختلف قسم کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس کی آمد کا تو پہلے سے پتہ ہوتا ہے۔ اس کے شایان شان استقبال کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ لوگ ان کو دیکھ کر ناچنا کودنا شروع کر دیتے ہیں ہم نے کئی بظاہر اور باریش سابقہ وفاقی وزیروں کو اپنے لیڈر کی کار کے سامنے بھنگڑا ڈالتے دیکھا ہے مگر یہ لیڈران کرام جب اقتدار سے باہر ہوتے ہیں تو کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ میں جعفری صاحب کا ذکر کرتے کرتے کہاں پہنچ گیا۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

جعفری صاحب کی تو بات ہی دوسری ہے جس سٹیشن یا ایئر پورٹ پر وہ اترتے تھے ان کو دیکھ کر اجنبی لوگوں کے چہرے کھل اٹھتے تھے۔ ایئر پورٹ کے اہلکار اور پورٹر تک بڑے اشتیاق سے ان کی طرف لپکتے تھے اور بڑی چاہت سے ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ اپنا حق خدمت ان سے وصول کرنے سے انکاری ہو جاتے۔ وہ جعفری صاحب سے ایسا سلوک کرتے جیسے جعفری صاحب ان کے کوئی عزیز رشتہ دار بزرگ ہوں۔ یہ سب لوگ ان کی شاعری، خاص کر ان کی مزاحیہ شاعری کی وجہ سے ان سے محبت کیا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری بیس پچیس سالوں میں تو ان کی پذیرائی روز افزوں تھی۔ لوگ ان کو سننے کیلئے اپنے گھروں میں خصوصی محفلیں سجاتے تھے۔ ویسے بھی ہر محفل میں انھیں بڑے اصرار سے مدعو کیا جاتا تھا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ جعفری صاحب شہر میں موجود ہوں اور وہاں کوئی تقریب ان کی شمولیت کے بغیر مکمل سمجھی جائے۔ تقریباً ہر روز ہی ان کا کھانا باہر ہوتا تھا۔ سید ضمیر جعفری اور ہمارے ایک دیرینہ دوست عزیز ملک صاحب کہا کرتے تھے کہ جعفری صاحب کی قسمت میں بڑے عمدہ کھانے ہیں مگر دوسروں کے گھر۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کسی تقریب میں جانے کا اصرار خود کرتے ہوں یا ان میں شرکت کیلئے کسی قسم کی کوئی کوشش کرتے ہوں لوگ خود ہی انھیں لے جاتے تھے۔ بسا اوقات تو وہ یک وقت ایک سے زیادہ تقریبات میں مدعو ہوتے۔ ان کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ کس تقریب کو ترجیح دیں۔

جعفری صاحب کے اسلوب حیات کو دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے قلم اور کاغذ کے علاوہ اور کسی چیز سے انھیں کچھ سروکار نہ تھا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے کی دھن میں وہ ہمیشہ مگن رہتے تھے۔ کسی اور چیز کی جانب ان کی توجہ صحیح معنوں میں کم ہی مبذول ہوتی تھی۔ بظاہر وہ آپ کی بات سن رہے ہوتے یا زندگی کے عام مسائل کے بارے میں آپ کے ساتھ شریک گفتگو ہوتے مگر محسوس ہوتا تھا وہ پورے انہماک سے گفتگو میں شریک نہیں ہیں۔ محض ہوں ہاں کر رہے ہیں یا آپ کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ ان کی شخصیت کی دو سطحیں تھیں۔ روزمرہ زندگی کے عام مسائل اوپر کی سطح پر ہی تیر رہے ہوتے جب کہ نچلی اور گہری سطح پر کسی مصرعے کی نوک پلک درست ہو رہی ہوتی۔ جس طرح سمندر کے اوپر جہاز اور کشتیاں ہچکولے کھا رہے ہوتے ہیں مگر گہرائی میں ایک اور ہی دنیا آباد ہوتی ہے۔ کچھ یہی حال جعفری صاحب کے ظاہر و باطن کا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ فکر شعر کے علاوہ انھیں کوئی اور فکر نہ تھی۔

بعض لوگ جو سید ضمیر جعفری کی زندگی کے حالات و واقعات سے آگاہ ہیں جانتے ہیں کہ اسلام آباد کی پہلی اینٹ رکھنے والوں میں جعفری صاحب بہ نفس نفیس شامل تھے، وہ خود فرماتے ہیں ۔

شام رخصت آ گئی اس شہر خوش اوقات سے
جس کی پہلی اینٹ رکھی میں نے اپنے ہاتھ سے

سی ڈی اے اسلام آباد کا ادارہ قائم ہوا تو جعفری صاحب فوج سے سی ڈی اے میں بطور ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز آ گئے۔ وہ کم و بیش پندرہ سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ سی ڈی اے کے چپڑاسیوں اور لوئر کلرکوں نے بھی اسلام آباد میں ایک چھوڑ کئی کئی بنگلے بنا لئے ہیں مگر جعفری صاحب نے کم و بیش 35 سال اسلام آباد میں مقیم رہنے کے باوجود اپنے لئے کوئی مکان نہیں بنایا۔ سی ڈی اے کی طرف سے انھیں پلاٹ بھی ملا۔ اس کے علاوہ فوج کی طرف سے انھیں دو تین دفعہ رہائشی پلاٹ الاٹ کئے گئے مگر جعفری صاحب کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان پلاٹوں کا کیا بنا؟ کہاں گئے؟ ان کے بیوی بچوں نے کب اور کیسے وہ پلاٹ بیچ دیئے؟ جعفری صاحب نے کبھی اس موضوع پر سوچا ہی نہیں۔ ان کی ترجیحات ہی مختلف تھیں۔ ان کی دنیا ہی الگ تھی جیسا کہ اقبال نے کہا ہے ۔

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے

جعفری صاحب بھی اپنے فکر و فن کے محل میں رہتے تھے۔ اس کے مقابلے میں اینٹ سیمنٹ اور لوہے سے بنے ہوئے مکان کی بھلا کیا حیثیت تھی جو جعفری صاحب ادھر توجہ دیتے۔ یہاں مجھے جعفری صاحب کی ایک خوبصورت نظم یاد آ رہی ہے اس نظم سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے خواب کیا تھے؟ ان کی آرزوئیں کیا تھیں؟ وہ کس دنیا میں رہتے تھے؟ ذاتی حوالے سے مستقبل کا کون سا افق ان کے مدنظر تھا؟ یہ بڑی خوبصورت اور بڑی اچھوتی نظم ہے، اسی بیاسی سال کی عمر میں شاید ہی کسی شاعر نے اس یقین، امید، اعتقاد اور رجائیت کا اظہار کیا ہو۔ مجھے تو ساری اردو شاعری میں اس طرح کی نظم کی کوئی اور مثال دکھائی نہیں دیتی۔ ۔

یہ راہگزر ہے جس کے لئے
یہ رخت سفر ہے جس کے لئے
بے تاب نظر ہے جس کے لئے
خالی میرا گھر ہے جس کے لئے

وہ شہر گلاب ابھی آگے ہے
میرا قریہ خواب ابھی آگے ہے
میں ایک وصال مسلسل ہوں
آشنا ہوں نئی فصلوں سے میں

اک عہد جوانی رکھتا ہوں
آئندہ نسلوں سے میں
میرا عہد شباب ابھی آگے ہے
میرا شہر گلاب ابھی آگے ہے

اے میرے قلم مت رک جاؤ
ایک اور کتاب ابھی آگے ہے
میرا ماضی پیچھے گاتا ہے
فردا کا رباب ابھی آگے ہے

میرا شہر گلاب ابھی آگے ہے
میرا قریہ خواب ابھی آگے ہے
میرے نام کا جام سنبھال رکھو
میری شام شراب ابھی آگے ہے

ناکردہ گناہوں سے کہ دو
میرا ان سے حساب ابھی آگے ہے
میرا شہر گلاب ابھی آگے ہے
میرا قریب خواب ابھی آگے ہے

ہمارے شاعروں کا عمومی رویہ یہی ہے کہ وہ اکثر یاد ماضی میں ہی آنسو بہاتے رہتے ہیں۔

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

یا

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

اس کے مقابلے میں جعفری صاحب جس عزم اور امید کے ساتھ ماضی کے بجائے مستقبل کے استقبال کے گیت گا رہے ہیں، اس کا جواب نہیں، ان کا ایک اور شعر سنئے۔

ملتا ہے تازہ ہر اک چہرے پہ اک منظر کے ساتھ
میں بڑھاپے کو نہ آنے دوں گا کیلنڈر کے ساتھ

میں جعفری صاحب کی سنجیدہ شاعری پر غور کرتا ہوں تو ان کی انفرادیت اور ان کی عظمت و رفعت پر حیران ہوتا ہوں۔ لوگوں نے صرف ان کی مزاحیہ شاعری پر توجہ دی۔ مشاعروں میں سامعین ان سے صرف مزاحیہ اشعار سنانے کا مطالبہ کرتے تھے۔ یہ جعفری صاحب کے ساتھ بڑی زیادتی تھی۔ آپ تصور کیجئے اگر لوگ مرزا غالب سے اس کے طنز و مزاح سے بھرے ہوئے خطوط ہی سنتے رہتے اور اس کی غزلوں کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دیتا تو یہ کتنا بڑا المیہ ہوتا۔ غالب کے دل پر کیا گزرتی۔ یہی کچھ جعفری صاحب کے ساتھ ہوا کہ وہ جو شاعر نے کہا ہے کہ۔

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

جعفری صاحب کی سنجیدہ شاعری بھی گویا ایک بند کتاب کی صورت طاق نسیاں پر دھری رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ جعفری صاحب جس طرح اپنی مزاحیہ شاعری میں منفرد اور تنہا ہیں اسی طرح اپنی سنجیدہ شاعری میں یکہ و تنہا اور بے مثال ہیں۔ وہ ذاتی طور پر اپنی سنجیدہ شاعری کو زیادہ وقیع اور بلند تر سمجھتے تھے۔ اور میں بلا خوف تردید یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ وہ مزاحیہ شاعری میں عظیم تھے لیکن اپنی سنجیدہ شاعری میں عظیم تر تھے۔ بات تقابل اور موازنے سے واضح ہوگی۔ علامہ اقبال کی مشہور نظم ہے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" اس کا بہترین ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے اس نے وقت کی پرواز کا
رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اس نے کیا
عہد طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا
جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جان ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں
اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیٔ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشم گوہر بار کے
کس کو ہو گا اب وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار
خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

اسی موضوع پر سید ضمیر جعفری صاحب کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

گو میرے بالوں پہ بھی تھی پیری کی دھوپ آئی ہوئی
سرپنچ مکھیا گاؤں کا میں چودھری چوپال کا
میں شاعر مشہور بھی ہر شہر میں چرچا مرا
کانٹے کوئی جذبات میں سو تیر محسوسات میں
افکار کا مارا ہوا دن کا تھکا ہارا ہوا
آتا تھا تیرے پاس جب اک طفل بن جاتا تھا میں
اور مامتا کے لمس سے تیری قبا کے سائے میں

تیری ردا کی چھاؤں میں تیرے مقدس پاؤں میں
جو نیند آتی تھی مجھے پھولوں کے بستر میں نہیں
ریشم کی چادر میں نہیں پریوں کے گیتوں میں نہیں
دنیا کی رتوں میں نہیں سر رکھ کے تیری گود میں
بے فکر سو جاتا تھا میں معصوم بچے کی طرح
جو کھیلتا ہو صحن میں جو دوڑتا ہو کھیت میں
جو لوٹتا ہو ریت پر ننھے گھروندوں میں لئے
وہ خواب جو دیکھے نہ تھے وہ چاند جو نکلے نہ تھے
احساس میں رستی ہوئی خورشید کی پہلی کرن
اطراف میں اڑتا ہوا خوش تتلیوں کا بھور بن
لمحے سانے روپ میں جوں دوپہر کو سر پر
دھوئیں پرندے چونچ سے اپنے پروں کو دھوپ میں
لیکن اچانک ایک دن جب تیری آنکھیں مند گئیں
جب تیری دھڑکن سو گئی جب تو مری آواز پر
بولی نہیں دھڑکی نہیں کرنوں کا دریا رک گیا
لمحوں کا پرچم جھک گیا اور ساتھ تیرے مر گیا
وہ تیرا طفل شادماں اے میری ماں اے میری ماں

آپ نے دیکھا ضمیر جعفری کا لب و لہجہ کتنا مختلف، کتنا سادہ اور اثر انگیز ہے۔ آدمی جعفری صاحب کے اشعار پڑھ کر جھومنے لگتا ہے۔ ان کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

زندگی کی دھوپ میں سب سے گھنا سایہ تو ہی
اس زمیں پر موتیوں والا سخی دریا تو ہی

اے مسلماں کی متاع اولیں و آخریں
دیں تو ہی آئیں تو ہی دنیا تو ہی عقبیٰ تو ہی

کشت امید بشر کی زرد پیاسی ریت پر
اور بادل بھی تھے لیکن ٹوٹ کر برسا تو ہی

یہ گلیاں دیکھ لیں میں نے یہ پانی پی لیا میں نے
خدایا تیرا احساں، اس گھڑی تک جی لیا میں نے

جعفری صاحب کے فکر و فن کے جائزے کیلئے تو پوری ایک کتاب درکار ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ کئی کتابیں لکھی جائیں گی۔ سنجیدہ شاعری میں ان کا مقام و مرتبہ اسی صف میں ہے جہاں میر، غالب، اقبال، فیض، راشد اور مجید امجد بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ کئی لحاظ سے اردو کے تمام شعراء میں منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً اردو شاعری میں پہلی دفعہ پاکستان کی دھرتی کا روپ رس اور باس ان کی شاعری میں اپنے پورے حسن کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ہمارے کھیت کھلیان ان کی شاعری میں صاف پہچانے جا سکتے ہیں۔ اردو کے دوسرے بڑے شاعروں کی طرح ان کی لفظیات فارسی زدہ نہیں۔ اقبال، فیض، مجید امجد، ن م، راشد حفیظ اور کئی دوسرے شعراء کی کتابوں کے نام ہی فارسی سے مستعار ہیں۔ سید ضمیر جعفری کی مجموعوں کے نام ان سے بالکل مختلف ہیں۔ بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، نقش فریادی، دست صبا، سر وادی سینا، شب رفتہ، ماورا، نغمہ زار، تلخابہ شیریں سے ضمیر جعفری کے مجموعوں کے نام کتنے مختلف ہیں۔ جزیروں کے گیت، جنگ کے رنگ، لہو ترنگ گنر شیر خان، میرے پیار کی زمین، من کے تار، کھلیان، من میلہ، یہ سب ان کی سنجیدہ نظموں کے مجموعے ہیں۔ مزاحیہ شاعری پر مشتمل پہلا مجموعہ مافی الضمیر کے نام سے چھپا۔

انگریزی مزاحیہ شاعری کا ترجمہ انہوں نے ولایتی زعفران کے نام سے پیش کیا۔ ناموں کے انتخاب سے ہی ضمیر جعفری کی شاعرانہ انفرادیت اور تخلیقی اپچ مترشح ہے۔ یہ انفرادیت اور تخلیقی اپچ ان کی شاعری میں جابجا جلوہ گر ہے۔ جس طرح نظیر اکبر آبادی کی ساری لفظیات پوری اردو شاعری کے طرز بیان اور اسلوب اظہار سے مختلف ہے۔ اسی طرح سید ضمیر جعفری کی لفظیات ان کی تراکیب ان کے لفظی پیکروں کی بنت اور تراش خراش ان کے اظہار و بیان کا رنگ روپ اردو کے باقی تمام شعراء سے مختلف ہے ان کی شاعری میں پاکستان کے شہروں اور گاؤں کی مہکار ہے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں کی مقامی بولیوں اور علاقائی زبانوں کے الفاظ اس خوبصورتی سے انہوں نے اردو میں گوندھے ہیں جس طرح اردو کی کلاسیکی شاعری میں فارسی کے الفاظ رچے بسے ہوئے ہیں۔ نہ صرف لفظیات کے اعتبار سے سید ضمیر جعفری صحیح معنوں میں پہلے بڑے پاکستانی شاعر ہیں بلکہ موضوعات کے اعتبار سے بھی وہ ایک خالص پاکستانی شاعر ہیں۔ فیض اور راشد کی طرح وہ بدیسی اور غیر ملکی موضوعات پر نہیں لکھتے۔ ان کا قلم صرف ان موضوعات پر اٹھتا ہے جو خالص پاکستانی موضوعات ہیں یا پھر کسی نہ کسی حوالے سے کسی پاکستان سے متعلق ہیں۔ مشرقی پاکستان کے سانحے پر جس طرح انہوں نے گنر شیر خان کے عنوان سے ایک طویل نظم یا مختصر مثنوی لکھی ہے کسی اور پاکستانی شاعر کو اس موضوع پر اس طرح کی درد انگیز نظم لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ پھر اس سانحے پر جعفری صاحب کا وہ نوحہ جو ایک الگ نظم کی صورت میں ہے کس قدر دل دوز ہے ۔

اے ارض وطن
تیرے دشمن ہم تیرے قاتل ہم
ہم لوگ جو اب بھی زندہ ہیں
اس جینے پر شرمندہ ہیں

یہاں پھر موازنے سے ہی بات واضح ہو گی۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر جعفری صاحب کی ایک اور نظم ہے جس کا موضوع فیض کی ایک نظم سے ملتا جلتا ہے، جعفری صاحب نے لکھا ہے ۔

شاد باد اے سانولے شاداب شہروں کے وطن
پیار گیتوں کی زمیں، سوہنے سہروں کے وطن
جو یہاں ٹوٹے تھے وہ پر ڈھونڈنے آیا ہوں میں
میں کہ ہوں من باس میں، گھر ڈھونڈنے آیا ہوں میں

چپ درختو سوچتے دھانو! مجھے آواز دو

ہم سفر صدیوں کے یارو! مجھے آواز دو
مہرباں گلیوں گھروں کو ڈھونڈنے آیا ہوں میں
راوی دل پدما کی لہریں چومنے آیا ہوں میں

اس کے مقابلے میں فیض کے اشعار کتنے بے حس اور بے رنگ ہیں ۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

جعفری صاحب صرف ان معنوں میں ہی خالص سو فیصدی پاکستانی شاعر نہیں ہیں کہ ہر طرح کے پاکستانی موضوعات ان کی اولین ترجیحات میں شامل تھے بلکہ وہ صحیح معنوں میں پاکستانی اور اسلامی اقدار کے شاعر ہیں۔ بہت سے نامور شاعروں کے برعکس ان کا کوئی شعر مخرب اخلاق نہیں نہ کہیں وہ شراب کی تعریف میں رطب للسان نظر آتے ہیں نہ اس طرح کے شعر کہہ کر جنسی بے راہ روی کی ترغیب دیتے ہیں کہ ۔

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

سید ضمیر جعفری اقبال کی طرح اعلیٰ ترین اسلامی اور انسانی اقدار کے داعی ہیں۔ اپنے وطن اور اپنی قوم کے بارے میں جتنا انہوں نے لکھا ہے اور جس محبت درد اور سوز و گداز سے انہوں نے لکھا ہے اس کی مثال کسی اور شاعر یا ادیب کے ہاں نہیں ملتی۔ بالکل اسی طرح جیسے ان کے کردار و عمل کا یہ پہلو بے مثال ہے کہ بھارتی حکومت نے انہیں دہلی بلا کر ادبی ایوارڈ دینا چاہا مگر جعفری صاحب نے دعوت نامے کے جواب میں لکھا کہ جب تک بھارت کشمیری مسلمانوں پر ظلم و ستم بند نہیں کرتا اور کشمیر کے مسئلے کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل نہیں کرتا وہ بھارت جانے یا وہاں سے ایوارڈ لینے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ کیا جعفری صاحب کے علاوہ کسی اور شاعر نے بھی ایسا رویہ اختیار کیا ہے ہمارے شاعر تو شراب کی ایک بوتل کے لالچ میں بھارت یاترا کیلئے کمر بستہ رہتے ہیں۔ یہ بات ریکارڈ پر لانے کے لائق ہے کہ اگرچہ شاعروں کی گفتگو اور ان کے کردار میں تفاوت ہوتا ہے مگر جعفری صاحب جیسے اپنے اشعار میں تھے ویسے ہی اپنے کردار میں بھی تھے۔ ان جیسی حب الوطنی اور قومی محبت کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ ان کی تصنیفات میں زبور وطن، میرے پیار کی زمین اور گز شیر خان تو ایسی شعری تخلیقات ہیں جو از اول تا آخر وطن کی محبت اور قوم کے غم کے جذبات سے لبریز ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ان کی شاعری میں جا بجا ملک و قوم کا دکھ درد اور مسلمانوں کے زوال اور پستی کا غم موجزن دکھائی دیتا ہے حتیٰ کہ مزاحیہ شاعری میں بھی یہ جھلک دیدنی ہے ۔

دریدہ دامنوں خستہ گریبانوں کی باتیں ہیں
غزل میں جتنی باتیں ہیں مسلمانوں کی باتیں ہیں

میں بتاتا ہوں زوال اہل یورپ کا علاج
اہل یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

حضرت اقبال کا شاہین تو کب کا اڑ چکا
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

کوئی نطشے کوئی رومی کوئی اقبال پیدا کر
کہ شہروں کی لڑائی ان کے میناروں میں ہوتی ہے

سنجیدہ شاعری میں جو تخلیقی اعتبار سے ان کی مزاحیہ شاعری کے مقابلے میں کسی طور کم نہیں ہے ہر جگہ ذکر ہی غم وطن کا ہے، وطن سے بے پناہ محبت کے علاوہ حضور اکرم ﷺ سے ان کی شیفتگی اور محبت عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ میر کا شعر ہے ۔

دور بیٹھا غبار میر ان سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

نعت گوئی کے ضمن میں سید ضمیر جعفری کے قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ قابل غور ہیں "حضور نبی اکرم ﷺ کی نعت ایک بے حد نازک واردات ہے، عجز کے احساس سے میری تو روح کانپ کانپ جاتی ہے۔"

سید ضمیر جعفری کی نعتوں سے کچھ اشعار پہلے نقل کئے جا چکے ہیں، اس سادگی روانی اور جذبے کے ساتھ لکھی ہوئی نعتیں اردو شاعری کے دامن میں بس چند ایک ہی ہیں۔

ایک اور امتیازی انفرادیت جو اردو ادب میں سید ضمیر جعفری کو حاصل ہے وہ ان کی نثر کا کمال ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ بڑے شاعر تھے یا بڑے نثار۔ کرنل محمد خان اور مشتاق احمد یوسفی دونوں سید ضمیر جعفری کو نثر نگاری میں اپنا پیر و مرشد مانتے ہیں۔ کرنل محمد خان کا کہنا ہے پیر و مرشد کی نثر کے مقابلے میں ہماری نثر ایسے ہے جیسے ریشم کے سامنے ٹاٹ کا ٹکڑا۔

سید ضمیر جعفری نے چراغ حسن حسرت اور حفیظ جالندھری پر جو شخصی خاکے لکھے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ انہوں نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں پر تقریباتی نوعیت کے مضامین لکھے ہیں ان میں سے کچھ مضامین کتابی چہرے کے نام سے کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ اخباری کالم نگاری کے علاوہ جہاں بھی ان کی نثر کا کوئی ٹکڑا نظر آتا ہے یوں روشن اور تر و تازہ ہے گویا اپنے خالق کے کمال فن کا آئینہ دار ہو۔ سید ضمیر جعفری نے بیسیوں کتابوں کے دیباچے اور فلیپ لکھے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے دیباچوں میں بس ایک ہی خرابی ہے کہ دیباچہ پڑھنے کے بعد کتاب بے مزہ اور پھیکی لگتی ہے جس طرح حافظ اور غالب کی غزل کے بعد کوئی اپنی غزل سنانا شروع کر دے۔

سید ضمیر جعفری صاحب کا یہ اجمالی تذکرہ اس بات کی طرف اشارہ کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا کہ سید ضمیر جعفری کی تخلیقات و تصنیفات کا کینوس جس قدر وسیع بوقلموں اور متنوع ہے اس کی مثال بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ دوسری زبانوں سے شاعری کے جو ترجمے انہوں نے اردو شعر میں کئے ہیں ان کی بے مثال قدرت بیان اور استادی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ولایتی زعفران اپنے تاثر اور حسن بیان کے لحاظ سے اصل سے بھی کہیں بڑھ کر ہے جس طرح فٹز جیرالڈ نے رباعیات عمر خیام کا جو ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے وہ سادہ و قات

بقیہ صفحہ نمبر 43 پر

جانِ محفل تھا خدا بخشے ضمیر

ڈاکٹر سید تقی عابدی

جنت مکانی، خلد آشیانی مرحوم و مغفور ضمیر جعفری کی موت تمام دنیائے اردو ادب کیلئے ایک عظیم سانحہ ہے۔ سید محمد جعفری اور دلاور فگار کے بعد جس شخصیت سے انجمن ظرافت کی شمع روشن تھی اور جسے اہل ذوق و بصیرت بابائے ظرافت کہتے تھے وہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئی۔ خود ضمیر جعفری نے کہا تھا ۔

اچھا ہے کہ اک دن مرنا ہے
مشکل کو تو آساں کرنا ہے

بے شک ان کی مشکل تو آسان ہو گئی لیکن دوست اور احباب کیلئے ان کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی ۔

مرنے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں

سید ضمیر حسین شاہ معروف بہ سید ضمیر جعفری یکم جنوری 1916ء کو ضلع جہلم کے موضع چک عبدالخالق میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جد سید عبدالخالق چار سال قبل ایران سے ملتان آئے۔ ضمیر جعفری کے پرنانا سلطان العارفین پیر سید محمد شاہ پنجابی پوٹھوہاری کے مقبول شاعر تھے۔ جن کے ابیات "من کے تار" کا اردو منظوم ترجمہ خود ضمیر جعفری نے کیا تھا۔ بقول مرحوم "میرے شعری شعور کی پہلی چنگاری پیر سید محمد شاہ کی شاعری سے پھوٹی جسے میں بچپن میں اپنی ماں سے سنا کرتا تھا"۔ ضمیر جعفری نے 1938ء میں اسلامیہ کالج سے بی اے کیا اور دوسری عالمی جنگ کے دوران فوج میں بھرتی ہوئے۔ آپ جس ہیڈ کوارٹرس سنگاپور میں مشغول کار ہوئے اس میں کرنل فیض احمد فیض، میجر چراغ حسن حسرت، کیپٹن ن م راشد، میجر آغا بابر، کرنل مسعود اور کمانڈر حسن عسکری جیسے ممتاز اہل قلم حضرات شامل تھے۔ 1949ء میں ملٹری سے استعفیٰ دے کر مختلف روزناموں کی مدیریت اختیار کی لیکن دوبارہ فوج میں شامل ہوئے اور 1965ء میں میجر کے عہدے پر ریٹائرڈ ہوئے۔ ضمیر جعفری متعدد اعزازات کے حامل رہے جن کا ذکر مضمون کے اختصار سے خارج ہے۔ 1936ء میں سر عبدالقادر نے ہمایوں گولڈ میڈل بچوں کی ایک شام کی نظم پر عطا کیا۔ 1967ء میں تمغہ قائد اعظم آپ کی حسن خدمت اور 1975ء میں صدارتی تمغہ آپ کی حسن کارکردگی پر دیا گیا۔ ضمیر جعفری ماہنامہ "چہار سو" کے مدیر اعلیٰ بھی تھے جس کے مدیر مسئول اور روح رواں جناب گلزار جاوید صاحب ہیں۔ آپ نے تقریباً پچاس کتابیں لکھیں اور آپ کا کلام پاکستان کے تمام صوبوں کے نصاب میں شامل ہے۔ مرحوم کا شمار اسلام آباد کی پہلی اینٹ رکھنے والے اشخاص میں ہوتا ہے۔ ضمیر جعفری کو بچپن ہی سے علمی، سماجی، ادبی اور شعری لگاؤ تھا چنانچہ گورنمنٹ ہائی سکول جہلم کی ساتویں، آٹھویں جماعت ہی سے شعر کہنا شروع کیا اور اپنے اسکول کے ملک الشعراء تسلیم کیے جانے لگے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں "صحیح معنوں میں ادبی اور شعری نشوونما کالج میں ہوئی جہاں میں نے باقاعدہ شاعری شروع کی لیکن کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ لینے کا خیال آیا البتہ استفادہ سب سے کیا اور اب تک کرتا ہوں"۔ ضمیر جعفری نے پہلے سنجیدہ اشعار کہے لیکن چونکہ طبیعت کا میلان طنز و مزاح کی طرف تھا تو مزاحیہ شاعری کو اپنا مرکز بنایا۔ جس میں ان کی ضمیر کی متین اور سنجیدہ آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ خود کہتے ہیں "میں تو مزاحیہ شاعری کو سنجیدہ ہی سمجھتا ہوں کیونکہ اس کی بنیاد بھی تو آنسوؤں پر ہی ہے، یہ مسکراتے ہوئے آنسو ہیں"۔ آزاد شاعری کے بارے میں ضمیر صاحب فرماتے ہیں "تازہ ہوا کے بغیر ادب بھی پودے کی طرح سوکھ جاتا ہے، آزاد شاعری نے اپنی اہمیت کو منوایا ہے اور یہ ادب کی ضروریات میں سے ہے"۔ ضمیر جعفری نہ صرف ایک مقبول شاعر، نثر نگار، کالم نویس اور بذلہ سنج شخصیت تھے بلکہ وہ ایک نئی صنف شاعری "پہنوں" کے خالق بھی ہیں۔ ایک پہنوں ملاحظہ کیجئے ۔

بعد مدت آج بنت عم تری یاد آ گئی
جیسے گھر جائے اچانک بانس کے جنگل میں آگ
جیسے مایوسی میں لب پر دفعتاً آ جائے راگ
یا کوئی مچھلی سنہری دھوپ میں لہرا گئی

قدیم شعراء میں نظیر اکبر آبادی اور غالب کے یہاں طنز و مزاح کے بہت حسین اور کامیاب نمونے ملتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص اپنے فکر و فن کی کامل حیثیت میں خالص طنز و ظرافت کا شاعر کہے جانے کا مستحق ہے تو وہ اکبر الہ آبادی ہیں چونکہ شاعری سوسائٹی میں جنم لیتی ہے اور آسمان سے نازل نہیں ہوتی۔ اس لئے ہر خطہ اور ہر دور میں یہ رحمت شکل سنجیدہ اور ظرافت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ خود ضمیر جعفری فرماتے ہیں "مزاح زمین کی چیز ہے، ظرافت آسمانوں میں نہیں ہوتی، انسان اس وقت بالغ ہوتا ہے جب پہلی بار اپنے اوپر ہنستا ہے"۔

چند طنز و مزاح کے اشعار جن میں حسن اور ظرافت بھری ہے، ملاحظہ فرمائیے ۔

تیرے کوچے میں یوں کھڑا ہوا ہوں
جیسے ہاکی کا گول کیپر ہوں

مسدس بد حالی ۔

ستارہ نظر نہ جبیں لو رہے ہیں
یہ حد ہے کہ پردہ نشین لو رہے ہیں
نہ منزل نہ جادہ نہ کوئی ارادہ
رضا کار کم یاب لیڈر زیادہ

جان محفل تھا خدا بخشے ظہیر
اب تو اک مدت سے شوہر ہو گیا

چند سنجیدہ، عشقیہ، انقلابی اور ملی اشعار ملاحظہ فرمایئے ۔

حسن ہر روپ میں کافر ہے یہ مانا لیکن
اک قیامت ہے جوانی میں بشر کی صورت

دل میں ہر وقت کوئی شکل جمالی رکھنا
اپنے گھر کا کوئی گلدان نہ خالی رکھنا

جو بھی عورت ہے خوبصورت ہے
یہ مری روح کی ضرورت ہے

بادشاہوں کو کہیں بے شک نظر آیا نہیں
کون سے رستے میں درویشوں کا گھر آیا نہیں

اس کے بال و پر کو خاک و خس کی رسوائی ملی
جو پرندہ اڑ سکا اور شاخ پہ آیا نہیں

تتلیوں کے پر پہ بھی کچھ حسرتیں تحریر تھیں
ہم کو اس املا کے پڑھنے کا ہنر آیا نہیں

چہار سو کے مدیر مسئول گلزار جاوید کیلئے کہتے ہیں ۔

اپنی خبر نہیں ہے بجز اس قدر مجھے
اک شخص تھا کہ مل نہ سکا عمر بھر مجھے

میری بیوی قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے
وہ بھی ہے آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے

میں بتاتا ہوں زوال اہل یورپ کا پلان
اہل یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

تھی ابھی لرزاں فضاؤں میں ہی بانگ اتحاد
ہو گیا مرغوں میں برپا ایک انڈے پر فساد

مٹی رخ پہ پجاری لب پر چھالے ننگے پاؤں میں
چرواہا جب لے کے گیا اپنی بھیڑیں گاؤں میں

صدیاں کچھ ایسے لمحوں کی بھیک پہ زندہ رہتی ہیں
مائیں دوڑیں مقتل کو اور کانپیں ہاتھ دعاؤں میں

آج کل جو صورت ایام ہے
یہ چراغوں کے دھوئیں کی شام ہے

یہ کس بازار میں بکنے کی خاطر آ گیا ہوں میں
جو ہر قیمت پہ گویا اپنی قیمت پا گیا ہوں میں

گمرہوں کا ہمسفر رہنا بھی اچھی بات ہے
راستے میں بے خبر رہنا بھی اچھی بات ہے

جب لفظ لبوں پہ سل جائیں زنجیر بجا پاؤں سے
سمجھو کوئی طوفان آئے گا جب پیاس اٹھے دریاؤں سے

یہ بہت کم ہے جہاں کی تیرگی کے واسطے
کوئی سورج اور یارب روشنی کے واسطے

اپنے بیٹے احتشام کے نام ۔

ہم نے گلشن میں تجھے پالا وطن کے نام پر
بارک اللہ آج دے ڈالا وطن کے نام پر

پاک لشکر کا جواں بننا مبارک ہو تجھے
اپنا پرچم تھام کر چلنا مبارک ہو تجھے

زندگی کا اس سے بڑھ کر بانکپن کوئی نہیں
تیری وردی سے مقدس پیرہن کوئی نہیں

کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

مقتول کے لہو سے گلابی ہوئی ہوا
قاتل کے پاس کچھ نہیں شمشیر کے سوا
حریت ضمیر سے جینے کے واسطے
کیا راستہ ہے اسوۂ شبیر کے سوا

رہنے کے اب اس شہر میں ڈھنگ نہیں ہیں
سفاک بہت پھرتے ہیں اور سنگ نہیں ہیں

رشتے باہم بڑھتے ہیں کم چلنے والی گلیوں میں
شہر میں جتنی بھیڑ بڑھے گی اتنی ہی تنہائی ہو گی

اپنے بیٹے اقبال کے لئے ۔

مختصر ہے یہ داستان سحر
رات آئی سحر نہیں آئی

ہم اس مضمون کو مرحوم کی نظم "معافی نامہ" پر ختم کریں گے جو انہوں نے اپنی بیگم کی محبت اور فداکاری کا اعتراف کرتے ہوئے کہی ہے۔ نظم کا آخری بند ملاحظہ کیجئے ۔

دیکھتا ہوں روز و شب
اک کھجوروں کی چٹائی پہ دعا کرتے ہوئے
آنسوؤں سے بندگی کا حق ادا کرتے ہوئے
دکھ میں سکھ کی طرح شکر خدا کرتے ہوئے

ہاتھ اس کا تھا کہ جس کو تھام کر چلتا رہا
اس کے چہرے سے مرے گھر کا دیا جلتا رہا
میرے جنگل کے سفر میں میری بستی کا دھواں
میری جاں، میرا جہاں

بازگشت ہمہ بہ سوئے اوست

◆ ◆ ◆

لقۂ ارباب ذوق کے نیویارک سے

اردو شعروادب کے علاوہ تخلیقی عمل کے عالمی رجحانات کے بارے میں ایک خوبصورت اور جامع ادبی جریدے کی ناگزیر ضرورت

ماہنامہ زاویہ

کی صورت میں پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ خوبصورت جریدہ حلقۂ اربابِ ذوق جیسے مؤخر ادبی فورم کے "احباب" میں بیش بہا اضافہ ثابت ہو گا۔

اشرف میاں، سیکرٹری، حلقۂ ارباب ذوق، نیویارک

سو گئے داستاں کہتے کہتے

جوہر میر

جناب سید ضمیر جعفری کے ادبی اور شعری مقام کا تعین ان کی زندگی میں ہی ہو چکا تھا۔ وہ بر صغیر کی ان گنی چنی شخصیات میں سے تھے جنہیں ایک عہد کا ضمیر سمجھا اور مانا جا سکتا ہے۔ وہ ادیب و شاعر کے علاوہ مؤرخ بھی تھے۔ ایسے مؤرخ جنہیں تاریخ کے ساتھ سفر کرنے کا اعزاز حاصل رہا۔ جنہیں ہم اپنی ادبی شعری اور سیاسی تاریخ میں سنگ میل کہنے میں حق بجانب ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور اپنی نجی محفلوں میں تاریخ کے بعض ایسے لمحات سے بھی ہمیں آگاہ کیا ہے جو ہمارے روایتی مؤرخین سے قلمبند نہیں ہو سکے۔ جعفری صاحب کی یہ "تاریخ نگاری" شخصیات سے منسوب واقعات اور واقعات سے متعلق شخصیات کے بارے میں ہے۔ اپنی مختلف تصانیف میں انہوں نے اپنے پڑھنے والوں کو جو آگاہی دی ہے وہ کسی اور نے نہیں دی۔ وہ اپنی ذات میں ایک ایسا انسائیکلوپیڈیا تھے جس سے کماحقہ استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ نجی محفلوں میں ان کی بیان کردہ تاریخ تو محفوظ ہی نہ کی جا سکی، سنی سنائی رہ گئی۔

جعفری صاحب سے میری اور حلقہ ارباب ذوق کے باقی احباب کی شناسائی نیویارک میں ہوئی۔ کوئی ڈھائی سال پہلے جب وہ نیویارک تشریف لائے اور کچھ عرصہ یہاں رہنے کا فیصلہ کیا تو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ نہ صرف حلقہ ارباب ذوق کے روح رواں تھے۔ ہر اجلاس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے بلکہ ہر پیر کی شام میرے غریب خانے پر بھی تشریف لاتے تھے جسے انہوں نے حجرہ میر حجرہ قصہ خوانی کا نام دیا تھا۔ ان محفلوں میں ان کی زبانی ان کی چشم دید شخصیات کے علاوہ خود ان کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت سے آگاہی ہوئی۔ رات گئے تک جدید و قدیم ادبی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ اردو ادب کے مشاہیر کے بارے میں ہمیں ان سے بہت کچھ جاننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ علامہ اقبال، قائد اعظم، مولانا حسرت موہانی، سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خان، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، اختر شیرانی، محمود شیرانی، عبدالحمید عدم، حاجی لق لق کے علاوہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ زندہ اور مرحوم مشاہیر کے تخلیقی مقام و مرتبے کے بارے میں سیر حاصل آگاہی ہوئی۔ سیاسی بحثیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ مارشل لاؤں کے حوالے سے جب ملک کو پہنچنے والے نقصان اور پاکستان کے سیاسی خلفشار پر رائے زنی ہوتی تو جواب دہ نہ ہونے کے باوجود وہ بہت خندہ پیشانی سے تنقید سنا کرتے تھے۔ وہ ہمیں قائل کیا کرتے تھے (اور ہم قائل ہو بھی جاتے تھے) کہ سب کی سب فوج اقتدار پسند نہیں، مارشل لاء پسند نہیں اس میں اکثریت پیشہ ور افراد کی ہے جو ملک کی سرحدوں کے دفاع میں یقین رکھتی ہے۔ فوجی زندگی کے ابتدائی زمانے میں ضیاء الحق ان کے ساتھ رہے تھے وہ اس کی بعض ذاتی خوبیوں کے اعتراف کے باوجود اس کے مارشل لاء اور اس کے کارناموں پر تنقید کیا کرتے تھے اور حاضرین کی تنقید سے اتفاق بھی کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی متنازع مسائل پر بحث لمبی ہو جایا کرتی تھی اس موقع پر وہ ویٹو کا حق استعمال کیا کرتے تھے اچانک اعلان کر دیتے تھے چلو بھئی ہو جائے مشاعرہ ۔۔۔!

ان کی صدارت میں منعقد ہونے والی ان شعری نشستوں میں تازہ کلام سنانے کی شرط تھی وہ خود بھی ہر پیر کی نشست کیلئے تازہ غزل لاتے تھے اور باقی سب بھی۔ ان کا کہنا تھا جتنی غزلیں انہوں نے نیویارک کی ان نشستوں کی وجہ سے لکھی ہیں اتنی پاکستان میں برسوں میں نہیں لکھیں۔ ان محفلوں کیلئے لکھی ہوئی ان کی غزلیں ہم سب کیلئے ان کی مزاح نگاری کی شہرت کے برعکس بہت ہی عوامی آہنگ کی حامل تھیں۔ وہ ہمارے اصرار پر ہی غزلیں لکھا کرتے تھے ورنہ اپنی افتاد طبع کے حوالے سے تو ملکی حالات کا خاکہ اڑانے اور طنز و مزاح کی طرف راغب رہتے تھے۔

جعفری صاحب کی شاعری کھیتوں، کھلیانوں، مزدوروں اور کسانوں کی شاعری ہے۔ وہ سیکولر سوچ اور فکر میں یقین رکھتے تھے۔ نیویارک میں کہی ہوئی ان کی غزلیں خاص طور پر ترقی پسندانہ لب و لہجے کی حامل تھیں۔ ان کے اشعار کے موضوعات کی اعتبار سے تو منفرد ہی تھے، وہ فوجی رہ چکے تھے اور فوج کے کردار اور اس کی اہمیت کے منکر نہ تھے اس کے باوجود ان کی غزل کا یہ شعر سن کر ہم سب کو حیرانی ہوئی تھی ۔

علامات امن عالم کی نہتے لوگ ہوتے ہیں
وہاں جنگیں نہیں ہوتیں جہاں لشکر نہیں ہوتا

ہم سب نے جب اس شعر کی انہیں دل کھول کر داد دی تو ہنس کر کہنے لگے تم سب نے مجھے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔

حلقہ ارباب ذوق کی نشستوں اور غریب خانے کی محفلوں کے بارے میں وہ ہمیں ثابت قدمی کے ساتھ سفر جاری رکھنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ وہ پاکستانی اخبارات کیلئے لکھے ہوئے کالموں میں نیویارک کی ادبی سرگرمیوں کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ حلقہ ارباب ذوق کے احباب کیلئے ان کی یہ محبت اور شفقت بعض حضرات کیلئے تکلیف دہ تھی لیکن ان کی چھچھوری جملے بازی کو وہ ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے۔ سید ضمیر جعفری صاحب کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، کئی نسلوں پر پھیلا ہوا تھا جو ہر عہد اور نسل کے ساتھ برابری کی سطح کا تھا۔ وہ دانائی کے تکبر سے کوسوں دور تھے۔ عاجزی اور دوستی ان کا روزگار حیات تھا۔ سچے اور کھرے انسان تھے۔ نسلی، لسانی اور مذہبی تعصبات سے بالاتر تھے۔ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دعا گو تھے۔ مزاح نگار تو وہ تھے ہی لیکن وہ مزاح گو بھی تھے۔ موقع محل کی مناسبت سے ان کے منہ سے ایسے جملے جھڑتے تھے جنہیں سن کر ہنسی ضبط کرنا مشکل ہی ہوتا تھا۔

دوستوں کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ان کی ڈھارس بندھاتے تھے۔ انھیں حوصلہ دیتے تھے اور ان کی مشکلات کے ازالے کیلئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا کرتے تھے۔ پاکستان کے کئی ادبی پرچے ان کے قلمی اور شخصی تعاون کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ ان کی پیشانی پر جعفری صاحب کا نام ہی ان کی پذیرائی کی سند سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جعفری صاحب جیسی بلند قامت شخصیت کے ادبی، شعری اور انسانی اوصاف کا احاطہ ایک مضمون میں نہیں ہو سکتا۔ نیویارک میں ان کے مداحوں کو تو انھیں جاننے اور سمجھنے کا زیادہ وقت میسر نہیں آیا۔ یہ تو ہم سب کی خوش قسمتی تھی کہ ہمیں ان کی پیری میں جوانی کی کچھ باقی رہ جانے والی راتیں میسر آ گئیں اور یہ ان کی عنایت ہی تھی ورنہ کون اپنی آخری پونجی میں کسی کو شریک کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ ان کا یہ شعر ؎

کچھ جوانی کی شبیں باقی تھیں عمر پیر میں
لوٹ کر ہم آ گئے ہیں شہر جوہر میر میں

دراصل اہل نیویارک کے ساتھ ان کے خصوصی تعلق کا ثبوت ہے۔ ان کی محبت اور شفقت کا آئینہ دار ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے سفرِ حیات کے خاتمے کا اعلان بھی ہے۔ کوئی سچا کھرا اور روشن ضمیر انسان ہی اپنے بارے میں ایسی بشارت دے سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کوئی ڈیڑھ دو سال پہلے جب انھوں نے پاکستان واپس جانے کا اعلان کیا تھا تو ہم سب اداس ہو گئے تھے۔ کسی ارادے اور کوشش کے بغیر میری ایک غزل کا مقطع یوں نازل ہوا تھا ؎

جوہر عذاب ہوں گے کڑی دھوپ کے سفر
ہوں گے نہ جب ضمیر یہاں سائباں یہاں

میرے اس شعر کے جواب ہی میں انھوں نے اپنی غزل میں یہ شعر عطا کیا تھا ؎

کشش وطن پاک لیے جاتی ہے ورنہ
رہتے ابھی جوہر ترے سنگ اور زیادہ

یہ تب کی بات ہے جب ان کے واپس آ جانے کی امید بھی تھی، یقین تھا کہ وہ کچھ عرصہ کراچی رہ کر واپس لوٹ آئیں گے مگر اب کے وہ جس سفر پر روانہ ہوئے ہیں یکطرفہ سفر ہے اور یہ احساس بہت دکھی کر دینے والا ہے کہ وہ اب کبھی واپس نہ آئیں گے۔ پتہ نہیں یہ شعر کس کا ہے لیکن اسی صورتحال کے بارے میں ہے اور بہت ہی سچا ہے ؎

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

◆ ◆ ◆

بیادِ سیدّ ضمیر جعفری

جوہر میر

وہ وطن کی جان تھا پہچان تھا
سر سے پاؤں تک وہ پاکستان تھا

برگدوں جیسا کوئی انسان تھا
اس کے سائے میں بڑا نیروان تھا

وہ جسے کھونا بہت مشکل رہا
وہ جسے پانا بڑا آسان تھا

اس کی محفل میں نہ تھا غم کا گزر
کھلکھلاتے قہقہوں کی کان تھا

بھر گیا دامن محبت سے سبھی
وہ سخی تھا اور وہ دھنوان تھا

لہلہاتے کھیت اس کی شاعری
وہ سخن ور تھا مگر دہقان تھا

محفلیں سُونی نظر آئیں نہ کیوں
اک وہی تو محفلوں کی جان تھا

اب جو روتے ہیں سبھی تو یہ کھلا
وہ سبھی کے درد کا درمان تھا

سید ضمیر جعفری

غزل

ایک دو ایکڑ زمین کے کاشتکاروں میں تھے ہم

اک جہانِ نادرہ کے پروردگاروں میں تھے ہم
اک نئی دنیا کے نو رستہ کناروں میں تھے ہم
جب جوان تھے ہم نہ جانے کن ستاروں میں تھے ہم
دامن. جیب
چاک
پریشاں روزگاروں میں تھے ہم
لیکن اے دنیا ترے
آباد کاروں میں تھے ہم
روشنی! اے روشنی! تیری گواہی کے لیے
آمروں کے سارے کالے گوشواروں میں تھے ہم
مذہب اپنا اپنا تھا، بے شک مگر یہ بھی تو تھا
مسجدوں میں مندروں میں گوردواروں میں تھے ہم
اے وطن! ترے تقدس کے سرود آرا تھے ہم
اے زمیں! تیرے سریلے آبشاروں میں تھے ہم
کچھ نہیں ہے اپنا طرزِ زندگی اس کے سوا
جس جگہ یاروں نے دی آواز یاروں میں تھے ہم
کتنی خوش بختی ہے یہ کتنا بڑا اعزاز ہے
شاعروں، صورت گروں، نغمہ نگاروں میں تھے ہم
دن مشقت کی چٹانیں توڑتے گزرا، مگر
شب شبستانوں کے ریشم گل عذاروں میں تھے ہم

کھیت تھے سرسبز جن سے - جن سے تھے آباد شہر
چند لوگوں میں نہیں - لاکھوں ہزاروں میں تھے ہم

ہم پہ گزری ہے "ہیروشیما" کی یہ جلتی صدی
برق کی زد پر اندھیرے کے حصاروں میں تھے ہم

یاد آئے گا یہ جوہر میر[1] کا تجربہ حقیر
جس کے روشن رتجگوں کے شب گزاروں میں تھے ہم

نیویارک

(۲۰ جنوری ۱۹۹۷ء

---

[1] آشوب عصر کے طاقتور ترجمان شاعر جناب جوہر میر

سید ضمیر جعفری

غزل

ایک دو ایکڑ زمیں کے کاشتکاروں میں تھے ہم
اک جہان تازہ کے پروردگاروں میں تھے ہم

اک نئی دنیا کے نورستہ کناروں میں تھے ہم
جب جواں تھے ہم نہ جانے کن ستاروں میں تھے ہم

چاک دامن تھے پریشاں روزگاروں میں تھے ہم
لیکن اے دنیا ترے آبادکاروں میں تھے ہم

روشنی! اے روشنی! تیری گواہی کیلئے
آمروں کے سارے کالے گوشواروں میں تھے ہم

مذہب اپنا اپنا تھا بے شک، مگر یہ بھی تو تھا
مسجدوں میں مندروں میں گوردواروں میں تھے ہم

اے وطن! تیرے تقدس کے سرود آراء تھے ہم
اے زمیں! تیرے سریلے آبشاروں میں تھے ہم

کچھ نہیں ہے اپنا طرزِ زندگی اس کے سوا
جس جگہ یاروں نے دی آواز، یاروں میں تھے ہم

کتنی خوش بختی ہے یہ کتنا بڑا اعزاز ہے
شاعروں، صورت گروں، نغمہ نگاروں میں تھے ہم

دن مشقت کی چٹانیں توڑتے گزرا، مگر
شب شبستانوں کے ریشم گل عذاروں میں تھے ہم

کھیت تھے سر سبز جن سے، جن سے تھے آباد شہر
چند لوگوں میں نہیں، لاکھوں ہزاروں میں تھے ہم

ہم پہ گزری ہے "ہیروشیما" کی یہ جلتی صدی
برق کی زد پر، اندھیرے کے حصاروں میں تھے ہم

یاد آئے گا یہ جوہر میر کا حجرہ ضمیر
جس کے روشن رتجگوں کے شب گزاروں میں تھے ہم

حضرت اقبالؒ سے ٹیلی فون پر بات چیت

سید ضمیر جعفری

دل کے ٹیلی فون پہ اک آسمانی کال سے
اتفاقاً ہو گئی "گل" حضرت اقبال سے
آپ نے فرمایا: "کیا ارض وطن کا حال ہے؟"
عرض کی "فی الحال تو ہڑبونگ ہے، ہڑتال ہے"
پوچھا، وہ برش جو دی تھی شہپر شاہین کو؟
عرض کی: شاہیں ہے اب امریکیوں کی "بیجن" میں
بولے "ملی اتحاد اور نظم اور جہد و یقیں؟
عرض کی: "علامہ صاحب! اتنی چیزیں ہیں نہیں
بولے: میں نے حرمت آئین کی تلقین کی
عرض کی: ہم نے اسی شے کی بڑی توہین کی
بولے: ماشاء اللہ اب افراط مال و زر میں ہے
عرض کی: ہے تو مگر بس لیڈروں کے گھر میں ہے
بولے: منتشا ہوں مسلماں نامساواتی ہوا
عرض کی: سر آپ کے بعد اور طبقاتی ہوا
بولے: صد افسوس، وہ ضرب کلیمانہ نہیں
عرض کی: مرشد ہمیں اب جنگ پہ جانا نہیں
مرد مومن، کا بھی پوچھا سبز ہے یا زرد ہے؟
عرض کی: امریکہ کے نزدیک "دہشت گرد" ہے
پوچھا، جذبہ جو جمال الدین افغانی میں تھا؟
عرض کی: کچھ تو دیکھا سندھ کے پانی میں تھا
پوچھا: کیا ہیں عالم اسلام کے شام و سحر؟
عرض کی سارا علاقہ مضطرب تا کاشغر
پوچھا: ٹھوکر میں تو ہوں گی چوٹیاں افلاک کی؟
عرض کی: اب تک تو بس اپنی قبا ہی چاک کی
منکشف کرنے ہی والے تھے وہ کچھ اسرار دیں
"گفتگو" میں دفعتاً گھس آیا اک "ایف سکسٹین"
کہہ گئے اک بات لیکن عارفانہ شان سے
کوئی انساں کم نہیں ہے دوسرے انساں سے
عرض کی: میرے لئے بھی اک پسندیدہ سخن
بولے: "تو میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن"

سید ضمیر جعفری
۲۴۴ سی گجرات لائنز
ملیر کینٹ کراچی
ٹیلی فون و فیکس: ۴۹۰۱۲۲۸

۳ر فروری ۱۹۹۷

اشرف میاں صاحب!

میں حمید جہلمی سے ملا۔ وہ آپ کو
مگر میں خود ان کو ملا ہی ہوں۔ بہرحال میں ان سے آپ
کا تذکرہ کر آیا ہوں۔ اگر آپ کو اس سلسلے میں دلچسپی ہو
تو ان سے میرے حوالے سے رابطہ کریں۔

دوبارہ [illegible] کے لئے [illegible] سے ہو آیا ہوں۔ علامہ اقبال
[illegible] یونیورسٹی نے ہمارے ساتھ ایک شام منائی۔ انتظار حسین
پر بول رہے تھے کہ فیض احمد [illegible] کے
کی [illegible] 2.0 [illegible] ہے۔ میں نے عرض کیا [illegible] بھی
آپ دیکھ رہے تھے۔ یہ تو تاریخ [illegible]
جمہوروں کی جنگ

ج

[illegible]

مشہور ہے ۔ اسی طرح محفل صبح تک جاری رہی ۔

[illegible] روز سے یہ [illegible] سیر کی ۔ وہ جاری تقریب

جب سب موجود تھے جس کے لئے ہمیں رات کو ۹ بجے وہ شہر

گزار رہے تھے تو دیر تک تقریب ہی بمشکل

[illegible] جناب شکیل احمد صاحب کی زبانی حلقے کی سرگرمیوں

کا علم ہوا ۔ یہاں کے حلقوں میں بھی ترقی کے حلقے کا

کافی چرچا ہے ۔ شوکت ہاشمی صاحب پر فیصل آباد میں

مشتاق تھے مگر تاہم تقریر نہ ہیں یہاں دن کا خرچ ہے

[illegible] (سعید) آباد میں ملے ڈاکٹر انعام الحق جاوید کو ۔

والسلام

حامد

سید ضمیر جعفری
۳۴ سی گجرات لائنز
ملیر کینٹ کراچی
۳ فروری ۱۹۹۷

اشرف میاں صاحب!

میں حمید جہلمی سے ملا۔ آپ کا کوئی خط ان کو ملا ہی نہیں۔ بہر حال میں ان سے آپ کا تذکرہ کر آیا ہوں۔ اگر آپ کو اس معاملے میں دلچسپی ہو تو ان سے میرے حوالے سے رابطہ کریں۔

دو چار دنوں کیلئے اسلام آباد سے ہو آیا ہوں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے ہمارے ساتھ ایک شام منا ڈالی۔ افتخار عارف پوچھ رہے تھے کہ حنیف انگر اور مامون ایمن کے محاربے کی گھن گرج کا کیا رنگ ہے۔

میں نے عرض کیا وہی جو آپ دیکھ آئے تھے۔ یہ تو تاریخ انگلستان جو "پھولوں کی جنگ" "War of Roses" کے نام سے مشہور ہے اور ایک طویل عرصے تک جاری رہی۔ احمد فراز سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ ہماری تقریب میں بھی موجود تھے جس کیلئے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں کہ وہ تو اپنی تقریب میں بھی مشکل سے آتے ہیں۔ شکیل کاظمی صاحب کی زبانی حلقے کی سرگرمیوں کا علم ہوا۔ وہاں کے حلقوں میں بھی آپ کے حلقے کا خاصا چرچا ہے۔ شوکت فہمی عید پر فیصل آباد میں متوقع تھے مگر کادم تحریر نہ یہاں ان کی خبر ہے اور نہ اسلام آباد میں ڈاکٹر انعام الحق جاوید کو۔

والسلام
ضمیر

سید ضمیر جعفری، محترمہ ڈان، شوکت فہمی اور جوہر میر کے ہمراہ

سید ضمیر جعفری
۳۴ سی گجرات لائنز
ملیر کینٹ کراچی
ٹیلی فون و فیکس: ۴۹۰۱۳۲۸

۳، جنوری ۱۹۹۸ء

میرے کرمفرما [illegible] صاحب و جملہ

ارباب حلقہ ارباب ذوق!

سلام محبت!!

جناب شکیل کاظمی عمرہ پر روانہ ہوتے ہوئے

تو میری زندگی میں محبتوں کا ایک نیا "ریکارڈ" قائم ہوا کہ وہ چند گھنٹوں کے لئے مجھے ملنے کراچی آ گئے۔ اور جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو وہ میرے سامنے بیٹھے ہیں اور میں بھی اس کو محسوس کر رہا ہوں کہ برادرم سید کاظمی صاحب کے "بالاصرار" میں حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں آپ کے درمیان بیٹھا ہوں۔ میرے لئے یہ چند ساعتیں بڑا سرمایہ ہیں۔ شکیل تو تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے مگر آپ سب کے چہرے میرے ذہن میں چمکتے رہیں گے۔

والسلام

آپ کا اپنا

نوٹ: حلقے کی بیٹھک میں جاوید گلزار مدیر چہار سو
کو ہمارا پیار دیجیے

سید ضمیر جعفری
34 سی گجرات لائنز
ملیر کینٹ کراچی
3 فروری 1997

پیر کاملاں جوہر میر صاحب وہ جملہ حلقہ ارباب ذوق!

سلام محبت!!

جناب شکیل کاظمی عید پر راولپنڈی آئے تو میری زندگی میں محبتوں کا ایک نیا "ریکارڈ" عطا کرنے چند گھنٹوں کے لئے مجھے ملنے کراچی آگئے۔ اور جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو وہ میرے سامنے بیٹھے ہیں اور میں بھی اس طرح محسوس کر رہا ہوں کہ "نمرا ڈوے" میں کاظمی صاحب کے "بالا حصار" میں حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں آپ کے درمیان بیٹھا ہوں۔ میرے لئے یہ چند ساعتیں بڑی سنہری ہیں۔ شکیل تو تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے مگر آپ کے چہرے میرے ذہن میں چمکتے رہیں گے۔

والسلام

آپ کا اپنا
ضمیر

نزہت صدیقی سے کہیں وہ جاوید گلزار مدیر چہار سو کو مواد بھجوائیں۔

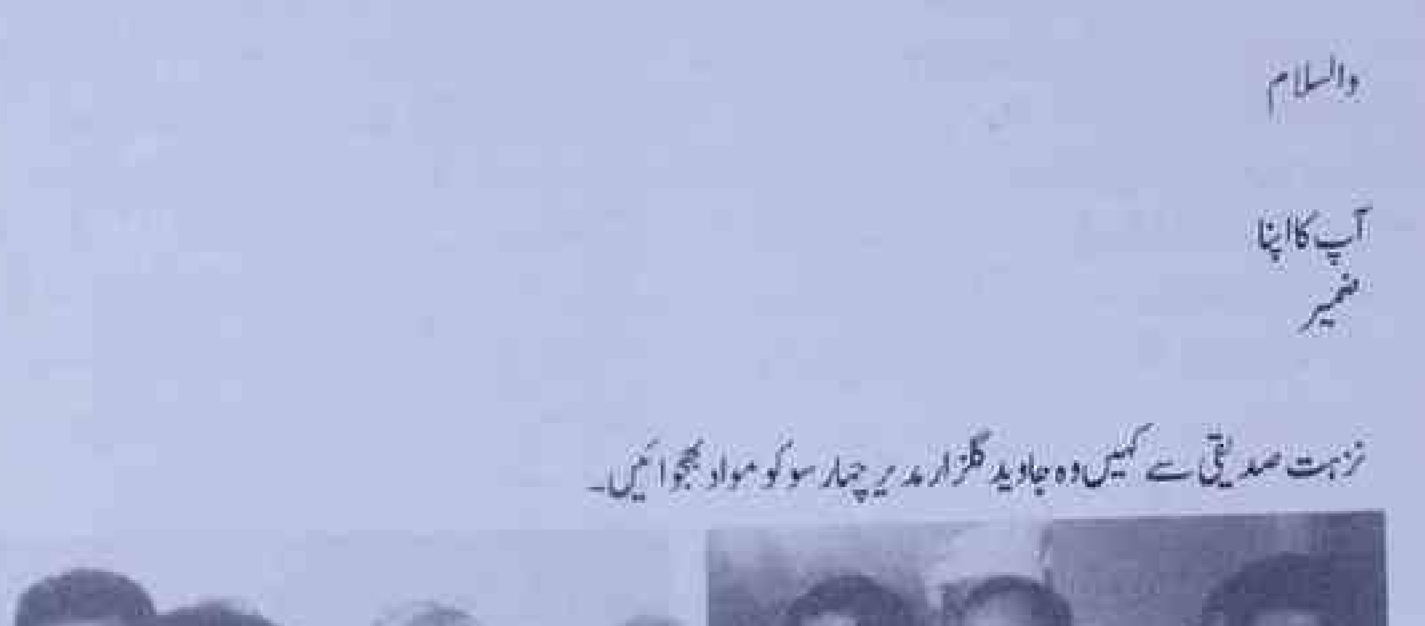

جعفری صاحب احباب کے ساتھ

آغا جان امجد حسین جی، دعائیں

"یک شہر آرزو" کا نسخہ (بلکہ نسخہ شفا) بھیجنے اور اس کے ساتھ اتنا میٹھا خط لکھنے کا یک صد ہزار شکریہ بھی ادا کروں تو کم ہو گا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے، آپ نے تو ہمیں خوشحال کر دیا۔

جوہر میر صاحب اپنے خطوط میں (جو اس کتاب میں شامل ہیں) آپ کو آغا جی، شاہ صاحب، سید صاحب، زیدی صاحب کے القاب سے یاد کرتے ہیں، ہم آپ کو آغا جان کہیں گے، تو آغا جان!

جب سے "یک شہر آرزو" ملی (بلکہ ایک پٹھان کی تصنیف کے ناتے سے) "ملا" ہے، اس نے مجھے کوئی اور کام نہیں کرنے دیا، نیویارک میں "میر خانہ" یعنی جوہر میر کا گھر ہمارے لئے "پیر خانہ" بن گیا ہے کہ ہر "پیر" کی رات ان کے ہاں (جسے ہم "حجرہ قصہ خوانی" بھی کہتے ہیں۔ چند درویشوں کا رتجگا رہتا ہے، اس محفل میں بڑے سیاستدان، دانشور اور مفکر زیر بحث رہتے ہیں، ایک سے ایک اہم قومی مسئلے پر گفتگو ہوتی ہے، مگر گذشتہ "پیر" کو "یک شہر آرزو" کے سوا کوئی مسئلہ یا شخص "حجرہ قصہ خوانی" میں داخل نہ ہو سکا، نیویارک میں ڈاکٹروں کے کنونشن میں آپ کے شہ پارے نے ہمیں چونکایا تو تھا جس کا ذکر ہم نے روزنامہ "خبریں" لاہور میں اپنے کالم میں بھی کیا، مگر یہ اندازہ اب کتاب سے ہوا کہ آپ "کٹ پیس" Cut Piece ہی نہیں بلکہ "تھان کے تھان" ایسے شوخ و شنگ رنگ کے نکالنے پر قادر ہیں، ایسی دلچسپ کتاب کو ہم ترسے ہوئے تھے، اس کتاب میں تو کئی کتابیں ہیں، یہ تو گویا آپ نے کتابوں کی "ماں" لکھ دی ہے۔ ایک ہی دیگ میں کئی ذائقوں والی "نہاری" پکا ڈالی، جوہر میر نے آپ کی انگلی چھوڑی تو پروفیسر ظہور اعوان نے تھام لی، اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر روپ کے سندر رکھ، کتاب نے نہ مجھے کوئی کام کرنے دیا نہ پشاور سے نکلنے دیا، جس طرح محمود غزنوی کے ہندوستان پر سترہ حملوں میں سومنات تک غزنی اس کے ساتھ رہا، اسی طرح آپ جہاں بھی ہوں پشاور آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ آپ کو پشاور نے "ہیرا" تو آپ نے پشاور کی مٹی کے ذرے ذرے کو "موتی" بنا دیا۔ سچ کہتا ہوں کہ کتاب کا دیباچہ پڑھنے کے بعد جب میں باہر نکلا تو "نیویارک" مجھے پشاور سے چھوٹا بلکہ "ہیچ" معلوم ہونے لگا۔ شہر صرف دیواروں کو نہیں، دیواروں کے پیچھے اس کلچر کو کہتے ہیں، جو گھروں کے اندر ہوتا ہے۔ شہر دیواروں کا سایہ نہیں، دیواروں کی چھاؤں ہوتا ہے۔ نیویارک کی دیواروں کے آگے جو کچھ بھی ہو، پیچھے کچھ بھی نہیں ہے۔ نپولین قد میں اپنے بہت سے معاصر جرنیلوں سے چھوٹا تھا مگر کارکردگی میں سب سے عظیم تھا۔ پشاور کی گلیوں میں تاریخ انسانی کی کئی صدیاں "جھاڑو" دیتی رہی ہیں، وسطی ایشیا سے آنے والے قافلوں کے لوگ اپنی سوغاتیں اسی شہر کے بازاروں میں اتارتے رہے، میں تو کہتا ہوں اگر درہ خیبر نہ ہوتا تو پاکستان بھی شاید معرض وجود میں نہ آتا۔ آپ نے اس شہر کی کہانی اس محبت اور ہنر مندی سے بیان کی ہے کہ اینٹیں بولنے لگی ہیں۔ ڈاکٹر امجد لکھتے رہو کہ تمہارے قلم سے درہ خیبر سے آنے والی تازہ اور طاقتور ہوا آ رہی ہے۔ اپنی ہندکو کی گلابی پیوند کاری سے آپ اردو کو ایک نئی مٹھاس دے رہے ہیں، مٹھاس کے علاوہ "اپنائیت" کی چاندنی بھی۔ یہ درخواست بھی کروں گا کہ مزاح جم کر لکھیں، مجھے آپ کے اندر ایک دوسرا شفیق الرحمان دکھائی دے رہا ہے۔

اس کتاب میں میری محویت کا یہ عالم رہا کہ جب کسی نے کچھ خلل ڈالنا چاہا، ہم نے اپنا یہ شعر گنگنا دیا۔

موت سے کہ دو ابھی بیرون در ٹھہری رہے
زندگی کی محفل زیبا ہے میرے سامنے

ایک مرتبہ تو جب بیوی چائے کی پیالی لے کر آئیں تو میں نے انہیں بھی یہ شعر سنا دیا، مگر شکر ہے کہ وہ بھاگوان اتنی اردو سمجھتی ہی نہیں۔ آپ جتنے بڑے دوا دارو والے "چارہ گر" ہیں، اتنے ہی منفرد ادب کے "شانہ گر" بھی ہیں، عارضہ دل کے معالج کی حیثیت سے ماشاءاللہ آپ کی بڑی شہرت ہے مگر آپ تو دلوں کے فاتح بھی ہیں۔ عارضہ دل کے حوالے سے اپنی ایک چھوٹی سی نظم نقل کرنے کو دل چاہا کہ یہ ہم نے CMH راولپنڈی کے شاعر سرجن (اور جنرل) محمود الحسن کے میز پر لیٹے لیٹے ذہن میں کہی تھی۔

دل و دستک
اے مرے دل
اے مرے دکھ محرم و سکھ آشنا
تو نے آخر "دستک آخر شبی" دے دی مجھے
میری کتنی خوبصورت خود فراموشی کے بعد
آج پہلی وارننگ دے دی مجھے
لیکن اس دنیا کی ناہموار بازی گاہ میں
کھیلنے کو کس قدر اچھی "انگ" دے دی مجھے
ہمدم دیرینہ تیرا شکریہ!

نیویارک سے جا نہیں پا رہے، سامان اپریل کا بندھا رکھا ہے، سچ پوچھئے تو جوہر میر کی محبت نکلنے نہیں دے رہی، اگلے روز ایک غزل میں بے ساختہ یہ شعر بھی ہو گئے۔

نہیں نیویارک سے جانے پاتے
بار ہا کھل گیا باندھا ہوا رخت
نذرِ شوکت کے ہوا جو لائی
"حجرہ میر" میں بھیگا ہے اگست
اے مری عمرِ رواں آہستہ
پھر کہاں ایسے محبوں سے نشست

یہ جس شوکت کا ذکر شعر میں آیا ہے جوہر میر کا ایک "بالکا" ہے، جیسا شیفتہ، میرزا غالب کا تھا، یہ نوجوان بہت نئے لہجے کی نہایت طرحدار غزل کہہ رہا ہے۔ "حجرہ و قصہ خوانی" کے "نورتنوں" میں یاسمین مراد آبادی، اشرف میاں، تنویر شاہ، حمید مشتاق، ڈاکٹر شفیق، واصف حسین واصف، (گجراتی شاعر) گریش ویاس، روشن عزیز، راشد مراد، ہر کسی کا تذکرہ کرنے کو جی چاہتا تھا کہ ہر ایک اپنے اپنے رنگ کا دھنی اور غنی، مجذوب اور ملنگ ہے۔ مگر طوالت کے خوف سے نہیں کر رہا۔ "حجرہ و قصہ خوانی" کے حوالے سے یہ کہنے کہ نہیں نیویارک سے دراصل پشاور ہی نہیں نکلنے دیتا۔ جوہر میر کی محبت بھی پٹھانوں والی ہے اور میزبانی بھی۔ اور یہ دونوں چیزیں ایک عام آدمی کو مار رکھتی ہیں۔ جوہر میر جتنا باکمال شاعر ہے اتنا ہی "ذائقہ طراز" باورچی ہے۔ ان کی دریائی بریانیوں کے قیمے کی "رانی" ہے۔ پھر پٹھانوں کی طرح وہ اتنا خود کھا کر خوش نہیں ہوتے جتنا دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے ہیں۔
میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ نیویارک میں (جہاں کوئی چیز نہیں ملتی) مجھے جوہر میر مل گئے، ہم ان کے "نام آشنا" تو تھے مگر ادب میں ان کے کام اور زندگی میں ان کے "اشرف" سے پوری طرح آشنا نہ تھا۔ کیونکہ ہم "کھیل" میں رہے اور وہ "جیل" میں رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وطنِ عزیز میں صحیح جمہوری آزادی کیلئے جتنی صعوبتیں اس شخص نے اٹھائی ہیں، ہمارے کئی نامی گرامی انقلابی جو اقتدار کی کرسیوں اور اس کی لوٹ اور لذت سے بھی بہرہ ور ہوئے وہ دکھ کی ایسی طویل اور کٹھن رات کے حاشیے سے بھی نہیں گزرے۔ شاعروں میں ہم "[illegible]" کے قائل نہیں۔ ہمارے نزدیک ہر سچا ادیب و شاعر فطرتاً "ترقی پسند" ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "حریتِ فکر" کے حوالے سے اردو کی عصری شاعری میں جوہر میر کی آواز ان چند آوازوں میں شامل ایک جداگانہ آہنگ کی آواز ہے جو اپنی طاقت و تاثیر سے ایک نئی زندگی کے ستاروں کی راہیں مقرر کر رہی ہے۔ چند روز پہلے نیویارک کے "حلقہ اربابِ ذوق" کی ایک نشست میں ان کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا نیویارک میں آزادی کے دو مجسمے ہیں، ایک دو دھات کا مجسمہ جو ہاتھ میں مشعلِ آزادی بلند کئے سمندر کنارے کھڑا ہے اور ساری دنیا اس کو Statue of Liberty کے نام سے جانتی ہے اور ایک وہ جو سانس لیتا زندہ Statue of Liberty ہے جس کا نام جوہر میر ہے مگر جس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔
میں معذرت خواہ ہوں کہ خط بہت طویل ہو گیا، مجھے اپنی فرصت میں آپ کی مصروفیت کا خیال ہی نہ رہا، مگر آغا جان بعض انسان بھی تو شہرِ آرزو ہوتے ہیں اور جوہر میر بھی ایک ایسا ہی شہر ہے۔

والسلام
آپ کا پاپا
سید ضمیر جعفری
نیویارک، یکم ستمبر ۱۹۹۷ء

بقیہ: ضمیر جعفری مافی الضمیر کے آئینے میں

کے ہاں قہقہے کا ایک وقتی شعلہ نہیں ہے بلکہ ان کی خاکستر میں ایسی چنگاری پوشیدہ ہے جو دیر تک جلتی اور جلاتی رہتی ہے۔ اشعار میں بھرپور شعریت ہے اور غزلیہ اشعار کی طرح گہری معنویت ہے۔ جناب ضمیر جعفری صاحب کے طنز و مزاح پر ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ ان کی عظمت کے قائل ہوتے جائیں گے اور اردو ادب کی تاریخ میں ان کے منفرد مقام کا تعین ہو گا۔

◆ ◆ ◆

بقیہ: بیاد سید ضمیر جعفری

اپنے تاثر اور حسن کے لحاظ سے اصل سے کہیں بڑھ کر ہے۔
سید ضمیر جعفری نے پاکستانی ادب کو کتنا وقیع اور باثروت کر دیا ہے، اس کے دامن کو ہمیشہ شاداب اور تر و تازہ رہنے والے کتنے رنگا رنگ پھولوں سے بھر دیا ہے، اس کا احاطہ اور جائزہ تو اب اہلِ نقد و نظر پر گویا ایک قرض ہے۔ بقول سید ضمیر جعفری ۔

ہر نظر بس اپنی اپنی روشنی تک جا سکی
ہر کسی نے اپنے اپنے ظرف تک پایا مجھے

◆ ◆ ◆

سید ضمیر جعفری راکفیلر سنٹر میں

WHITE WINGS
CONSULTING &
TRAINING INC.

WHITE WINGS

CONSULTING & TRAINING INC.

ORACLE DBA
- * Oracle Architecture
- * Oracle RDBMS
- * Backup & Recovery

Windows NT/MCSE
- * Windows NT 4.0
- * Windows NT Server
- * TCP / IP

SERVER PROG.
- * Oracle 8.0
- * Developer 2000
- * Visual Basic 6.0

MS OFFICE 2000
- * Introduction to Com.
- * DOS 7 Win 98/2000
- * Word, Excel, P-Point

Quality Assurance
- * Win Runner
- * Load Runner
- * SQA Robot

INTERNET / WEB
- * C ++ Programming
- * VB Script, ASP
- * Java Programming

NO PRIOR KNOWLEDGE REQUIRED

100 % ASSISTANCE IN JOB PLACEMENT

41-44 MAIN STREET, FLUSHING NY 11355

TEL:(718)359-1222 FAX:(718)359-3223

Website: www.computraining.net Email:k.tahir@worldnet.att.net

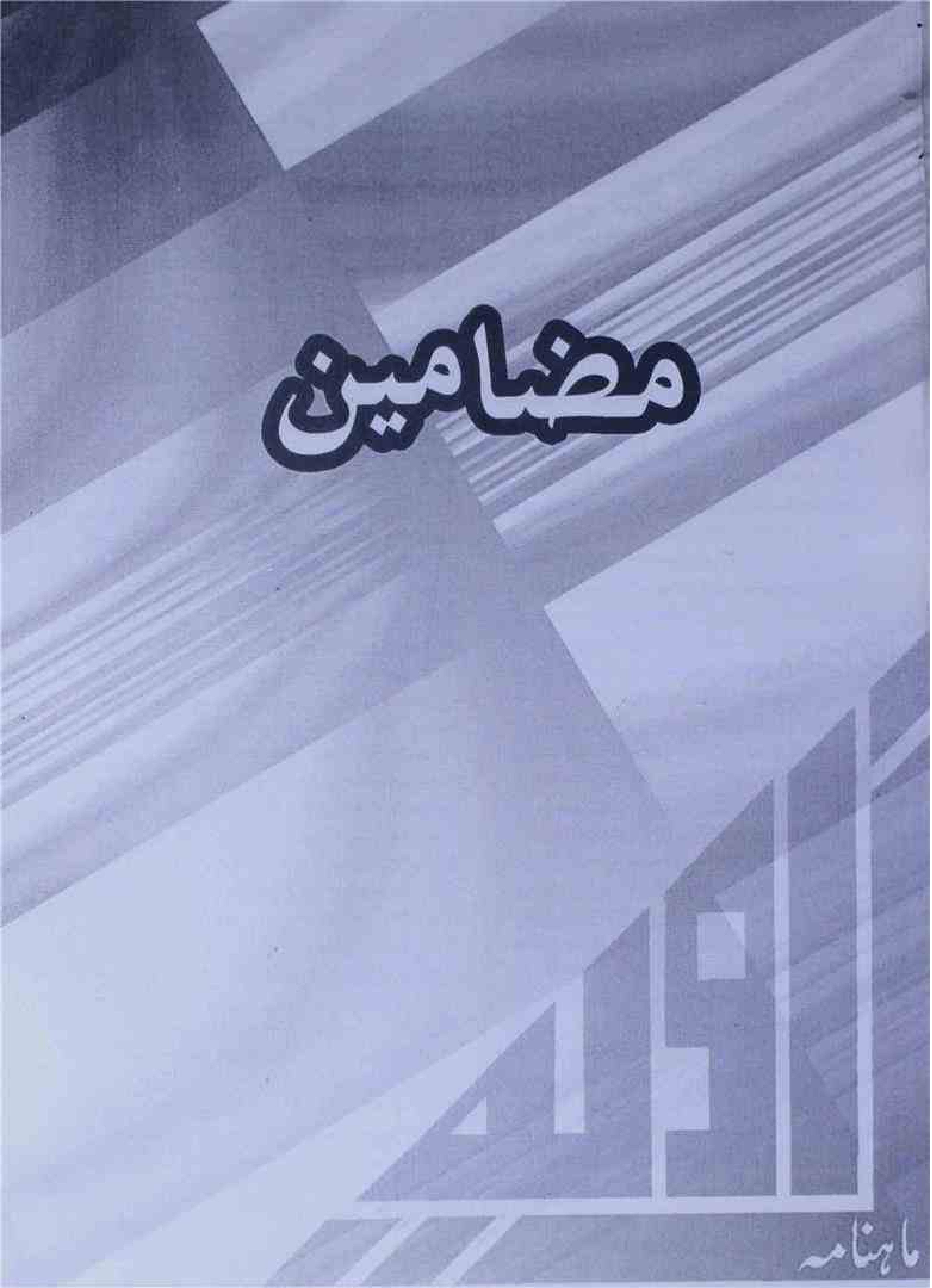

مضامین

ماہنامہ

چیستان اور پہیلیوں کی شاعری (ایک تحقیقی جائزہ)

شہاب کاظمی ایم اے (اردو ادب)

چیستان، پہیلیاں اور بجھارتیں ہم سب کیلئے اگرچہ کوئی نئی چیز نہیں مگر زیر نظر اوراق میں اس پر شاعری کے حوالے سے ذرا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ لطیفوں کی طرح پہیلیاں اور بجھارتیں ہمیشہ سے ہر عمر کے افراد کیلئے ایک گونہ دلچسپی اور دلکشی کا باعث رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ پہیلیاں ایک خیال کے تحت لڑکے بالوں کیلئے حاضر دماغی، ذہنی جلا اور پرورش و پرداخت کیلئے اسلاف نے برائے ذہنی ورزش اختراع کیں۔ ہمیں اس بات سے خاصا اتفاق ہے مگر اس استثنا کے ساتھ کہ یہ لڑکے بالوں کیلئے اختراع کی گئیں، ہم کلی طور سے متفق نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ جیسا آپ آئندہ اوراق میں خود ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہ پہیلیاں بڑے بڑے اعلیٰ دماغوں کیلئے بھی ذہنی ورزش کا کام دیتی رہی ہیں۔ بچوں کیلئے ہو سکتا ہے کہ ان کا کردار کچھ زیادہ اہم رہا ہو، نفسیاتی طور پر بچے ذہنی تربیت کی طرف عموماً ازخود رجوع نہیں ہوتا چاہتے۔ خصوصاً اس وقت جب ان کے کھیل کود کا وقت ہو۔ اس ذیل میں یہ چھوٹا سا واقعہ نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، کہتے ہیں کسی رئیس کا بچہ پڑھنے لکھنے کی طرف مائل نہ ہوتا تھا۔ سکول کے اساتذہ کی ناکامی سے تنگ آکر اس رئیس نے ایک ماہر نفسیات معلم سے رجوع کیا۔ معلم نے ساری روداد سن کر یہ بیڑا اٹھالیا کہ اس بچے کو راہ راست پر لے آئیں گے۔ مامور ہونے کے بعد وہ ایک دن تو معلم نے بچے کو صرف اپنے آپ سے مانوس اور اس کی عادات و اطوار، پسند ناپسند معلوم کرنے میں صرف کئے، اس دوران معلم نے محسوس کیا کہ بچہ ٹافیوں کی طرف خصوصی رغبت رکھتا ہے، گویا ٹافیاں بچے کی کمزوری ہیں، اگلے دن جب وہ تشریف لائے تو انہوں نے جیب سے بہت سی ٹافیاں نکال کر میز پر ڈھیر کر دیں۔ بچہ بہت خوش ہوا، معلم نے بچے کو ایک ٹافی دے کر پوچھا ہم نے تمہیں کتنی ٹافیاں دیں؟ بچے نے کہا ایک، معلم نے دو اور ٹافیاں دے کر پوچھا اب بتاؤ ہم نے تمہیں کتنی ٹافیاں دیں؟ بچے نے کہا تین۔ استاد صاحب جو سوچ رہے تھے کہ بچہ شاید ڈگر پر آرہا ہے، تین اور ٹافیاں دے کر بولے یہ بتاؤ اب تمہارے پاس کل کتنی ٹافیاں ہو گئیں، بچے نے انگلیوں پر گن کر بتایا، کل چھ ٹافیاں ہو گئیں۔ پھر یکایک اس نے سب ٹافیاں غصے سے زمین پر دے ماریں اور کہنے لگا "جناب میں بے وقوف نہیں ہوں، آپ مجھے حساب سکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

یہ صورتحال تو یقیناً نادر بھی ہے اور کسی حد تک ناقابل یقین بھی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت اور ذہنی ارتقا کیلئے آج دنیا بھر کی حکومتوں نے پوری پوری مشینری تعینات کی ہوئی ہے جو لاکھوں کروڑوں کی لاگت سے ایسی کتابیں، کہانیاں، کھلونے اور دیگر دلچسپی کے سامان تیار کرنے میں لگی ہوئی ہے جن سے بچوں میں سیکھنے سمجھنے کا جذبہ اجاگر ہو۔ آج اس ترقی یافتہ دور سے بہت پہلے بھی لوگ یقیناً اس ضرورت سے واقف تھے مگر ان کے وسائل مختلف، محدود اور سوچ جداگانہ تھی۔ وقت کے کارآمد مصرف کیلئے شاید پہیلیوں سے کام لیا گیا ہوگا، ویسے سچ تو نہیں جیسا کہ اس قصہ میں بیان کیا گیا ہے مگر وہ بچے جو اپنی ذہانت کی اہمیت سے واقف تھے انہوں نے پہیلیوں کی طرف خاصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ بچوں اور بڑوں میں فرق یہ تھا کہ بچوں کی پہیلیاں اور سوالوں کے معیار مختلف تھے۔ پہیلیوں اور بجھارتوں کے حل کرنے پر تحسین و آفرین، بزرگوں کی خصوصی توجہ کا حصول، مراعات، نقد اور جیب خرچ میں اضافہ، کھلونوں، اشیاء کے مطالبات کے حصول میں ممد و معاون ہونا، سب ہمارے آپ کے مشاہدے کی باتیں ہیں۔ بچوں کے علاوہ لڑکے بالوں اور نوجوانوں کے پنڈال میں بھی پہیلیاں اور بجھارتیں خاصی مقبول رہیں اور یہی نہیں بعض اوقات کسی نہ کسی طرح یہ ان کے رومانس میں بھی خاصی اثر انگیز ہوتی تھیں۔

ہماری کہانیاں ایسے بہت سے قصوں سے بھری پڑی ہیں جن میں ہمت مردانہ اور ذہانت کی آزمائش پر بہت سے معاشروں میں علی الخصوص اعلیٰ مرتبوں کی خواتین کی شادیاں کی جاتی رہی ہیں۔ بہت دور جانے کی ضرورت نہیں منیر شامی اور حسن بانو کے سات سوالات حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل میں تو ہم سب نے پڑھے ہی ہوں گے۔ اگرچہ یہ واقعہ بھی حقیقت پر مبنی نہیں مگر سماجی افکار اور رواجوں کا پتہ ضرور دیتا ہے۔

پہیلیوں کے ضمن میں دستور ہے کہ جب جواب نہ بن پڑے تو ہار مان کر پوچھنے والے سے پوچھ لیا جائے۔ ہار ماننا بہت سے لوگوں کی انا کو مجروح کرتا ہے۔ اس لئے جو ہار ماننے کیلئے تیار نہ ہوں اس کا جذبہ تجسس اسے سعی و جدوجہد پر اکساتا ہے اور یہ اشتعال اسے فروغ علم کے دروازے تک لے آتا ہے۔

تاریخ ادب کے اوراق بتاتے ہیں کہ شاعری کے رواج سے پہلے پہیلیاں خالی نثر میں ہوتی تھیں جن کا سفر ایک جگہ سے دوسری جگہ ذرا مشکل اور مشتبہ ہو جاتا اس لئے کہ نثر کا یاد رکھنا شعر کے یاد رکھنے کے مقابلے ذرا مشکل کام ہے۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ لوگوں کو ہزاروں نہیں تو سینکڑوں اشعار زبانی یاد ہیں جب کہ ان لوگوں کو پڑھی ہوئی نثر نقل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ شاعری کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ پہیلیوں کے ابلاغ کیلئے شعراء نے پہیلیوں کو شعری لباس عطا کیا۔ اگرچہ اس کے ساتھ نثری پہیلیاں بھی سفر پذیر رہیں مگر جو شہرت اور توجہ شعری پہیلیوں نے حاصل کی وہ نثری پہیلیوں کو نصیب نہ ہو سکی۔ (جو احباب یہ مضمون پڑھ رہے ہیں وہ اگر اپنی یادداشت کو کرید یں تو ان کو جو پہیلیاں یاد ہیں ان میں سے بیشتر شعری پہیلیاں ہوں گی)

مدبر اور ذہین شعراء نے پہیلیوں میں حسب استطاعت شعری صنعتوں کو داخل کیا جن کا ذکر آگے آئے گا۔ حسن بانو کے سوالات کے برعکس پہیلیوں میں اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ بوجھنے والے کو پہیلی کی عبارت کے اندر ایسے اشارے فراہم کر دیئے جائیں جن کے سہارے اس کا ذہن حل کی طرف متوجہ ہو سکے، مبہم اشاروں اور گنجلک پہیلی کی صورت

میں بوجھنے والے کو بجھانے والے سے اتا پتہ یعنی Clue پوچھنے کی اجازت ہوتی ہے۔ مثلاً جس چیز کے بارے میں پوچھا گیا ہے کیا وہ کھانے میں ہے کہ پینے میں، علی ہذا القیاس، کسوٹی کے ٹی وی پروگرام میں تو بیس سوالوں کی حد کا تعین ہم سب کو یاد ہوگا، مگر پہیلیوں میں ایک سے زیادہ سوال کی گنجائش نہیں مانی گئی۔ اگر بوجھ بجھانے والا بتائے کہ یہ چیز کھانے میں آتی ہے تو بوجھنے والے کیلئے آسان ہو جاتا ہے کہ دوسری چیزوں سے صرف نظر کر کے پہیلی میں موجود اشاروں کی مدد سے صرف کھانے والی اشیاء کی تلاش کرے جو پہیلی کا جواب ہو۔

پہیلیاں اور بجھارتیں تشکیل دینے والوں نے صرف پہیلیوں پر اکتفا نہیں کیا، پہیلیوں کے بعد "مکرنیاں" یا "کہہ مکرنیاں" لکھیں، جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس قسم کی پہیلی میں یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ پہیلی کی عبارت میں پہیلی کا حل بھی پوشیدہ ہو، کہ مکرنیوں میں بوجھنے والے کو کسی سوال کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ طباع اور سریع الذہن لوگوں نے کہہ مکرنیوں پر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایسی پہیلیاں لکھیں جن کو "دو سخنے" کا نام دیا گیا۔ نام کی رعایت سے دو سخنوں میں یہ اہتمام ہوتا ہے کہ سوال یا پہیلیاں تو دو (الگ الگ) ہوتی ہیں مگر دونوں کا جواب ایک ہوتا ہے جس کی مثالیں آگے پیش کی جائیں گی۔

پہیلیاں اگر جواب کو علامت نہ کرتی ہوں تو وہ پہیلیوں کے زمرے سے خارج تصور کی جاتی ہیں (یہ ذکر بھی اپنے مقام پر آئے گا) جیسے جیسے شاعری ترقی کرتی گئی پہیلیوں کی زبان صاف سے صاف تر ہوتی گئی، پہیلیاں انگریزی زبان میں Riddle یا Enigma، فارسی میں چیستان، عربی میں معمہ اور ہماری اپنی زبان میں انہیں پہیلی یا بجھارت کہتے ہیں۔ یہ بات ہم سب کیلئے باعث مسرت ہے کہ اردو داں طبقہ تقریباً سارے نام استعمال کرتا ہے جب کہ دوسری زبان بولنے والے صرف اپنے ہاں کے مروجہ نام ہی تک محدود رہتے ہیں۔

پہیلیاں لکھنے والے لوگ اس قدر زیرک اور قوی مشاہدے کے حامل افراد ہوتے ہیں کہ اکثر بوجھنے والا وافر اشاروں کی موجودگی کے باوجود مغالطے میں پڑ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پہیلی کا جواب اس قدر واضح، درست اور شفاف ہوتا ہے کہ بوجھنے والا جواب سے مکمل طور پر مطمئن ہو جائے۔

اس تفصیلی تمہید کے بعد اب آیئے ہم آپ کو اس شعری چیستان کی سیر کرواتے ہیں لیکن اس سے پہلے ایک نثری پہیلی بجھاتے ہیں۔

پہیلی: میں گئی تھی لینے وہ دینے لگی، اگر وہ نہ دیتی تو میں لے آتی۔

قبل اس کے کہ ہم اس پہیلی پر گفتگو کریں شاعری کی ایک صنعت جسے "صنعت ایہام" کے نام سے جانا جاتا ہے کی تعریف کرتے چلتے ہیں جو آگے چل کر قارئین کیلئے لطف مضمون کو زیادہ لطیف بنانے میں مدد دے گا، شعر کی زبان میں "صنعت ایہام" اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں شاعر اپنے شعر میں ایسے الفاظ یا فقرہ استعمال کرتا ہے جس کے ایک سے زیادہ مفہوم ہوں اور شعر میں وہ سامنے کے معنی کی جائے یعنی حقیقی معنوں کی جائے مجازی معنی لے رہا ہو اور ہم آپ کو مغالطہ ہو رہا ہو، شاید یہ بات اس مثال سے صاف ہو جائے :-

مر جائے ایک دم میں لہو تھوک کر رقیب
منہ میں ہمارے منہ سے جو اک بار پان لے

ایہام کے بارے میں دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاعر گویا قاری کے ذہن کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہے اس کے جذبہ تجسس کو ابھارتا ہے کہ وہ شعر پڑھ کر سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ بظاہر شعر جو معنی دے رہا ہے وہ شعر کے اعتبار سے ٹھیک نہیں معلوم دیتے۔ نتیجتاً وہ لفظوں کے مطلوبہ معنی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس صنعت میں ظاہری معنی جس قدر مغالطہ خیز ہوں گے یہ صنعت اسی قدر کامیاب قرار پائے گی۔ اب آیئے شعر کی طرف بظاہر "منہ میں ہمارے منہ سے" کے الفاظ مبتذل نظر آتے ہیں اور قاری کا ذہن فوری طور پر اسی (مبتذل معنوں) کی طرف جاتا ہے مگر غور کریں تو ہم پر کھلتا ہے کہ "ہمارے منہ سے" کے ایک اور معنی بھی ہیں، جو شاعر کہہ رہا ہے وہ ہے، ہماری خاطر سے، ہمارے لحاظ سے، ہمارا دل رکھنے کیلئے، اور اب آپ دیکھیں کہ پہیلی اختراع کرنے والے نے نثر میں یہی صنعت استعمال کی ہے، ذہن کو پوری طرح الجھایا گیا ہے، اگر کوئی کسی سے کوئی چیز مانگنے جائے تو مانگنے کا ردعمل "دینا" ہے تو پھر "دیتے" ہوئے نہ لا سکنے کا کیا معمہ ہوا؟؟ ذہن پر زور ڈالنے کی بات یہ ہے کہ دینے کی صورت میں نہ لا سکنے کی کوئی تو وجہ ہوگی۔ کوئی ایسی چیز ہوگی جو دینے کی صورت میں نہ لائی جا سکے بلکہ نہ دینے کی صورت میں لائی جا سکے، پہیلی کا جواب ہے "جھاڑو"

اب ذرا پھر اس پہیلی پر غور کیجئے کہ ایک عورت پڑوسن سے جھاڑو مانگنے گئی ہے، دیکھا پڑوسن خود جھاڑو دے رہی ہے، اسی لئے یہ لانے سے قاصر رہتی ہے۔ سارا کھیل لفظ "دینے" کا ہے جو جھاڑو کے استعمال کے ساتھ منسلک ہے اور جسے استعمال کر کے مخترع (پہیلی تشکیل دینے والا) نے یہ سارا مغالطہ پیدا کیا ہے۔

پہیلیوں کے ذیل میں عرض یہ ہے کہ جن پہیلیوں کا ذکر ہم اس مضمون میں کریں گے ان میں سے بہت سی آپ سب کی سنی ہوئی ہوں گی۔ اور جوابات بھی آپ سب کو یاد ہوں گے لیکن نہ بھی معلوم ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں، اس لئے کہ ہم یہاں پہیلیاں نہیں بجھا رہے ہیں۔ ان پہیلیوں میں سے بہت سی پہیلیاں ہمارے بچپن اور لڑکپن کی سنی ہوئی ہیں۔

کچھ کا ذکر ہم نے درسی کتابوں بشمول "آب حیات" میں پڑھا ہے لیکن یہ اعتراف کرنے میں کوئی ہرج نہیں کہ اس مضمون کے لکھنے کی تحریک ہمیں ایک غیر معروف انگریزی مضمون Poetry Calander مجریہ جون 1997ء میں ایک مضمون کو پڑھ کر ہوئی۔ اس مضمون میں ہم نے اس سے خاصی مثالیں نقل کی ہیں جو آگے چل کر پیش کی جائیں گی۔ ان مثالوں سے معاشرتی اور ماحولیاتی، فکر اور وجدان کا فرق اور ہم آہنگی کے علاوہ پہیلیوں کے شعری ادب کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ اس مضمون میں ہم کچھ فارسی پہیلیاں بھی پیش کریں گے مگر افسوس ہمیں اس کا ہے کہ کوشش کے باوجود ہم عربی زبان کی کوئی پہیلی نقل نہیں کر سکے۔ ہمیں یہ بھی اعتراف ہے کہ ہم نے لیبیا میں اپنے ساڑھے چار سالہ قیام کے دوران بھی کوئی پہیلی نہیں سنی اگرچہ ہم نوجوانوں کو پڑھانے کے کام پر مامور ہونے کی وجہ سے اسکول کے ماحول میں تھے۔ یقیناً اس کا یہ مطلب نہیں کہ عربی ادب میں پہیلیاں وجود نہیں رکھتیں مگر اس کا ایک صاف مطلب جو ہماری سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ عربی زبان جس کے الفاظ ایک بڑی تعداد میں ہماری اردو زبان کا جزو ہیں، نے ہماری ثقافت اور زبان پر اس ضمن میں کوئی نقش نہیں چھوڑا، اس کے جواز کے طور پر شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ عربی زبان قرآن کی زبان ہونے کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں شعراء اور عوام کیلئے ایک متبرک حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس سے ہمارے یہاں تفریحی اور لہو لعب کے میدان میں غیر شعوری طور پر کام نہیں لیا گیا، یا لیا جانا مناسب نہ خیال کیا گیا ہو۔

صنعت ایہام کی اقسام کا مغالطہ شعراء ایک اور صنعت جسے "حسن تعلیل" کہتے ہیں شاعری میں استعمال کرتے ہیں۔ اس صنعت میں معنوی اور لفظی مغالطہ پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ وجہ اور سبب سے یہ کام لیا جاتا ہے مثلاً

پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

میر انیس

اس شعر میں موجوں کے سر پٹکنے کی وجہ سپاہ خدا کے تین دن سے پیاسے ہونے کو قرار دیا گیا ہے جبکہ اصل وجہ یہ نہیں بلکہ جیولاجیکل اور طبیعاتی ہے۔ لیکن اصل وجہ کو پس پشت ڈال کر ایک نئی وجہ اختراع کی گئی ہے جس سے کلام میں لوازمہ اور رنگینی پیدا ہو گئی ہے وہ اصل وجہ کے بیان کی صورت میں پیدا نہ ہو سکتی۔ دوئم اس سے شاعر کی رفعت ذہن اور پرواز تخیل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہم آگے چل کر پہیلی کی نسبت سے اس صنعت کے استعمال پر بھی گفتگو کریں گے۔

اردو کے محقق، اردو زبان کے عمر کے تعین پر ابھی تک متفق نہیں ہو سکے ہیں جو ایک نہایت افسوسناک بات ہے۔ جو بہت تیر مارتے ہیں ان کے خیال میں اس کی عمر اب تیسری صدی میں داخل ہوئی ہے۔ اس کی توجیہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ زبان کی پختگی یا بلوغت عمر کے ساتھ مشروط ہے۔ ولی دکنی کے عہد سے پہلے کی صورتحال اس کے منافی ہے۔ مگر میرا معروضہ اس ذیل میں یہ ہے کہ کم از کم امیر خسرو کے زمانے سے اردو کا آغاز مان لینے میں کوئی مضرت نہیں، جس کے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کا بچپن نسبتاً زیادہ طویل تھا یا پھر اردو بے سرپرست، کھلنڈری اور لاابالی ہونے کے سبب بلوغت کی سرحد میں دیر سے داخل ہوئی۔ بجائے اس کے کہ ہم چار پانچ صدیوں تک اردو کے وجود سے ہی انحراف کریں۔ چونکہ اس مضمون میں ہم امیر خسرو کی اردو پہیلیوں کا بھی ذکر کریں گے اس لئے یہ بات ضمناً گفتگو میں آگئی ہے۔

پہیلیوں اور مکرنیوں کی افادیت اور تلذذ کے پیش نظر شعراء نے اس پر خصوصی توجہ دی حتیٰ کہ صنائع و بدائع شاعری کی ترتیب و تہذیب کرتے وقت اصناف سخن میں "معما" بھی شامل کیا گیا۔ یہ بھی ایک قسم کی پہیلی ہی ہے۔ صنعت ایہام اور حسن تعلیل پر اگر غور کیا جائے جیسا کہ پیشتر بھی لکھا گیا تو پہیلیوں سے بنیادی ربط نظر آتا ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی پہیلیوں کا رنگ نظر آتا ہے۔ یہ مذکور بھی اپنی اپنی جگہ پر قلمبند کیا جائے گا۔ پہیلیاں اور مکرنیاں زبان کی عہد بعہد ترقی کا پتہ دیتی ہیں کہ کس زمانے میں کس قسم کے اور کون کون سے الفاظ مستعمل تھے جو اب نہیں ہیں یا منجھ کر ان کی شکل کیا ہو گئی ہے۔ معاشروں اور ثقافتوں کا بھی پہیلیوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پہیلیوں کی معنوی ہیئت پر اگر غور کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ عبارت کے ذریعے تخلیق کار دراصل ایک فریب Illusion پیدا کرتا ہے، چونکہ پہیلیاں لفظوں اور زبان سے متعلق ہوتی ہیں اس لئے یہ Illusion یا فریب ذہنی ہوتا ہے۔ علمائے فکر انسانی نے اس ذہنی فریب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عملی زندگی میں Optical Illusion کی بھی تخلیق کی جسے فریب نظری کہا جاتا ہے۔ کراچی کے چڑیا گھر میں وہ لومڑی ہمارے بہت سے قارئین کو یاد ہو گی جس کا بدن لومڑی کا اور سر انسان کا ہے اور وہ لومڑی انسانوں کی طرح بات چیت کرتی ہے۔ یہ Optical Illusion کی ایک مثال ہے۔ ورنہ ایسا کوئی جانور وجود نہیں رکھتا، ہم آپ کو بتا سکتے ہیں کہ یہ محض آئینوں کا کمال ہے اور کچھ نہیں، مداریوں کے کرتب اور ہاتھ کی صفائی بھی اسی فریب نظری کی فہرست میں آتے ہیں۔ مشہور زمانہ ہودینی کا نام اسی فریب نظری کی بدولت زندہ ہے۔ ایسے تماشے ہم سب کیلئے علی العموم اور بچوں کیلئے علی الخصوص دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ تجسس اور تحیر انسان کو فطرتاً ایک کیف اور مسرت مہیا کرتا ہے اور یہ کیف کا سامان اختراع کرنے والے ہوتے صاحب ادراک اور ذہین لوگ ہوتے ہیں۔ اس گفتگو کا ہمارے مضمون سے صرف اتنا تعلق ہے کہ یہ ان اسباب کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس کیلئے پہیلیاں لکھی گئیں اور دوسرے یہ کہ ان سے ذہن انسانی اور نفسیات پر قدرے روشنی پڑتی ہے۔ عموماً دھوکا دے کر اور دھوکا کھا کر کوئی خوش نہیں ہوتا بلکہ تکلیف ہوتی ہے مگر یہ ذہنی دھوکا ہم ہر وقت خوشی خوشی کھانے کیلئے نہ صرف تیار رہتے ہیں بلکہ داد بھی دیتے ہیں، اگر ہم اپنی ذہنی صلاحیت کے زور پر بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں تو ایک گونہ مسرت اور تلذذ حاصل ہوتا ہے جو ذہنی انبساط کے علاوہ ہے۔ شاعری کی تعریف میں ارکان قضا و قدر اور ارباب حل و عقد نے ایک تعریف میں حصول لذت، کیف اور مسرت کی بات بھی کی ہے بلکہ بعض نے اسے اہم ترین جزو قرار دیا ہے۔ شعراء نے زندگی کو بھی "معما" کہا ہے، اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا ـــ زندگی کاہے کوئی خواب ہے دیوانے کا ـــ شاید اسی لئے کہ ہر آنے والا لمحہ ہمارے لئے اجنبی، نادیدہ اور غیر متوقع واقعات لے کر نمودار ہوتا ہے جن کا حل ہم پہلے سے نہیں جانتے، ہماری زندگی میں جو کشش رہ جائے گی، (یہ ایک لمحہ فکریہ ہے) جنسیات کے ماہرین نے بھی زندگی میں دریافت اور تجسس کو بہت اہم قرار دیا ہے، گو اس دریافت اور تجسس کا معیار معاشرہ در معاشرہ مختلف ہے جس پر ہمیں گفتگو نہیں کرنی۔

یہاں سے ہم اس مضمون کو زیادہ وقیع اور موقر بنانے کیلئے ذرا گہرے مطالعہ کی طرف آتے ہیں تاکہ ہماری گفتگو ہماری ذہنی اپج سے تیار کردہ ہوائی قلعہ نہ معلوم دے، رچرڈ ولبر جو ایک پلٹزر انعام یافتہ مترجم اور شاعر ہے اپنے اسی مضمون میں جس کا حوالہ ہم اوپر دے آئے ہیں۔ پہیلیوں کے بارے میں رقمطراز ہے کہ اولین پہیلیاں قدیم بابل کے طالب علموں کے Tablets یعنی پڑھنے کی میزوں پر پائی گئی ہیں۔ پہیلیوں کے بارے میں افلاطون نے اپنی کتاب Republic میں خاصہ سرپرستانہ اور ہمدردانہ رویہ اختیار کیا ہے جب کہ برخلاف اس کے شاعری کو سخت سست کہا ہے، دوسری طرف ارسطو ہے جو اپنے شعری نظریات کے تحت پہیلیوں کو عزت اور وقار کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پہیلیوں کی شاعری وہ شاعری ہے جس میں حقائق غیر معمولی اور ناممکنات کی حد تک نہ سلجھنے والے تانوں بانوں میں بن دی جاتی ہے جو ایک ذہنی کمال ہے۔ اس کی رائے میں یہ اعلیٰ معیار اور بہترین پایوں کی شاعری ہے۔ وہ ان کو گراں قدر کہنے کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ ان کی تخلیق میں اعلیٰ ترین استعاروں اور تشبیہات Metaphors سے کام لیا جاتا ہے۔ جو بقول ارسطو وہ شاعرانہ صلاحیتیں ہیں جو نہ تو پڑھائی جاسکتی ہیں نہ سکھائی جاسکتی ہیں۔ ہمارے یہاں اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ صلاحیتیں وہبی ہیں کسبی نہیں، وہ مزید کہتا ہے کہ بہترین استعارہ Metaphors اعلیٰ ترین ذہن کی پیداوار ہوتا ہے جس میں وہ اپنی عبقریت اور ادراک سے کچھ مشابہ و مماثل چیزوں کا رشتہ کچھ دوسری غیر مشابہ چیزوں سے جوڑ دیتا ہے۔ چوتھی پانچویں صدی عیسوی میں ایک شخص سموفوشیس Symphocius نے تین تین سطروں کی ایک سو پہیلیاں لکھی ہیں، یہ ساری پہیلیاں Folk Tradition لوک رسوم کی غماز ہیں اور ان کا تعلق روزمرہ کے معمول اور استعمال میں آنے والی اشیاء اور سامان سے ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ان پہیلیوں کو عمدہ شعری روایات سے بھی مزین کیا ہے۔ ہم یہاں اس کی ایک پہیلی نقل کرتے ہیں جو ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔

Four equal sisters equidistant run. As if they vied in strength and speed, but None Gains on another and their task is done.

اس پہیلی کا جواب پہیئے Wheels ہے۔ یہاں ہم اگر ارسطو کے نظریات کے تحت دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ مجاز اور استعارے Metaphors کیسے اس پہیلی میں دخیل ہیں، گاڑی کے چار پہیوں کو چار جڑواں بہنیں کہنا، پھر ان کا اس کا سفر دوڑ کر طے کرنا اور پھر یہ کہنا کہ کوئی ایک دوسرے سے بازی نہیں لے جاسکتا اور یہ کہ کام بھی ختم ہو گیا۔ یہ یقیناً کسی معمولی

ذہن کے بس کی بات نہیں، یہ کمال تخلیق استعارہ ہے۔ استعاروں کے بارے میں یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ اشیاء کن باتوں میں ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور کن باتوں میں نہیں۔ یعنی ہم اگر معمولی سا استعارہ استعمال کرتے ہوئے کسی کی آنکھ کو ستارے سے تشبیہ دیں تو اس سے مراد ستارے کی چمک ہو گی نہ کہ ستارہ بذات خود، جو گیس مٹی اور پتھروں پر مشتمل ہے یا ہم اسی آنکھ کو عقاب کی آنکھ سے ملائیں تو اس کا مطلب نظر کی تیزی ہو گی نہ کہ وہ گول گول بہ صورت آنکھیں اور اڑنے والا پرندہ۔

ارسطو اپنی کتاب Rehtoric (مکالمہ) میں اچنبھے اور تحیر کے حوالے سے لکھتا ہے کہ استعارہ کسی زبان میں قاری یا سامع کی سطحی توقعات کو حیرت اور فریب میں ڈال کر پرورش پاتا ہے۔ اس کو ہم مزید یوں واضح کر سکتے ہیں کہ ایک پڑھنے والا جو دراصل کسی سادہ سی بات کا متوقع ہوتا ہے اور شعر میں اس کے برعکس بات کہہ دی جاتی ہے تو قاری یا سامع اس بات سے نہ صرف خوش ہوتا ہے بلکہ اس بات سے کہ اس نے کوئی نئی بات جان لی ہے۔ اس کا جذبہ حصول علم تسکین بھی پاتا ہے۔ آگے بڑھ کر وہ کہتا ہے کہ پہیلی بھی اسی وجہ سے ہم کو تلذذ، مسرت اور شادمانی فراہم کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جس طرح شاعری تحیر انگیز اور توقف اور تاخیر سے یعنی غور و فکر سے سمجھ میں آتی ہے تو پھر یہ کہنا بھی درست ہو گا کہ پہیلی جو اس ذیل میں مبالغہ کی حد تک محیط ہے، شاعری کا ایک جزو لازمی ہے، اگر استعارہ و تشبیہ یعنی مماثلت کا تصور شاعری میں مرکزیت رکھتا ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہیلیاں اس مرکز سے قریب تر ہوتی ہیں، جس طرح ہم شاعری میں مناسبات پر توجہ دیتے ہیں اسی طرح یہ مناسبات ہم کو پہیلیوں میں بھی نمایاں طور سے نظر آتے ہیں۔

پہیلی کے بارے میں متفقہ طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس کی بنیاد بہت حد تک استعاروں اور مجاز Mataphor پر ہے۔ حقیقت و مماثلات کا غیر متعلق و غیر مماثل سے رشتہ جوڑ دینا مخترع کے ادراک، ذہنی اپج اور قوت متخیلہ کی رفعت کا پتہ دیتا ہے۔ ہم پہیلی بوجھنے کیلئے ذہن میں معلوم چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ بسا اوقات اس کا وجود اشیاء کی بجائے جانداروں میں ملتا ہے یا بالعکس ہم جانداروں میں ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں اور وہ اشیاء میں ملتا ہے۔ اس کا دارومدار بوجھنے والے کی سرعت ذہن اور تجزیہ کاری کی صلاحیتوں پر ہے کہ وہ کتنی ذہانت سے غیر متعلق اشیاء کا متعلق اشیاء سے ربط کا ادراک کر لیتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ پہیلیاں کہنا جتنا بڑا فن ہے۔ پہیلیاں بوجھنا اس سے بہت کم تر نہیں، اس لئے کہ ہمارے نزدیک دراصل پہیلی بوجھتے وقت بوجھنے والا اسی راہ پر معکوس سفر کر کے ہی پہیلی بوجھ سکتا ہے۔

پہیلیوں کے بارے میں مائیکل الیگزینڈر **Michael Alexander** اپنی تصنیف **Erlier English Poems** میں کہتا ہے کہ پہیلیاں غیر معلوم دنیائے فطرت کی تلاش کا نام ہے۔ یہ یادداشت کو پرکھنے، سان پر چڑھانے کے علاوہ ہمارے **Sense of Humor** حس لطیف کو ابھار کر کے ہماری معلومات کے ذخائر کو کمک پہنچاتی ہے، یہی نہیں بلکہ پہیلیاں ہم کو آئے دن پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو ذہنی طور پر قبول کرنے میں بھی مدد فراہم کرتی ہیں۔ مثلاً بغیر "پر" کے پرندے کا وجود ماننے کیلئے ویسے تو تیار نہیں ہوتے مگر ہم شاعری اور پہیلی میں دیکھتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اس قسم کی محیر العقول تبدیلیاں جو آئے دن ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں ہم انہیں غیر شعوری طور سے اپنے چیستانی ادب کی تربیت کے تحت قبول کر لیتے ہیں۔ پہیلیاں ہماری **Vocabulary** ذخیرہ الفاظ کی وسعت میں بھی مددگار ہوتی ہیں۔ وہ اس لئے کہ پہیلیوں کی بنیاد یا تو ذو معنی الفاظ پر رکھی جاتی ہے۔ یا پھر ان میں اضداد کے تقابل کا مرکب شامل ہوتا ہے یا مجاز اور استعاروں کا کرشمہ، ان صورتوں میں ہم شاعری کی معروف صنعتوں یعنی صنعت ایہام، صنعت طباق، صنعت تضاد، حسن تعلیل، مجاز مرسل، محاکات، استعارہ، تشبیہ، مشبہ سب کی دسترس میں آجاتے ہیں، اتنی صنعتوں کی موجودگی کے باوجود ہم کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ پہیلیاں شعر گوئی میں اعلیٰ مقام نہیں رکھتیں؟

اس مصروف ترین دور میں کچھ لوگ اس خیال کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ اولاً پہیلیاں کوئی از کار رفتہ چیز ہو گئی ہیں، دوسرے یہ کہ پہیلیاں محض ایک **Trick Question** یا مغالطہ خیز سوال ہے کہ جو حل ہو جانے پر اپنی افادیت خود بخود زائل کر دیتا ہے اور ان میں مزید دلکشی باقی نہیں رہتی۔ ہمیں یہ خیال اور استدلال کلی طور پر درست نہیں معلوم دیتا مگر کسی حد تک ہم یہ بات نثری پہیلیوں کے متعلق مان بھی سکتے ہیں۔ شاعری کبھی از کار رفتہ چیز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی یہ اپنی دلچسپی زائل کرتی ہے۔ شعری پہیلیاں فرصت کا کھیل ہونے کے باوجود نہ صرف شعری خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں بلکہ ان کا جاندار شعری سرمایہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ یہ آج بھی ہمارے اذہان میں اپنے مضبوط پنجے گاڑے ہوئے ہیں اور آج بھی ہم اگر کوئی اچھی پہیلی سنتے ہیں تو محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

پہیلی تخلیق کرنا اور بوجھنا دونوں انسان کی ذہنی صلاحیتوں کی غماز ہیں۔ پہیلی اختراع کرنے والا کسی چیز کے بارے میں اس کا نام لئے بغیر پوچھتا ہے۔ جس کیلئے وہ حوالے اشارے ترتیب دیتا ہے۔ یہ اشارے فرضی ہونے کے باوجود سب کے سب کسی حقیقی چیز سے ربط رکھتے ہیں، یہ مفروضہ اشارے ہمارے ذہن کو کسی بھول بھلیاں میں ڈال کر گمراہ بھی کرتے ہیں جس کے باعث ہم فوری طور سے اس کے حل تک نہیں پہنچتے۔ پہیلیوں میں ہماری ذہنی رو کو بھٹکانے کیلئے ایسے تضادات کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جن سے خواہ وہ بات بالکل سامنے کی ہی کیوں نہ ہو ہمیں گنجلک نظر آتی ہے۔ پہیلیاں عموماً ہماری روزمرہ زندگی سے تعلق رکھنے والی اشیاء اور سامان وغیرہ سے متعلق ہوتی ہیں۔ آیئے ذرا اس دو مصرعوں یا لائنوں والی پہیلی پر نظر ڈالیں۔

I tremble at each breath of air, and yet can heaviest burden bear.

یہ بات درست ہے کہ مختلف اذہان مختلف انداز سے سوچتے ہیں، ہم یہ بات اوپر کہہ بھی آئے ہیں کہ پہیلی بوجھنے والا کہنے والے کی طرح انتہائی سریع الفکر، ذکاوت ذہنی اور **Intuitive** تجزیہ کار ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ اس پہیلی کو دیکھئے اور اس میں مبینہ تضاد پر غور کیجئے ایک ایسی نازک یا کمزور چیز ہے جو ہوا کے معمولی جھونکے سے لرز جاتی ہے جبکہ دوسری سطر میں وہی چیز اتنی قوی بھی ہے کہ بھاری سے بھاری بوجھ اٹھانے کا تحمل رکھتی ہے۔ نزاکت یا کمزوری کے حوالے سے ہم جائزہ لیں تو ہمارا ذہن مثلاً پر، بال، دھواں، کاغذ، پتے، مکڑی کا جالا، بھوسہ، پردے وغیرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے مگر یہ چیزیں بوجھ اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اس لئے ان کے ساتھ ہی ساتھ ہم ان چیزوں کا بھی تجزیہ کرتے ہیں جو بوجھ اٹھانے کی متحمل ہو سکیں، یہ قوی اور توانا آدمی بھی ہو سکتا ہے، بیل، بوجھ اٹھانے والے جانور، پھلوں سے لدے ہوئے درخت اور ان میں لگے ہوئے نازک پتے بھی ہمارے ذہن میں آجاتے ہیں لیکن ان سب میں کوئی چیز قدر مشترک نظر نہیں آتی۔ ہمیں کسی ایسی چیز کی تلاش ہے جو دونوں اشاروں پر پوری اترتی ہو۔ اچانک ہمارے ذہن میں ایک روشنی سی نمودار ہوتی ہے اور ہم پہیلی کے حل تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ چیز "پانی" ہے۔ اور اب جو تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ "پانی" کے علاوہ اس کا کوئی حل ہو ہی نہیں ہو سکتا، پانی جو ذرا سے ہوا کے تھپیڑے سے لرز جاتا ہے وہی اپنے سینے پر بھاری بھرکم جہاز اور کشتیاں اٹھا کر چل سکتا ہے۔

رچرڈ ولبر کہتا ہے کہ پہیلیوں کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے

کہ اول تو اس کے تحقیق کاروں میں اور بڑے ناموں کے علاوہ لیونارڈ **Leonard** گلیلیو **Galileo** سروانٹس **Servaites** ربی لیاس **Rebelais** یاٹس **Wyatt** شیکسپیئر **Shakespear** اور کنگ ٹمر جیسے معتبر نام بھی ملتے ہیں۔ دوم یورپ کے قہوہ خانوں اور درباروں میں پہیلیاں بجھانا ایک عام رواج اور مقبول مشغلہ تھا۔ جب کہ بعد ازاں مقبول عام رسائل میں ان کی اشاعت ایک معمول تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ **Swift** کی پہیلیاں ایک خاص درجہ شہرت پر پہنچیں اور یہی نہیں بلکہ یہ نظم پارے دو تین سطروں سے تجاوز کر کے طویل نظموں کی صورت میں ظہور پذیر ہونے لگے۔ جاتھن سوئفٹ **Jonathan Swift** کی ایک پہیلی جو کارک سکریو **Corck Screw** سے متعلق ہے۔ 38 لائنوں کی ہے۔ جبکہ ایک اور پہیلی جو روشنائی **INK** کے بارے میں ہے، سات قطعات یا سات مرحلوں پر مشتمل ہے، یہ گویا 28 لائنیں ہو گئیں۔ نثری پہیلیاں دلچسپ اور چونکا دینے والی ہونے کے باوجود زیادہ سفر نہیں کر پائیں جس کی مثال میں درج ذیل پہیلی پیش کی جا سکتی ہے۔

What is the difference between a Jeweler and a Jailer?

اس کا جواب ہے:

A Jeweler sells watches and Jailer watches cells.

آپ دیکھیں گے کہ اس میں بھی دو ایسے لفظوں کا کھیل ہے جو تلفظ و صوت کے قریب ہیں، مگر معنوی اعتبار سے مختلف، یہ وہی صنعت ہے جو ہماری اردو شاعری میں صنعت ایہام کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ پہیلی ایک دفعہ سننے کے بعد اتنی جاذب اور دلکش نہیں رہتی اور اس کی وجہ صرف اور صرف اس کی نثری ہیئت کذائی ہے اور جاذبیت ہے وہ اسی شعری صنعت کی وجہ سے ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پہیلیوں کا رواج زمانہ قدیم میں سماج اور ثقافتی حدود میں کتنا اہم تھا۔ یہاں تک کہ ایک سزا یافتہ قیدی اگر عدالت کے سامنے کوئی ایسی پہیلی پیش کر دے جو وہ حل نہ کر سکیں تو اس قیدی کو رہا کر دیا جاتا تھا۔ اس ذیل میں پہیلی پیش کرنے سے پہلے ہم انجیل مقدس کے حوالے سے ایک پہیلی پیش کرتے ہیں۔ انجیل کا یہ کردار جس سے یہ پہیلی منسوب ہے ہم سب کیلئے فلموں کے حوالے سے بھی معروف ہے۔ یہ پہیلی اپنی شادی کی دعوت کے موقع پر سمسن **Samson** نے اپنے دشمن فلسطینیوں کے سامنے رکھی تھی۔

Out of the Eater came something to eat out of the strong came something sweet.

قبل اس کے کہ ہم اس پہیلی پر گفتگو کریں ہم مذکورہ بالا حوالے سے وہ پہیلی بھی پیش کرتے چلتے ہیں جو چار سطری پہیلی ہے:

As I was walking down the lane,
out of the dead he living came,
four there were, and five to be,
now tell me this riddle or set me free.

آپ دیکھیں گے کہ ہر چند ان دونوں پہیلیوں میں شعری آہنگ بدرجہ اتم موجود ہے مگر ذہن پر انتہائی زور دینے کے باوجود بھی ان کا حل ممکن نہیں ——— کیوں؟ اس لئے کہ ان کا تعلق ذہن سے نہیں کہیں زیادہ انفرادی تجربے سے ہے اور جب تک کوئی ان انفرادی تجربوں سے نہ گزرے ان کے حل تک نہیں پہنچ سکتا۔ پہیلیاں عام مشاہدے کی چیز ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ پہیلیاں جو انفرادی تجربے پر مبنی ہوں پہیلیوں کے عمومی دائرے سے خارج ہیں۔ سمسن **Samson** والی پہیلی کا قصہ کچھ یوں ہے کہ سمسن کا سامنا اپنے قصبہ تمناہ **Timnah** کے سفر کے دوران ایک آدم خور شیر سے پڑتا ہے۔ جسے وہ محض اپنی قوت بازو سے مار ڈالتا ہے۔ کچھ مدت بعد جب اسی راستے سے واپس ہوتا ہے تو اس شیر کے ڈھانچے میں شہد کی مکھیوں نے چھتہ لگا لیا ہوتا ہے۔ بھوکے ہونے کے باعث سمسن اس میں سے شہد کھاتا ہے جن فلسطینیوں کے سامنے سمسن نے یہ پہیلی رکھی تھی وہ اسے کبھی نہ بوجھ سکتے مگر انہوں نے اس کی محبوبہ ڈیلائلہ **Delilah** جسے سمسن یہ واقعہ بتا چکا تھا کو مجبور کر کے اس کا جواب حاصل کر لیا۔ اور بعد کا سارا واقعہ بائبل کے اوراق میں محفوظ ہے۔ اسی طرح دوسری پہیلی ہے اگر آپ اس کی آخری سطر پر غور کریں تو اس میں **Challenge** صاف درج ہے کہ یا تو میری پہیلی بوجھو یا مجھے آزاد کرو۔ یہ پہیلی بھی ایک انفرادی تجربہ پر مبنی ہے جس کی اصل یہ ہے کہ کوئی پرندہ کسی بیل کے سر پر گھونسلا بنا لیتا ہے اور اس میں پانچ انڈے دیتا ہے، یہ انڈے وہاں بچے نکلنے کی مدت تک رہتے ہیں اور پھر ایک دن پہیلی بجھانے والا یہ منظر دیکھتا ہے کہ انڈے کھلنے کر پہلے چار بچے نکلتے ہیں اور پھر پانچواں برآمد ہوتا ہے۔ یہ پہیلی بوجھنا بھی آسان نہیں اس لئے کہ یہ انفرادی تجربہ پر مبنی ایک پہیلی ہے۔ ہمیں یاد آیا کہ ہمارے معروف مسخرے ملا دو پیازہ نے بھی اپنے کسی زبردست حریف کو ایسے ہی سوال سے شکست دی تھی۔ قصہ یقیناً آپ میں سے بہتوں کو یاد ہو گا۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں مگر یہ ہمارے **Folk Lore** میں شامل ہے۔ ملا دو پیازہ کا سوال تھا کہ بتاؤ تن، تسر، بھد، میں، کیا ہے، حریف کئی روز کی مغز زنی کے باوجود اس کا حل نہ بتا سکا اور ہار ماننا پڑی۔ یہ دراصل ایک صوتی خاکہ ہے جو ملا دو پیازہ کو ایک نجی تجربہ کی بنیاد پر معلوم تھا۔ وہ منفرد واقعہ یوں ہے کہ جانوروں کی باڑ میں کدو کی ایک بیل پر موٹا سا کدو پک چکا ہے۔ یہ کدو ملا کے سامنے ٹوٹتا ہے۔ جب کدو ٹوٹ کر گرتا ہے تو بیل جو کدو کے وزن سے تنی ہوئی تھی "تن" کی آواز پیدا کرتی ہے۔ جیسا کہ آپ نے بھی کسی تنی ہوئی الگنی یا رسی کو کھینچ کر چھوڑنے میں سنی ہو گی۔ کدو گرتے وقت پتوں کے ڈھیر سے گزرتے ہوئے "تسر" کی آواز پیدا کرتا ہے۔ وہ کدو اتفاق سے باڑ میں بندھی ہوئی بکری کی پیٹھ پر گرتا ہے اور "بھد" کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ کدو بکری پر گرتا ہے تو بکری بوکھلاہٹ یا تکلیف سے "میں" کی آواز نکالتی ہے۔ یہ ہے تن، تسر، بھد، میں، کا معما۔ اس کا ذکر ہم نے اس لئے ضروری سمجھا کہ ذہن انسانی کی ہم آہنگی کا نمونہ اور تعلق سامنے رہے۔ دل کہتا ہے کہ ملا دو پیازہ کا معما گھڑنے والے نے انجیل کا مطالعہ ہر گز نہ کیا ہو گا۔ اب ہم مغربی ادب سے دو بہت خوبصورت اور دلچسپ پہیلیاں سناتے ہیں۔ یہ ایک سات سطری **Stanza** ہے۔

White bird featherless,
Flew from paradise,
Pitched upon the Castle walls,
Along came the lord landless,
Took it up handless,
and Rode away horseless,
To the King's white hall.

آپ دیکھیں گے کہ یہ پہیلی محاکات کا ایک حسین نمونہ ہے جس میں تحقیق کار نے حیرت خیز تضاد کو جمع کر دیا ہے جو ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ ایک پرندہ جس کے پر نہیں، ایک لارڈ یا نواب بے ملک و زمین، پرندوں کا فردوس سے اڑ کر محل کی منڈیر پر بیٹھنا، بغیر

ہاتھوں کے لیتا یا پکڑ لے جانا، بغیر گھوڑے کے سوار، سب باتیں حیرت افزاء ہیں۔ اس خوبصورت پہیلی کا حل ہے سنو SNOW اور سورج SUN ۔ اب ہم اگر پہیلی کی تفصیلات کا جائزہ لیں تو پہیلی کی خوبصورتی اور محاکات کا سحر دل میں مزید اترنے لگتا ہے اور آفرین کے بغیر نہیں بنتی۔ سفید سفید سنو، آسمانوں سے گری، محلوں کی دیواروں اور منڈیروں پر بیٹھی، سورج نواب، بغیر سواری کے آیا اور بغیر ہاتھوں کے سنو کو اوپر لے گیا (غائب کر دیا گیا) اور پھر اپنے سفید محل (یعنی آسمانوں) میں بغیر سواری کے واپس ہو گیا، واہ سبحان اللہ۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ پہیلی ازکار رفتہ کوئی چیز ہے؟ کیا یہ پہیلی صرف ایک معما ہے؟ ہرگز نہیں، یہ اعلیٰ ترین شاعری ہے حسن تخلیل بھی اس میں کار فرما ہے، اس کے بعد ایک اور پہیلی دیکھئے یہ ایک چھ سطری Stanza ہے۔

In marble walls as white as milk,
Lined with a skin as soft as silk,
within a fountain crystal - clear,
a golden apple doth appear.
No doors there are to this stronghold,
Yes thieves break in and steel the gold.

اس میں بھی ہمیں محاکات اپنے عروج پر نظر آتے ہیں، اچھوتے استعارے اور تشبیہات سب نے مل کر اسے ایک شعری مرقع بنا دیا ہے، دودھ جیسی سفید مرمریں دیواریں، ریشم جیسی ملائم نرم جلد کا استر، شیشے کی طرح شفاف چشمہ اور اس میں سنہرا سیب، بغیر دروازوں کا قلعہ اور پھر چوروں کا نقب لگا کر سیب چرا لے جانا، لگتا ہے کوئی الف لیلوی داستان کا باب پڑھ رہے ہیں۔ ہر چیز کس تفصیل نفاست سے بیان کی گئی ہے۔ اس پہیلی کا جواب ہے انڈا، اب اگر اس کے جواب کی روشنی میں ایک ذرا پلٹ کر دیکھیں تو آپ بھی یقیناً میری طرح محظوظ ہو سکیں گے کہ شاعر نے کس قدر متحرک اور نشاط انگیز قوت متخیلہ پائی ہے، اور یہی علم شاعری ہے پہیلی کی حیثیت تو ثانوی ہو گئی ہے۔

Anthropologists انسانی عادات اور معتقدات کے ماہرین اور پہیلیوں کے مورخین کا کہنا ہے کہ پہیلیاں پہلے کل مقبول تھیں ویسے آج بھی پسندیدہ ہیں۔ جو Primitive لوگوں اور اسلاف کے ذریعہ سینہ بہ سینہ چلی آنے والی شاعری کی ایک اہم شاخ یا ذریعہ ہیں، یہ سامان تفریح و نشاط فراہم کرنے کے ساتھ ہمارے جذبہ تجسس کو ابھارتی ہیں اور ہماری دروں بینی کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ پہیلی کے حل کرنے میں ہم اس کے خصوصی لوازم کی دوسری چیزوں سے ہم آہنگی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ کوشش ہماری قوت متخیلہ کو مہمیز کرتی ہے، یونانی ادب میں یہ حیرت انگیز روایت (جس کے حقیقت ہونے میں کلام ہے) لکھی ملتی ہے کہ ہومر Homer جیسا جلیل القدر مفکر اور شاعر صرف اس شرمندگی میں مر گیا کہ وہ ایک پہیلی کا جواب درست نہ دے سکا، اس روایت میں حقیقت ہو یا نہ ہو مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ پہیلیاں یونانی معاشرے میں کس قدر سنجیدگی سے دیکھی جاتی تھیں۔ مزید یہ کہ اس وقت بھی پہیلیوں کی تخلیق اور حل میں پنڈار Pindar اور Theoritas تھیوریٹس جیسے لوگ اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ ان کے علاوہ عیسائی مذہبی پیشوا ایلڈ ہیلم Aldhelm اور ٹیٹوائن Tatwine جیسے لوگوں کا نام بھی پہیلیوں کی تخلیق کے ذیل میں لیا جاتا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں اینگلو سیکسن زبان میں لکھی ہوئی نوے پہیلیاں جن کے خالقوں کے نام بھی کسی کو نہیں معلوم ایک کتاب موسوم بہ Exeler Book میں درج ملتی ہیں، اہل نقد و نظر کے مطابق یہ پہیلیاں نہ صرف شاعری کی اعلیٰ نظمیں ہیں بلکہ اعلیٰ تخیل کا بھی نمونہ ہیں۔ ایسی ہی ایک پہیلی یہاں درج کی جاتی ہے۔ اس کا لطف ہمارے معاشرے میں جہاں گھروں میں ڈبل روٹی بنانے کا رواج نہیں اس قدر نہیں لیکن جس معاشرے میں یہ رواج عام ہے، وہاں کے ماحول کو تصور میں لا کر ہم بھی ویسا ہی لطف لے سکتے ہیں۔ یا کم از کم آٹا تو ہمارے ہاں بھی گوندھا جاتا ہے۔

I saw in the corner something swelling,
Rearing, rising and rising it cover.
A lovely lady, a lord's daughter,
Burried her hands in that boneless body.
Then covered with a cloth, the puffed - up creature.

آپ دیکھیں گے کہ گندھے ہوئے آٹے کو شاعر نے Boneless Body سے تشبیہ دی ہے اور گندھے ہوئے آٹے میں کس طرح ہاتھوں کے داخل ہونے کا بیان کیا گیا ہے، اس کے پھولنے کو سامنے رکھ کر کس طرح اسے مخلوق کہا گیا ہے، یہاں ہمیں مرحوم اکبر آبادی کا شعر یاد آتا ہے جسے ہم Puffed Creature کے حوالے سے نقل کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔

چار دن کی زندگی میں کوفت سے کیا فائدہ
کر کلرکی، کھا ڈبل روٹی خوشی سے پھول جا

ایسے واقعات بھی تاریخ میں درج ہیں کہ لوگ پہیلیوں کے ذریعہ روحانی اختیار کے اظہار کا کام لیتے رہے ہیں، ان کی مدد سے قبائلی تنازعات طے کرنے کے علاوہ لڑکیوں کی شادیاں کی جاتی رہی ہیں۔ مورخین چیستان کے مطابق Folk Lore کے ذریعہ بہت سی ایسی روایتوں کا پتہ بھی ہمیں ان پہیلیوں کے ذریعہ چلا ہے جو خواب عدم میں گم تھیں۔ آیئے اب ہم آپ کو یونانی پہیلی سناتے ہیں جسے سفنکس Suphnix نے اوڈیپس Oedipus سے پوچھا تھا، بات آگے بڑھانے سے قبل یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اتنے بڑے دماغوں کا پہیلیاں بجھانا اور بوجھنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ پہیلی کوئی حقیر چیز نہ کبھی تھی نہ آج ہے، یہ پہیلی بھی دو سطری پہیلی ہے۔

What goes on four legs in the morning light on two
at noon tide, and on three at night?

کہتے ہیں کہ اوڈیپس Oedipus نے یہ پہیلی اپنے مشاہدے اور تجزیاتی صلاحیتوں کو کام میں لا کر فوری حل کر لی، غور کیجئے کہ مجاز اور استعاروں سے کس کاریگری سے اس پہیلی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ صبح کی روشنی میں چار ٹانگوں پر چلنا، دوپہر کی موج میں دو ٹانگوں پر اور رات تین ٹانگوں پر چلنا، اوڈیپس نے صبح دوپہر اور رات کے اوقات کو عمر کے موسموں کا استعارہ بتایا، گویا بچپنا صبح کی روشنی، جوانی کی دوپہر کی موجیں اور بڑھاپا رات ہے، بچے طفلی میں چاروں ہاتھ پیر پر چلتے ہیں، جوانی میں دو ٹانگوں پر اور جب بوڑھے ہوتے ہیں تو ٹانگوں کے ساتھ عصا بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جواب اس کا ہے "انسان"

ارسطو کی "مکالمات" کے حوالے سے اور اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم یہاں کچھ

اور شعر نقل کرتے ہیں جو ہم سب کے سنے ہوئے ہیں۔ یہ اشعار ہماری شاعری میں قابل تحسین نہیں سمجھے جاتے اور کوہ کندن کاہ بر آوردن کی مثال میں نقل کئے جاتے ہیں ہمیں ان اشعار میں چیستانی عنصر کی طرف آپ کو متوجہ کرنا مقصود ہے۔

دعویٰ کروں گا حشر میں موسیٰ پہ قتل کا
کیوں اس نے آب دی مرے دشمن کی تیغ کو

اس کا مطلب بہت آسانی سے سمجھ میں آنے والا نہیں ہے، موسیٰ پر دشمن کی تیغ کو آب دینے کا الزام تو ہے مگر کیسے؟ یہ بات محذوف ہے، یہاں گویا شاعر حضرت موسیٰ کے کوہ طور پر جانے اور نور الٰہی سے اس کے جل جانے اور جلے ہوئے پہاڑ سے سرمہ کے حصول اور سرمہ سے دشمن کی تیغ کو آب دیا گیا۔ اتنے واقع کو دو مصرعوں میں سمو دینا عجیب سی بات ہے۔ ان ساری پیچیدگیوں کے پیش نظر یہ شعر شعر نہیں ایک معما ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن شعری ادب سے اس کا یکسر شعر ہونے کے باوجود اخراج ممکن نہیں، یہی دیکھئے کہ ہم نے اسے چیستان کے ذیل میں قبضہ کر ہی لیا۔

مگس کو باغ میں جانے سے روکو
کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا

اس شعر میں بھی وہی چیستانی گورکھ دھندا ہے، انگریزی میں کہتے ہیں **Nip in the bud** یعنی کسی خرابی کو آغاز سے ہی روک دینا اس میں بھی ایسا ہی کچھ اظہار ہے، یعنی اگر مگس (شہد کی مکھی) کو باغ میں جانے سے روک دیا جائے تو وہ رس حاصل نہ کر سکے گی۔ رس حاصل نہ کر سکی تو چھتہ نہ بنے گا، چھتہ نہ بنے گا تو موم نہ ہو گا تو شمع نہ بنے گی اور شمع نہ ہو گی تو پروانے کا خون ناحق نہ ہو گا، لغو شعر ہے مگر ہے اور زندہ ہے، اور اس کی زندگی اس کے چیستانی عناصر کی بنا پر ہی ہے۔

کہیں نظر نہ لگے اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

غالب کا یہ شعر دوسرے شعروں کے مقابلے میں ذرا آسان ہے مگر ہے اس میں بھی چیستانی عنصر، یعنی اگر لوگ مرا زخم جگر دیکھیں گے تو یقیناً ان کو خیال ہو گا کہ زخم لگانے والے کے دست و بازو کیسے قوی ہیں اور جب یہ استعجاب سے اس کے دست و بازو کے بارے میں سوچیں گے تو خدشہ ہے کہ ان کو نظر لگ جائے گی۔ ارسطو کی شاعری کے بارے میں **Delayed apprehension** والے نظریے کو سامنے رکھیں تو یہ شعر ایسے برے بھی نہیں لیکن ہم ہر کلیے کو ہر شعر پر منطبق نہیں کر سکتے جبکہ یہاں اطلاق سے زیادہ ہمیں کھینچ تان کرنی پڑے گی۔ مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ کہ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ مجازی معنی فہم سے بعید نہ ہوں ورنہ شعر چیستان اور معمہ بن جائے گا۔ اور مثال کے طور پر شاہ نصیر کا درج ذیل شعر نقل کیا ہے،

چڑھائی چادر مہتاب شب میکش نے جیحوں پہ
کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پہ

اس شعر کے معنی قارئین خود سمجھیں ہم نے یہ شعر اور یہ قول حالی صرف اپنی بات آگے بڑھانے کیلئے نقل کیا ہے یعنی استعارہ اور مجاز جو پہیلیوں میں استعمال ہوتا ہے وہ عام شاعری سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

یہاں سے ہم پھر پہیلیوں کی جانب لوٹتے ہیں اور سب سے پہلے ایک دو سطری **Swedish** پہیلی نقل کرتے ہیں جو پہیلی کے بارے میں ہے۔

When first I appear I seem mysterious, But whin I am explaned, I am nothing serious.

اس پہیلی کا جواب "پہیلی" ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس پہیلی میں شاعر نے پہیلی کی صرف ایک خصوصیت "پر اسراریت" ہونا بیان کی ہے۔ اب جو پہیلی ہم نقل کرنے جا رہے ہیں وہ بھی پہیلی کے بارے میں ہے مگر اس میں گذشتہ صفحات میں کی گئی گفتگو کی روشنی میں پہیلیوں کی بہت سی خصوصیات نظم کی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

اک سربستہ راز بھی ہوں
صاف کنایہ ساز بھی ہوں

تشبیہوں کی گود پلی ہوں
گاہ خفی ہوں گاہ جلی ہوں

لفظوں کے دل میں رہتی ہوں
مطلب کو باوا کہتی ہوں

تیز دماغوں پر کھلتی ہوں
عقل کسوٹی پر تلتی ہوں

بھیجا کھا کھا کر جیتی ہوں
ہاری کم اکثر جیتی ہوں

کرتب اپنے دکھلاتی ہوں
ذہن لڑانا سکھلاتی ہوں

مشکل بھی آسان بھی ہوں میں
زندہ بھی بے جان بھی ہوں میں

بوڑھے ہوں یا لڑکے بالے
سب ہیں میرے چاہنے والے

صدیوں سے پائندہ بھی ہوں
کل بھی تھی آئندہ بھی ہوں

کہہ کے مکرنے والی بھی ہوں
بات پہ مرنے والی بھی ہوں

دھوکا دینا کام ہے میرا
گورکھ دھندہ نام ہے میرا

ناداں ہو یا ہو فرزانہ
میرا لوہا سب نے مانا

میرے اشارے جو پاتے ہیں
فوراً مجھ تک آجاتے ہیں

جو مجھ کو اب بھی نہیں جانے
اس کو سمجھو پاگل خانے

آپ دیکھیں گے کہ اس پہیلی میں مجاز، استعارہ، تشبیہ، کنایا یا اشارے، تقابل و طباق، ایہام سب کا اہتمام پایا جاتا ہے اور اس پہیلی کو پڑھ کر صرف اور صرف جس چیز کی طرف دھیان جاتا ہے وہ پہیلی ہے۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب میں اتنی طویل پہیلی شاید ہی کسی کی نظر سے گزری ہو۔ اس طویل پہیلی کو ہم نے اس لئے نقل کیا ہے کہ مغربی ادب میں اگر سات مربعوں یعنی 28 سطروں پر مشتمل پہیلی ہے تو ہمارے قارئین اس احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں کہ ہمارے ادب میں اتنی طویل پہیلی کیوں وجود نہیں رکھتی۔ دیکھئے رکھتی ہے۔

اپنی کتاب "آب حیات" میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ ایک عورت جس کا نام چمپو اور کام بھنگ کا شروب بیچنا تھا امیر خسرو کے زمانے میں تھی، تھی تو بھنگ بیچنے والی مگر صاحب ذوق تھی۔ اور امیر خسرو کے منہ بھی لگی ہوئی تھی۔ آتے جاتے حقہ پیش کرتی اور فرمائش کرتی کہ آپ ہر ایک کیلئے کچھ نہ کچھ لکھ دیتے ہیں اگر کچھ چمپو کیلئے بھی کہہ دو گے تو کیا ہو جائے گا۔ تمہارے صدقے چمپو کا نام بھی رہ جائے گا۔ امیر خسرو ہر بار ٹال جاتے مگر ایک دن اس کے تقاضے پر یہ چار مصرعے لکھ دیئے ۔

اوروں کی چوپہری باجے چمپو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آوے ناہیں آویں سارے شہری
صاف صوف کر آگے رکھے جس میں ناہی تو سل
اوروں کے یہاں سینک سمائے "چمپو" کے یہاں موسل

امیر خسرو نے ستر سال کی عمر میں 1325ء میں وفات پائی۔ اس زمانے میں اس قسم کا کاروبار کرنے والی عورتیں، عورتوں کے قدیم ترین پیشہ سے بھی متعلق ہوتی تھیں۔ ان چار مصرعوں میں اگر ایک خاص زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو جو ابتذال ہے۔ وہ بھنگ بیچنے کے علاوہ اس پیشہ کی طرف مشار ہے جس کی وجہ سے یہ چار مصرعے پہیلی بھی ہو سکتے ہیں مگر ان چار مصرعوں کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اردو نہیں؟ ابتدا میں تو یہ کہوں گا کہ اردو قطعہ کی یہ ابتدائی شکل تسلیم کی جانی چاہیے۔ ہم یہاں یہ تذکرہ اس لئے لے بیٹھے کہ

ہم اب امیر خسرو کے بہت سی پہیلیوں کے علاوہ "انمل، ڈھکوسلا، مکرنی اور دو سخنے بھی موجود ہیں، ڈھکوسلا اور انمل سے ہم آپ کو بدمزہ نہیں کریں گے کہ ہمارے مضمون سے متعلق بھی نہیں، پہیلی بصورت صنف ان کی ایجاد نہیں مگر انہوں نے بہت سی پہیلیاں ضرور ایجاد کی ہیں اور مکرنی اور دو سخنوں کے وہ بصورت صنف موجد ہیں۔ مکرنی جو پہیلی کی توسیعی شاخ ہے اس پہیلی کو کہتے ہیں جس میں اس چیز کا نام لے دیا جاتا ہے جس کے بارے میں یہ پہیلی ہوتی ہے۔

مکرنی (امیر خسرو)

ترور سے اک تریا اتری اس نے بہت رجھایا
باپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارا، بوجھ پہیلی موری
میر خسرو یوں کہیں وہ اپنا نام نبولی

اس پہیلی کے حل میں بہت زور ذہن پر ڈالنے کی ضرورت تھی، اس کا حل "نبولی" یا نمکولی، نیم کا پھل ہے، نکتہ اس پہیلی میں جو ہے وہ یہ ہے کہ نیم کے معنی آدھے کے ہوتے ہیں، یہ دوسری مکرنی آئینہ کی ہے۔

فارسی بولی آئینہ، ترکی سوچی پائی نہ
ہندی بولتے آرسی آئے، منہ دیکھے جو اس کو بتائے

اور یہ دو سطری پہیلی دیکھئے جو ناخون کی مکرنی ہے

بیسیوں کا سر کاٹ لیا
نا مارا ناخون کیا

پہیلی ہونے کے علاوہ ہم اگر ان پر شاعرانہ انداز سے نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ وزن، بحر اور قافیہ کے اعتبار سے یہ وہی شاعری ہے جو آج ہم سب کرتے ہیں، نبولی والی مکرنی میں ترور اور تریا خالص ہندی بھاشا ہے جو آج ہم اردو میں نہیں لکھتے، رجھایا (پیش کے ساتھ) صاف ہو کر رجھایا (زیر کے ساتھ) ہو گیا ہے جو ہم سب بولتے ہیں، غزل کی زبان نہیں مگر نظم میں مستعمل ہے اور کیوں نہ ہو، موری اب میری ہو گیا ہے۔ مگر گیتوں میں ویسا ہی ہے سوچی غالباً سوجھی کی اصل ہے (بمعنی دیکھنا) یہ چار مصرعے بھی بالکل ہماری آج کی شاعری کے تحت خسرو نے "نا" لکھا ہے، اس لئے کہ "نہ" کا اختلاف خسرو نبولی کی پہیلی میں کر چکے ہیں۔ "نہ بولی" کو "نبولی" لکھ کر، "نا" ہندی میں نہ کا متبادل ہے جو اردو فارسی میں بھی اسی طرح مستعمل ہے، "نامعلوم افراد، نافہم یا نا سمجھ بچہ" وغیرہ۔

اب خسرو کی وہ پہیلیاں ملاحظہ کیجئے جو اس دور کی بولی ہیں۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہی انداز شعر ہے جو ہم لوگ آج بھی برتتے ہیں، صاف لگتا ہے کہ اس پہیلی کے نیچے سے اردو کا چلتا لہراتا جسم نمودار ہو جائے گا۔ یہ آج کی بولی نہ ہوتے ہوئے صاف سمجھ میں آتی ہے، نظم اور غزل کی نہیں گیت کی زبان ہے مگر شاعری عمدہ ہے۔

مکرنی

سگری رین موہے سنگ جاگا، بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت حیا اے سکھی ساجن؟ نا سکھی دیا

قبل اس کے کہ ہم نے ان مکرنیوں کی زبان کے بارے میں کچھ عرض کریں، ان کی صنعت پر کچھ عرض کرتے چلتے ہیں دیگر مکرنیوں کے مقابلے میں یہاں خسرو نے صنعت تعلیل (جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں) سے کام لیا ہے۔ پہلے تین مصرعوں میں جو صفات بیان کیں یا جو وجوہ نظم کئے وہ اشارہ دیتی ہیں کہ یہ ساری گفتگو ساجن کے بارے میں ہے جب کہ چوتھے مصرعے میں استفہامیہ انداز اختیار کیا گیا ہے "اے سکھی ساجن؟" اور پھر خود ہی تردید کر کے دوسری بات بتا دی، نا سکھی دیا، دیا، لون یا ڈھول، اور یہ انداز کمال فکر اور کمال قدرت شعری دونوں پر استدلال کرتا ہے۔ آیئے اب ان کو ایک زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں، یعنی دراصل یہ سب باتیں وہ سکھی سے کہہ تو ساجن کے بارے میں رہی ہے مگر اس خیال سے کہ یہ بات بے شرمی کی ہوگی، جس کی اجازت سماج میں نہیں یا کم سے کم مستحسن نہیں، اس لئے پردہ پوشی کر جاتی ہے اور کہتی ہے کہ نہیں وہ ساجن تھوڑی ہے، وہ تو دیا، ڈھنک اور ڈھول کی باتیں کر رہی ہے۔ اس طرح اس میں صنعت تجاہل عارفانہ کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے، تجاہل عارفانہ اس صنعت کو کہتے ہیں جہاں شاعر شعر میں کوئی ایسی بات کہتا ہے جس سے وہ واقف ہونے کے باوجود انجان ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً غالب کے شاگرد انور کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

پڑھئے !؟

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

سگری، ساری ہو گیا ہے، موہے، میرے لا جائے گا، بھئی، ہوئی ہو گیا ہے، بچھڑن کو بچھڑنا، لاگو کو لاگنے لگا ہیں، سلوہ ہم آج بھی بولتے ہیں تمکین کے معنوں میں، دیکا فارسی کی مہندس ترکیب ہے، دیکا اور پھیکا کے قافیوں کے استعمال کو دیکھئے، میر حسن اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنویات بلکہ ان کے بعد تک آپ کو ایسے قافیے مل جائیں گے۔ ایک زمانے تک مجہول اور یائے معروف کا یہ فرق جائز سمجھا جاتا تھا۔ اب متروک ہے اور ساتھ ہی ساتھ معیوب بھی، وا کے؟ ایک عرصے تک "وے" بھی لکھا ہوتا تھا اور یہ ابھی چار دہائیوں پہلے کی بات ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ یہ زبان ذرا سے رد و بدل کے ساتھ گیتوں میں آج بھی مستعمل ہے تو شاید اتنا غلط نہ ہو گا بلکہ وہ اردو شعرا جو آج ہندوستان میں شعر کہہ رہے ہیں، یہ زبان ان کی زبان کے زیادہ قریب ہے کہ وہاں ہندی الفاظ کا رواج عام ہے۔ ایک اور بات جو غور کرنے کی ہے وہ یہ کہ ہیئت اور ساخت کے اعتبار سے ان ساری کہہ مکرنیوں میں وہی چو والے قطعہ کا قالب استعمال ہوا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈھن والی کہہ مکرنی ہم تک پوری نہیں پہنچی، اس وقت ہمیں یہ بھی یاد آ رہا ہے کہ نبولی والی پہیلی جو ہم نے اپنی درسی کتب میں پڑھی تھی وہ بھی نصف ہونے کے ساتھ ساتھ تحریف شدہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ پہیلی بہت سے قارئین کو درج ذیل عبارت ہی میں یاد ہو۔

آدھا نام مال کا بتایا پورا نام نبولی
میر خسرو یوں کہیں تو بوجھ پہیلی موری

کہہ مکرنی کے ذیل میں ہم اب ایک اور پہیلی پیش کرتے ہیں جو یقیناً بہت بعد کے زمانے کی ہے، اس لئے کہ زبان بہت صاف اور شائستہ ہو گئی ہے۔

مکرنی

نہ تو بیلا ہے نہ جوہی نہ چنبیلی، کیا ہے؟
میں اگر نام بتادوں تو پہیلی کیا ہے

لفظیات پر غور کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ جو چیز چھپائی گئی ہے اس کا تعلق پھول یا خوشبو سے ہے، اگر دوسرے مصرع پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ وہی صنعت ایہام بروئے کار لائی گئی ہے، یہ گورکھ دھندہ لفظ "اگر" سے تیار کیا گیا ہے، ہم لوگ عام طور سے "اگر" کو اگربتی کے علاوہ نہیں جانتے، مگر اس کا اصل "اگر" ہے جو دوسرے مصرع میں صاف موجود ہے، یہ شاعر کا کمال ہے کہ "اگر" کو اس تیور سے استعمال کیا ہے کہ اگر نام بتا دیا جائے تو پہیلی کیا ہوئی، اس طرف فوراً ذہن منتقل نہیں ہوتا۔

دو سخنے: یہ بھی امیر خسرو کی ایجاد ہے، دو سخنے وہ کہاوت یا پہیلی ہے جس میں سوال تو دو الگ الگ ہوتے ہیں مگر دونوں کا جواب ایک ہوتا ہے، امیر خسرو نے اردو کے علاوہ اس زمانے کے رواج کے مطابق اردو اور فارسی کے اشتراک سے بھی یہ دو سخنے لکھے ہیں۔ اس صنعت کو "ذوالِلسانین" کہا جاتا ہے اور جس کی مثال میں انہی کی معروف نظم "خالق باری" پیش کی جا سکتی ہے۔ جس کے مصرعے، بیا برادر ---- آورے بھائی، بنشیں مادر ---- بیٹھ ری مائی، زبان زدِ خاص و عام رہے ہیں، ان مصرعوں کے ساتھ غالب کا ایک واقعہ یاد آ گیا، سن لیجئے:

مولوی فضل الحق صاحب مرزا غالب کے بہت دوست تھے، ایک روز مرزا ان سے ملاقات کیلئے گئے، ان کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آتا تو خالق باری کا یہ مصرع پڑھا کرتے، بیا برادر ---- آورے بھائی، چنانچہ مرزا کے استقبال کیلئے اٹھے اور یہی مصرع پڑھا، مرزا ابھی بیٹھے ہی تھے کہ اتنے میں مولوی صاحب کی طوائف دوسرے دالان سے اٹھ کر پاس آ بیٹھی، مرزا نے فرمایا: مولوی صاحب اب دوسرا مصرع بھی پڑھ دیجئے، بنشیں مادر..... بیٹھ ری مائی۔ مولوی صاحب ہنس دیئے۔

آیئے اب امیر خسرو کے دو سخنے دیکھتے ہیں:

گوشت کیوں نہ کھایا، ڈوم کیوں نہ گایا؟
جواب "گلا نہ تھا" یعنی گوشت گلا نہ تھا اور ڈوم کے گلے میں "سر" نہ تھا، ہم محاورتاً گلے میں سر نہ ہونے کیلئے بولتے ہیں کہ فلاں کے گلا نہیں ہے۔

انار کیوں نہ کھایا ---- وزیر کیوں نہ رکھا؟
جواب "دانا نہ تھا" یعنی انار بغیر دانے کے تھا اور وہ جسے وزیر رکھنا تھا عقلمند تھا گویا دانا نہ تھا۔

سنبوسہ کیوں نہ کھایا ---- جوتا کیوں نہ پہنا؟
جواب: "تلا نہ تھا" یعنی سنبوسہ جب تک نہیں کھایا جا سکتا جب تک تلا نہ جائے اور جوتا جب تک پہنا نہیں جا سکتا جب تک "تلا" نہ ہو۔

یہ دو سخنے لکھتے ہوئے راقم الحروف کے ذہن میں بھی ایک دو سخنہ آ گیا جو درج کئے دیتا ہوں۔
سرا کیوں نہ باندھا ---- پان کیوں نہ کھایا؟

جواب: "مانہ تھا" یعنی دولہا (دلہا) نہ تھا تو سہرا کس کے بندھتا؟ اور پان مانہ تھا اس لئے کھایا نہ گیا۔

اب ذوالِلسان دو سخنے ملاحظہ کیجئے:
سوداگر را چہ باید .... بوچے کو کیا چاہیے؟
جواب: "دوکان" ۔ یعنی سوداگر کو کاروبار کیلئے دوکان چاہیے اور کن کٹے کو دو کان (بوچے کا مطلب کن کٹا یا بغیر کان والا ہیں)
تشنہ را چہ می باید .... ملاپ کو کیا چاہیے؟
جواب: "چاہ" یعنی پیاسے کو کنواں (چاہ) اور ملاپ کیلئے (چاہ) محبت درکار ہے۔

شکار بہ چہ باید کرد .... قوت مغز کو کیا چاہیے؟
جواب: "بادام" یعنی شکار کس سے کیا جائے "دام سے" اور دماغی قوت کیلئے "بادام" مفید ہے۔

دو سخنے اور کہہ مکرنیوں کے مقابلے میں پہیلیاں زیادہ مشکل اور تجسس خیز ہیں، ان کا کہنا مشکل تر ہوتا ہے اور یہ شاعری کی بہترین مثال ہوتی ہیں، مذکورہ دو سخنوں کو اگر ہم نظر غائر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ صنعت ایہام کی معکوس صورت ہے جو شاعر نے جولانیٔ طبع سے خلق کی ہے۔ درج ذیل پہیلیوں میں بہت سی تو بہت آسان اور ہم سب کی سنی ہوئی ہیں مگر بعض ان میں سے نادر روزگار بھی ہیں اور مشکل بھی۔ پہیلیوں کے اعتبار سے بھی اور شاعری کے حوالے سے بھی، ان میں علوئے فکر بھی اوجِ کمال پر نظر آتی ہے، ملاحظہ کیجئے:

پہیلی: اتی سی ہلدی سارے گھر میں مل دی
جواب: "دیا" لالٹین بلحاظ زمانہ بلب بھی شمار ہو سکتا ہے، ہلدی اور روشنی زرد رنگ سے مشابہ ہیں اور محیط ہونے کی قدرت رکھتی ہے۔

پہیلی: کٹورے پہ کٹورا بیٹا باپ سے بھی گورا
جواب: ناریل

پہیلی: اتی سی بدھیا گز بھر کی چٹیا
جواب: سوئی

پہیلی: ہری تھی من بھری تھی، نو لاکھ موتی جڑی تھی، راجہ جی کے باغ میں دو شالہ اوڑھے کھڑی تھی۔
جواب ہے "بھٹا" جسے چھلی بھی کہتے ہیں، ذرا اس پہیلی کے محاکات کا کمال دیکھیے، پہیلی کی مناسبت سے سارے لوازم پر غور کیجئے، استعارات پر نظر ڈالئے جی خوش ہو جائے گا۔ ہری من بھری، نو لاکھ موتی جڑی، راجہ جی کا باغ، دو شالہ اوڑھنا، سبحان اللہ۔ پہیلی تو شاید آسان ہو مگر ایسی پہیلی تخلیق کرنا ایک زیرک دماغ اور نابغۂ روزگار شخص کا کام ہے۔ ایک اور پہیلی دیکھیے

سیتل پاٹی بھی کوئی سوتا نہیں، راجہ جی مرا کوئی روتا نہیں

صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ اودھ کے ماحول کی پہیلی ہے، سیتل پاٹی، چٹائی کے چکنے چمکدار فرش کو کہتے ہیں، اس پہیلی میں بھی تضاد کا مذکور ہے، Snow والی پہیلی کی طرح اس کے بھی دو جواب ہیں، ایک "دریا" اور دوسرا "سانپ"
راجہ کے مرنے پر رونا عام رواج ہے، نہ رونے کی اگر کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو کہ راجہ ظالم تھا اور ظالم کے مرنے پر رویا نہیں جاتا، سانپ موذی جانور ہے، جس (ہیں) بھی سانپ کی طرف اشارہ کرتی ہے، بستر سونے کیلئے ہوتا ہے، مگر جان کے خطرے کے باعث سطح آب جو دھوپ میں چمکتا ہوا بستر معلوم ہوتی ہے اس پر کوئی نہیں سوتا، اب ذرا یہ دو پہیلیاں ملاحظہ کیجئے:

پہیلی: زن پردہ نشین واقف نہیں باہر نکلنے سے
مگر فرصت نہیں ملتی اسے دن رات چلنے سے

زن پردہ نشین سے پتہ چلتا ہے کہ جواب جو اس کا ہوگا، وہ چیز مونث ہوگی، تضادات اس میں بھی وہی ہیں کہ باہر تو نکلتی نہیں، تو پھر دن رات چلنا چہ معنی دارد؟ زن پردہ نشین استعارہ ہے، ذہن پر زور ڈالنے سے ہو سکتا ہے کہ دن رات چلنے کی مناسبت سے ہمارا ذہن گھڑی کی طرف جائے کہ ہر وقت چلتی بھی ہے اور گھڑی اسم مونث بھی ہے مگر پردہ نشین کا جو ٹکڑا پہیلی میں ہے گھڑی اس پر پوری نہیں اترتی، تو پھر اس کا کیا جواب ہوگا؟ اس کا جواب ہے "نبض"۔ یہ بھی تخیل اور تلاش کی ایک اعلیٰ مثال ہے، ہمیں گھڑی کے ذکر پر مومن خان مومن کی پہیلی یاد آگئی جو گھڑیال کے بارے میں ہے، اسے بھی سن لیجئے۔ مومن نے ویسے تو بہت سی پہیلیاں کہی ہیں مگر ریکارڈ پر اکثر اس پہیلی کا ذکر ملتا ہے، یہ چھ مصرعوں کی پہیلی ہے:

نہ بولے وہ جب تک کہ کوئی بلائے
نہ لفظ اور معنی سمجھ میں کچھ آئے
نہیں چور، پر وہ لٹکتا رہے
زمانے کا احوال بکتا رہے
شب و روز غوغا مچایا کرے
اسی طرح سے مار کھایا کرے

(کوک سے چلنے والا گھڑیال "کلاک")
پہیلی کے سارے لوازمات اور اشارے تو ہیں مگر خوبصورت شاعری نہیں، لگتا ہے بہت عجلت میں لکھی گئی ہے۔ عجلت کی بات ہم نے اس لئے کہی کہ مومن جیسا زیرک اور خوش فکر شاعر اگر توجہ دیتا تو یقیناً شعری عنصر بھی خاصہ ابھر سکتا تھا۔ پہیلی:

اک درزی نے جامہ سیا بن تاگے بن سوئی
جگہ جگہ پر پیوند لگے یہ کیا حکمت ہوئی

وہی تضادات کی کارفرمائی ہے، اس کا جواب "سانپ کی کینچلی" ہے اب اس جواب کو ذہن میں رکھ کر غور کیجئے کہ کتنی بلیغ، خوبصورت اور صاف پہیلی ہے۔ کینچلی بلاشبہ اک جامہ ہے، جنہوں نے اسے دیکھا ہے وہ بتائیں گے کہ اس میں بالکل سانپ کی اپنی جلد کی طرح خانے خانے سے بنے ہوتے ہیں جنہیں پیوند کہا گیا ہے۔ اس کی تیاری میں سوئی تاگے کا بھی کوئی دخل نہیں ہوتا جو عقل کیلئے حیران کن ہے۔ جس پر شاعر نے اچنبھے کا اظہار کیا ہے، زبان کو دیکھیے تو ترقی یافتہ اردو لگتی ہے بالکل وہی جیسی ہم لوگ آج کل بولتے ہیں، مراعات النظیر تمام تر موجود ہے، یعنی درزی، جامہ، سینا، سوئی تاگا، پیوند بلکہ میرے خیال میں

یہ پہیلی مراعات النظیر کی مثال کیلئے بہترین نمونہ ہے۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ امام بخش ناسخ نے بہت سے بے معنی و مطلب شعر کہہ رکھے تھے اور جب کوئی اجنبی یا نیا آنے والا شعر کی فرمائش کرتا تو اول اول تو ٹال جاتے مگر اصرار بے حد پر یہ دیکھنے کیلئے کہ آیا وہ شعر سمجھتا بھی ہے وہی بے معنی و مطلب شعر سناتے اور اگر سننے والا داد دیتا تو سمجھ جاتے کہ تہی ذوق ہے اور کچھ نہ سناتے، ان اشعار میں ہم نے وہ شعر بھی دیکھا ہے جو ہم اپنے بچپنے سے پہیلی کے طور پر سنتے آئے ہیں، تذکرہ نگاروں کے اس دعوے کی تردید کیلئے ہمارے پاس کوئی جواز نہیں مگر اس میں ہمیں کوئی شک نہیں کہ یہ شعر ایک بہترین اور خوبصورت پہیلی ہے۔ پہیلی:

ٹوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی بام میں
مورچہ مخمل میں دیکھا آدمی بادام میں

اس پہیلی کا جواب "آنکھ" ہے، بہترین منجھی ہوئی زبان تضادات اور استعارے خوبصورت اور قرین فہم مگر چونکا دینے والے جواب کو سامنے رکھ کر اس پر غور کیجئے۔ دریا کی کلائی کا ٹوٹنا یعنی رونا، آنسوؤں کا نکلنا، ان کا پلکوں پر الجھنا، آنکھ کی پتلی کا پپوٹا جو اگر الٹ کر دیکھئے، جو ہم لوگ بچپنے میں اکثر کرتے بھی تھے، سرخ مخمل کی طرح ہوتا ہے اور پتلی کا وہاں ہونا، پوری آنکھ کو بادام سے تشبیہ دینا شعراء کے یہاں عام ہے۔ آنکھ کے اندر دیکھنے والے آدمی کا عکس نظر آنا، یہ سب باتیں ایک مکمل اور نادر پہیلی ہونے کی دلیل ہیں اور ہمارے نزدیک یہ قطعاً بے مطلب نہیں ہو سکتا ہے کہ اگر یہ شعر ہوتا تو بے مطلب ہوتا مگر یہ شعر تو ہے نہیں یہ تو پہیلی ہے۔

درج ذیل پہیلی معروف عالم دین مفتی احمد علی صاحب قبلہ کی طرف منسوب ہے، منسوب کا لفظ ہم نے احتیاطاً استعمال کیا ہے، گو یہ بات کہ وہ بے پناہ شعری صلاحیت رکھتے تھے ہمارے ذاتی علم میں ہے، پہیلی:

بدلہ نیکی کا ہوا خواہوں سے یہ پایا ہے
بے خطا مجھ کو رسن باندھ کے لٹکایا ہے

پہیلی کا جواب "فرشی پنکھا" ہے جسے چھت پر لٹکایا جاتا ہے اور دوسرے لوگ یا ملازمین کھینچتے ہیں اور پنکھے کے نیچے بیٹھنے والے ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہیں، وہی تضادات کا بیان۔ ہوا خواہوں کا مطلب محاورتاً دوست اور طرفدار کے ہیں لیکن اس کا لفظی ترجمہ ہوگا "ہوا کے طلبگار" اب ذرا پہیلی کو غور سے دیکھئے تو لطف شعر آ جائے گا۔ اس پہیلی کے مصرع ثانی کو ذرا مومن کی پہیلی کے مصرعے "نہیں چور پر وہ لٹکتا ہے" سے موازنہ کر کے دیکھئے کہ یہ مصرع کتنا فصیح ہے اور بلیغ ہے اور یہ وضاحت آپ کو لفظ "چور" اور "بے خطا" کے تقابل سے ہو جائے گی۔ ہوا خواہوں کا ٹکڑا وہی صنعت ایہام ہے اور اب یہ پہیلی دیکھئے

چلتا ہے پاؤں پاؤں پہ تھکتا کبھی نہیں
رہتا ہے ہاتھوں ہاتھ چلتا کبھی نہیں
کر دے گا ریزہ ریزہ وہ جس شے کو پائے گا
سب اس کا جھوٹا کھائیں وہ ہرگز نہ کھائے گا

دونوں پہیلیاں ہمیں محترمہ نسیم بانو سلمہا کا عطیہ ہیں، اس پہیلی کا جواب؟ مگر ذرا ٹھہرئیے پان کھا کر آجائیں تو بتاتے ہیں، لیجئے یہ تو آپ نے خود بوجھ لیا، جی ہاں اس کا جواب "سروتہ" ہی ہے، اس میں بھی وہی تضادات موجود ہیں، چلنا اور نہ تھکنا، ہاتھوں ہاتھ رہنا اور نہ چلنا، سب اس کا جھوٹا یعنی منہ سے نکلا ہوا کھائیں اور یہ نہ کھائے، پہیلی پہیلی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ شعری مرقع بھی ہے۔ سروتہ کا ذکر آیا تو ایک اور پہیلی سن لیجئے۔ یہ ایک قدیم پہیلی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کن کن مراحل سے گزری ہے:

طوطا، بگلا، لوا، بٹیر
ان چاروں کو لائے گھیر
اے سکھی ہم میں ہے ایسا کینا
ان چاروں کے خون کو پینا

ہم حتمی طور پر تو نہیں کہہ سکتے مگر اس پہیلی کی ساخت لفظیات اور زبان سے گمان ہوتا ہے کہ یہ پہیلی امیر خسرو کی ہے۔ جواب ہے اس کا "پان"۔ اگر یہ امیر خسرو کی پہیلی یا اس دور کی پہیلی ہے تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں پان آج سے آٹھ سو سال پہلے بھی مقبول اور رائج تھا۔ یعنی یہ کہا بھی جا سکتا ہے کہ پہیلیاں رسم و رواج کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ دیکھئے شاعر نے پان کے لوازمات کی طرف کس طرح استعارہ کیا ہے:

طوطا: پان جو ہرا ہوتا ہے، بگلا: چونا جو سفید ہوتا ہے، لوا: یہ ایک کتھئی رنگ کا پرندہ ہے، بٹیر: چھالیہ کے رنگ کا ایک پرندہ ہے۔ پھر جب پان کھایا جاتا ہے تو پیک بنتی ہے جو خون کے رنگ کی ہوتی ہے۔ یہاں ہم معروف مزاحیہ شاعر ساغر خیامی کے والد گرامی مرحوم مولوی للن صاحب جن کا تخلص شاعر تھا اور بے پناہ نظم کہتے تھے، ان کا ایک شعر نقل کرتے ہیں۔ اس امید پر کہ آپ بھی اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔ یہ شعر ان کی ایک نایاب نظم "پان کی گلوری" کا مقطع ہے:

اس پان کا رہے گا شاعر جنون برسوں
کھائی ہے اک گلوری تھوکیں گے خون برسوں

اب ہم کچھ فارسی پہیلیوں کا ذکر کرتے ہیں، فارسی، اردو اور انگریزی کے مقابلے میں قدیم تر زبان ہے، میرے خیال میں اگر انگریزی اور اردو زبانوں کی تاریخ دیکھی جائے تو دونوں کی تاریخ خاصی مطابقت رکھتی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ انگریزی سو ڈیڑھ سو سال زیادہ پرانی ہونے کے ساتھ خوشحال ماحول میں پلی بڑھی ہے اور اردو فاقہ کش اور بدحال ماحول میں، انگریزی نے آزاد اور حاکمانہ فضاؤں میں سانس لی ہے جبکہ اردو نے غلامی کا دور دیکھا۔ اردو کی طرح انگریزی کی اصل بھی کچھ نہیں یعنی دونوں زبانوں کی حیثیت ریختہ کی سی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ المیہ ہے کہ اردو بولنے والے خود اردو کے درپے آزار رہے ہیں اور اگرچہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا پھر بھی اس کو مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا ہے جس کی بنا پر یہ تشدد کا شکار رہتی ہے۔ خیر چونکہ یہ ہمارا اس وقت کا موضوع سخن نہیں اس لئے ہم اس جملہ معترضہ پر چھوڑ کر بات کو آگے بڑھاتے ہیں، اب فارسی کی پہیلی دیکھئے

یکے مرغ دیدم نہ بال و نہ پر
پرواز زمیں تا فلک بے خطر

غنیم سکوں دشمن وری
ہمیشہ خورد گوشت آدمی

یعنی ایک پرندہ ہے جس کے نہ بال ہیں نہ پر لیکن وہ زمیں سے آسمانوں تلک بے خوف و خطر پرواز کرتا ہے۔ سکون و شادمانی کا دشمن ہے اور آدمی کا گوشت اس کی خوراک ہے، یہ پہیلی محاکات، استعارات اور صنعت تضاد کا نادر نمونہ ہے اور پہیلی ہونے کے ساتھ ساتھ علوئے تخیل کا ایک بہترین شہ پارہ ہے۔ اس کا حل "فکر" ہے۔ اب اگر جواب کی روشنی میں ہم معکوس سفر کریں تو دیکھیں گے کتنی جامع اور فلسفیانہ پہیلی اختراع کی گئی ہے۔ فکر کا زمین سے آسمان تک اڑنا، اڑنے کی رعایت سے پرندہ کہنا، پرندہ ہوتے ہوئے بے بال و پر ہونے کا تحیر، خوشی اور سکون کا دشمن ہونا اور آدمی کا گوشت کھانا یعنی جس آدمی کو کوئی فکر لاحق ہو جائے اس کا گوشت گھلنا عام بات ہے۔ اس کو ذہن میں رکھ کر اگر ہم Snow والی پہیلی کو دیکھیں تو ہمیں ایک انداز فکر کی ہم آہنگی بھی نظر آتی ہے۔ پہیلی:

چیست آں چیست کہ مانند پری ناز کند
بے پر و بال پرد بے دہن آواز کند

یعنی وہ کیا ہے کہ پریوں کی طرح ناز کرتی ہے، بغیر بال و پر کے اڑتی ہے اور بغیر منہ کے آواز کرتی ہے، اس کا جواب ہے "پتنگ"۔ ذرا پہیلی کی طرف لوٹئے کہ شعری کمالات کے علاوہ بھی مخترع نے عبارت میں پہیلی کے سارے لوازم بیان کئے ہیں۔ پری کی طرح ناز کرنا، بغیر بال و پر کے اڑنا، جب اسے زور سے ادھر ادھر کھینچا جاتا ہے تو اس کے کاغذ اور فضا میں موجود ہوا کے ٹکرانے سے آواز پیدا ہونا، یہ سب باتیں ہم سب کے مشاہدے کی ہیں، وہی محیر العقول تضادات اور استعارات کا تانا بانا جو پہیلی کا گر ہیں طریق احسن بیان کئے گئے ہیں۔ جن لوگوں نے بذات خود پتنگ اڑائی ہے اس پہیلی کا لطف ان کیلئے کئی گنا زیادہ ہے۔ اب یہ فارسی کی آخری پہیلی ملاحظہ کیجئے جسکے بعد ہم اپنی زبان سے تاریخ گوئی، معما اور تیج کی مثالیں پیش کریں گے۔ پہیلی:

یکے اسپ عجب دیدم کہ شش پا و دو سم دارد
عجائب تر ازیں بشنو، میان پشت دم دارد

معنی یہ ہوئے کہ ایک عجیب گھوڑا دیکھا کہ جس کے چھ پیر اور دو سم ہیں اور یہی نہیں بلکہ عجیب ترین بات یہ ہے کہ اس کی پیٹھ کے درمیان میں دم ہے۔ آپ کہیں گے کہ مشکل پہیلی ہے، کچھ اتا پتا تو، اتنا پتا ہے کہ یہ استعمال کی چیز ہے، اب دیکھئے کہ استعمال میں کون سی چیزیں ہیں جو ٹانگیں رکھتی ہیں یا ان حصوں کو ٹانگوں سے تشبیہ دی جاسکے۔ میز، چپائی، اسٹول، پلنگ، صوفہ، تخت، اگر تخت، صوفہ اور پلنگ یا مسہری کی چھ ٹانگیں ہوں بھی تو وہ کیا چیز ہوگی جنہیں سم کہا جاسکے اور پھر پشت کے درمیان دم کہاں سے لائیں گے؟ یقیناً یہ کوئی اور چیز ہے، جی ہاں آپ ٹھیک پہنچ گئے، آج کل کے بچے اسے شاید نہ بوجھ سکیں اس لئے کہ اس کی شکل اب کافی تبدیل ہو چکی ہے۔ اور ہم جس ترازو کو جانتے تھے وہ ان میں سے بہت سوں نے نہ دیکھی ہوگی۔ مخترع نے ترازو کو گھوڑے سے استعارہ کیا ہے، ہر پلڑے کی تین رسیوں کو پاؤں کہا ہے اور جس ڈوری سے اس کو اٹھاتے ہیں اور جو درمیان میں ہوتی ہے اسے دم کہا جو واقعی دم کی طرح ہوتی ہے۔ ہم اس پہیلی کے حل کی طرف اسی دم کے راستے پہنچے تھے۔ کیسی کتنی جامع اور مرموز پہیلی ہے۔ اگر آپ اس پہیلی کو Fantasize کر سکیں یعنی تصورات کی مدد سے ایک ایسا گھوڑا تشکیل کر سکیں جیسا اس پہیلی میں ہے تو ترازو کی شکل پردۂ تخیل پر ابھر کر آجائے گی، یہ پہیلی بھی بنیادی محیر العقول تضادات کا نادر نمونہ ہے۔

اردو شاعری میں معما بھی ایک قسم کی صنعت اور صنف ہے اور اسی طرح تیج بھی ہے، تاریخ گوئی اگرچہ براہ راست معما کی تعریف میں نہیں آتی لیکن جیسے ہم نے کچھ شعروں میں چیستانی عناصر کی نشاندہی کی ہے اسی طرح بعض تاریخیں بھی ایسا ہی چیستانی عنصر رکھتی ہیں۔ تاریخ گوئی میں صنعت تخرجہ اور تعمیہ میں جہاں زیادہ و پیچیدہ مصرعے لکھے گئے ہیں۔ مولانا آزاد نے انہیں بھی تاریخ گوئی کی صنعت سے ہٹ کر معما گردانا ہے، مثلاً مومن خان مومن نے اپنے والد کی تاریخ وفات یوں کہی ہے:

بہ من الہام گشت سال وفات
کہ غلام نبی بہ حق پیوست

اس میں اگر غلام نبی کے اعداد میں حق کے اعداد ملا دیں تو پورا پورا سال وفات نکل آئے گا جو ۱۲۳۱ھ تھا پھر اپنی صغیر سن دختر کی تاریخ مرگ یوں کہی تھی:

خاک بر فرق دولت و دنیا
من فشاندم خزانہ در سر خاک

اس میں اگر خزانہ کے اعداد میں سر خاک یعنی "خ" کے عدد جمع کریں تو ۱۲۶۳ھ نکلے گا جو سال رحلت ہے۔ چونکہ یہ تاریخیں فوری طور سے سمجھ میں نہیں آتیں اس لئے بھی اور اس لئے بھی کہ بقول مولانا آزاد اصول فن تاریخ گوئی کی رو سے نو سے زیادہ اعداد کا تخرجہ اور تعمیہ قدماء نے جائز نہیں سمجھا ہے۔ مولانا آزاد نے ان کو معما قسم کی چیز کہا ہے۔ میرے خیال میں اس اصولی قدغن کی کوئی خاص اہمیت نہیں، وہ اس لئے کہ اولاً ہو سکتا ہے کہ یہ اصول مرتب کرتے وقت مرتبین کے سامنے صرف ایسی مثالیں ہوں گی جن میں نو اعداد کا تخرجہ یا تعمیہ کیا گیا ہوگا۔ دوئم یہ کہ مومن خان مومن اس پائے کے شاعر تھے جو ان اصولوں کو وسعت دینے کے مجاز سمجھے جا سکتے ہیں، سوئم اس لئے بھی کہ بعد ازاں اس اصول کی پابندی نہیں کی گئی اور ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن میں نو سے زیادہ اعداد کا تخرجہ یا تعمیہ کیا گیا ہے، چوتھے یہ کہ جب نو کے اعداد تک کے تخرجہ کیا جا سکتا ہے تو اس سے بڑے اعداد میں کیا خرابی ہے؟ جب کہ حروف ابجد میں ایک ہزار تک کی قدر کے حروف ہیں اور پھر نو اعداد کے تخرجہ یا تعمیہ کے تعین کی بنیاد کیا ہے؟ خیر یہ بھی جملہ معترضہ درمیان میں آگیا جس کا ہمارے مضمون میں اس کے سوا کوئی ربط نہیں کہ ع مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات، تاریخ گوئی کے بعد اب آتے ہیں، "معما کی طرف"۔

مثال: سر مونڈی گھوڑی گجراتی، یہ صرف ایک مصرعہ ہے اگر آپ اسے مصرعہ تسلیم کریں تو لیکن چونکہ انشاء اللہ خان انشاء کی تخلیق ہے اور شیخ قلندر بخش جرات کے بارے میں ہے اس لئے ہم نے اسے مصرعہ تسلیم کر لیا ہے، یہ اچھی خاصی پیچیدہ پہیلی ہے۔ اگرچہ معما کے ذیل میں وہ سب پہیلیاں بھی آتی ہیں جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، ہم نے یہاں اس کا الگ سے ذکر اس کے اچھوتے پن کی وجہ سے کیا، ایسے مضموں میں اشارے کو پہچان کر اگر عمل کیا جائے تو حل برآمد ہو جاتا ہے جیسا کہ اس میں سر مونڈی اور گھوڑی یعنی بے سر و پا، اب اگر گجراتی کا سر "گ" اور پیر "ی" کاٹ دیں تو جرات رہ جائے گا۔ لطف اور ذہانت

اس میں یہ ہے کہ جرات کی والدہ کا نام مجراتی تھا۔ ایک اور مثل بھی ملاحظہ کیجئے، یہ مومن خان مومن کے ایک دوست مہتاب رائے کے بارے میں ہے اور بہت ہی انوکھا ہے۔ اس میں بھی نسخہ کی ترکیب استعمال موجود ہے:

نے کیوں کر کہ ہے ہر کار الٹا
ہم الٹے بات الٹی یار الٹا

یہ معمہ اردو شاعری میں نادر روزگار ہے اور شاعری کی تلاش اور پرواز تخیل کا پتہ دیتا ہے، حل اس کا الٹنے سے برآمد ہوگا، یعنی اگر ہم لفظ ہم، بات اور یار کو الٹا پڑھیں تو ہم "مہ" ہو جائے گا، بات "تاب" اور یار "رائے" میں تبدیل ہو جائے گا اور اس طرح مہتاب رائے کا نام حاصل ہو جائے گا۔

تیج: عموماً اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں، اول یہ کہ اک قطعہ یا نظم ایسی کہی جائے جس میں اہتمام رکھا جائے کہ مطلوبہ نام کے حروف قطعہ یا نظم کے پہلے مصرعہ کا آغاز بالترتیب نام کے حرف سے ہو، مثلاً اگر کسی کا نام احمد علی ہے تو قطعہ کے پہلے مصرعہ کا پہلا لفظ الف سے شروع ہوتا ہو، دوسرا "ح" سے اور تیسرا میم سے علیٰ ہذا القیاس، حتیٰ کہ نام مکمل ہو جائے، یہ طول عمل ہے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کوئی مصرع یوں کہا جائے کہ مطلوبہ نام معنوی حیثیت سے نظم کر دیا جائے جیسے نواب الٰہی بخش عارف جو غالب کے خسر تھے کہ تیج یوں ہے:

ع "مجھ گنہگار کو الٰہی بخش" یہ مومن کی اصلاح کے بعد یوں ہو گیا "میں گنہگار ہوں الٰہی بخش" اس اصلاح کی کیا ضرورت تھی ہم نہیں کہہ سکتے۔

شاہ نصیر نے ایک تیج ایک طوائف کا جس کا نام نجیا تھا کہا، اس کا پس منظر سن لیجئے پھر وہ شعر پیش کریں گے۔ ایک ہندو منشی جی ایک مسلمان طوائف جس کا نام نجیا تھا پر عاشق ہو گئے اور شادی کرنے کیلئے مسلمان ہونا پڑا کہ وہ اپنا دین چھوڑنے پر راضی نہ تھی، شاہ نصیر نے اس خبر کو سن کر یہ شعر کہا:

جس طرف تو نے کیا ایک اشارہ نہ جیا
نجیا تو تری چشم کا مارا نہ جیا

نجیا میں "و" کو اختفاف کر کے یہ تیج حاصل ہوا ہے، تیج کو ہم نے اس لئے پہیلی، معما، تخارت یا چیستان کے زمرے میں گنا ہے کہ اس میں بھی پہیلی کی طرح نتیجہ یا حل تک پہنچنے کیلئے اشارہ Clue کی ضرورت ہوتی ہے، دماغ پر زور دینا پڑتا ہے اور شعر، مصرعے یا نظم سے شعر کے مطلب مقصود نہیں ہوتے بلکہ جواب مقصود ہوتا ہے، خواہ نام کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔

تمت بالخیر

* * *

وہ مختلف ہے مگر اس کا ظاہر و باطن
منافقوں کی طرح مختلف نہیں ہرگز

افتخار نسیم
کا نیا شعری مجموعہ
"مختلف"

اردو شاعری میں بہت ہی حساس جذبوں کا بیش بہا اضافہ ہے،
جن کے سچے اور برملا اظہار نے لفظوں کو توقیر بخشی ہے۔

سنگ میل
پبلی کیشنز لاہور

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل
عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

عہدِ یوسفی اور یوگن ویلیا کی چھاؤں

علی منور عدیم

نوٹ: یہ مضمون حلقہ اربابِ ذوق نیویارک کی ایک تنقیدی نشست میں پڑھا گیا تھا اس پر شرکائے نشست کے تبصرے اور تنقید حلقے کے پریس ریلیز میں قارئین تک پہنچ چکے ہیں، اب میرا اس مضمون کے بارے میں مزید کچھ کہنا مناسب نہیں ہے مجھے دو باتیں عرض کرنی ہیں۔ اس مضمون پر حلقے کے شرکاء نے بڑی تعمیری تنقید کی اور میں اس کیلئے ان کا مشکور ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اس مضمون میں جو بات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ بات قریباً نوے پچانوے فیصد اردو ادب کے طنز و مزاح پر بھی صادق آتی ہے جاگیر دارانہ اور درباری ادبا نے محض اشرافیہ کے تفننِ طبع کیلئے تخلیقات کی ہیں اور معاشرے کی خرابیوں کی اصلاح کا کام جو طنزیہ، مزاحیہ ادب سے لیا جانا چاہیے اسے بہت کم مزاح نگاروں نے اہمیت دی ہے، اس مضمون کی روح اسی نکتے کا اظہار کیا۔

کتابیں تین طرح کی ہوتی ہیں، بچپن میں پڑھنے والی جوانی میں پڑھنے والی اور بڑھاپے میں پڑھنے والی، بچپن میں پڑھنے والی کتابوں کو بڑوں سے چھپ چھپ کر پڑھا جاتا ہے، جوانی میں پڑھنے والی کتابیں طاقوں میں دبک کر، کمرہ بند کر کے پڑھی جاتی ہیں، بڑھاپے میں پڑھنے والی کتابوں کا سارا لطف با آوازِ بلند قرأت سے پڑھنے میں ہوتا ہے۔

کتاب پڑھنے کے بڑے فوائد ہیں، بچپن میں پڑھنے والی کتابوں کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ امتحانوں میں فیل ہونے کے کام آتی ہیں، امتحانوں میں مستقل فیل ہونے والے بچے عملی زندگی میں بڑے کامیاب ہوتے ہیں، جوانی میں پڑھنے والی کتابیں عاقبت خراب کرنے کے اور بڑھاپے میں پڑھنے والی کتابیں خراب کی گئی عاقبت سنوارنے کیلئے ہوتی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے جوانی میں عاقبت خراب نہ کرلی گئی ہو تو پھر بڑھاپا بے کیف ہو جاتا ہے، بڑھاپے میں پڑھنے کیلئے کچھ بھی نہیں رہتا۔

اردو کے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی کتابیں زندگی کے تینوں ادوار بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں پڑھی جا سکتی ہیں، ہر دور میں یکساں فائدہ دیتی ہیں اور بچپن سے بڑھاپے تک ایک سی تاثیر رکھتی ہیں، پڑھ کر زندگی کے ہر دور میں دنیا سنواری اور عاقبت خراب کی جا سکتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی موجودہ عہد کے بہت بڑے مزاح نگار ہیں، ڈاکٹر ظہیر فتح پوری تو اس طرح کہتے ہیں کہ آج ہم مزاح کے "عہدِ یوسفی" میں رہ رہے ہیں، اس بات سے تو ہمیں بھی اتفاق ہے کہ ان دنوں ہم "عہدِ یوسفی" میں رہ رہے ہیں، بڑوں نے بتایا ہے کہ قربِ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ وہ بہت بد عہد ہو گا، حالانکہ کسی نے یہ نہیں بتایا تھا اس عہد کا نام "عہدِ یوسفی" ہو گا اب یوسفی صاحب کی کتابیں اور تحریریں پڑھ کر اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے یہ عہد کتنا خراب ہو گا ہمارا مطلب کتابیں خراب ہونے سے نہیں ہے، عہد خراب ہونے سے ہے۔ یوسفی صاحب کی ہر تحریر قربِ قیامت کی نشانی ہے، یوسفی صاحب نے عہدِ یوسفی کی ہر خرابی ایک ایک کر کے گنوا دی ہے، اب تک قربِ قیامت کی نشانیوں کی پانچ جلدیں مختلف ناموں سے ظہور میں آچکی ہیں، بلکہ باقاعدہ چھپے کاغذ پر شائع بھی ہو چکی ہیں، ہو سکتا ہے یوسفی صاحب اب چھٹی نشانی کی تیاری میں لگے ہوں، ویسے وہ ہماری دنیا کو "عہدِ یوسفی" تک لے آئے ہیں لگتا ہے اپنی تحریروں سے جیتے جی قیامت بھی لا کر چھوڑیں گے۔

ہم نے یوسفی صاحب کو پڑھا ہے، زندگی کے ہر دور میں پڑھا ہے یاد ش بخیر بچپن کا وہ زمانہ جب نصاب میں خطوطِ غالب اور میر کے لبوں کی نازکی والے اشعار پڑھ لینے کے بعد کچھ مزیدار چیزیں پڑھنے کا جی کرتا تو بچپن کی حدود پھلانگ کر نکل بھاگنے والوں کی طرح ہم سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی کے علاوہ مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کی طرف لپکے۔ خاص کر بیزر اور ماتا ہری کے معاشقات و واردات عشق کا وہ حصہ جو وہ گھر سے باہر گزارتے ہیں، پڑھنے بیٹھ جاتے دو چار صفحے پڑھنے کے بعد یہ سوچ کر رکھ دیتے کہ گھر کے بڑے دیکھ لیں گے تو جوانی آئے نہ آئے قیامت ضرور آجائے گی۔ یہ وہ موضوعات ہیں جن کی اجازت آئینِ ریاست پاکستان کے قانون کے مطابق صرف بڑے لوگوں کیلئے ہمارا مطلب ہے۔ بالغ افراد کیلئے ہے، جوانی میں پڑھنے والی کتابوں کو اٹھایا، بیزر اور ماتا ہری کے کرداروں کا اپنے اطراف کے کرداروں سے موازنہ کیا تو دو چار صفحوں بعد ہی یہ سوچ کر کتاب بند کر دی ان کتابوں میں جو حکمت ہے اس کو سمجھنے بیٹھ گئے تو جوانی کے میٹھی شو کا کیا ہو گا، سارا مزا کرکرا ہو جائے گا، پہلے اپنے اطراف کے زندہ کرداروں سے لطف لے لیں، یوسفی صاحب کی کتابیں تو بعد میں بھی پڑھ لیں گے، کیونکہ یوسفی صاحب کی تحریروں میں بڑے باریک نکات ہیں، انہیں سکون سے پڑھنا چاہیے، یہ کتابیں، ابھی نہیں ذرا پکی عمر میں پہنچنے پر مزہ دیں گی اس عمر میں ان سے محظوظ بھی ہو لیں گے اور عاقبت بھی سنوار لیں گے لیکن اب یوسفی صاحب کی کتابیں پڑھتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ ان کو پڑھنے کا زمانہ کب کا گزر گیا، ان کتابوں کو پڑھنے کا لطف اور ثواب تو بچپن یا جوانی میں تھا، بہت دیر ہو گئی ان کتابوں میں جن برائیوں سے پرہیز کرنے کو کہا گیا تھا وہ سب ہم سے سرزد ہو چکی ہیں اور اب تک جتنی عاقبت یوسفی صاحب کی کتابیں نہ پڑھ کر تباہ ہو چکی ہے وہ پڑھ کر دو چار دن میں سنورنے سے رہی، کاش ہم نے یہ کتابیں بہت پہلے پڑھی ہوتیں تو اس عمر میں عاقبت سنوارنے کیلئے نیک کاموں کے کرنے کی اتنی جلدی نہیں ہوتی، اس طرح نہیں فائدہ یہ ہوا ہے عاقبت نہ سنوری ہوئی لگتی ہے اور نہ پوری طرح بگڑی ہوئی لگتی ہے، لگتا ہے ہماری بقیہ زندگی بھی عام پاکستانیوں کی طرح عالمِ برزخ ہی میں کٹے گی، اللہ نے پاکستانیوں کے اعمال کا ثواب، گناہ اور یوم حساب کا فیصلہ خود ان ہی کی صوابدید پر چھوڑ رکھا ہے۔ ہم بھی عام اربابِ وطن کی طرح نہ جنت کے رہے، نہ دوزخ کے رہے۔ کام دوزخ کے تمنا جنت کی، نتیجہ آدھے ادھر،

آدھے ادھر۔

یوسفی صاحب کا طنز و مزاح اردو کا ادب عالیہ شمار ہوتا ہے یوسفی صاحب کا طبقہ بھی ہمارے طبقات کا طبقہ عالیہ ہی شمار ہوتا ہے۔ یوسفی صاحب کے طنز و مزاح سے پورا پورا لطف لینے کیلئے ایک مخصوص مزاج اور کلچر کا ہونا ضروری ہے، یہ مزاج اور کلچر یوسفی صاحب کی کتابوں کے علاوہ صرف جمخانہ کلب میں مل سکتا ہے اور جمخانہ کلب میں نیلے پیلے سکولوں سے نکلے اردو اس طبقے کے صرف دو فیصد افراد کو داخلے کی اجازت ہے اس لئے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یوسفی صاحب کا مزاح اردو ادب کے صرف دو فیصد ادب عالیہ والے ادب میں شمار کیا جانا چاہیے، یہ ادب ہمارے معاشرے کے باقی اٹھانوے فیصد عوام کیلئے نہیں ہے اور نہ یہ ان اٹھانوے فیصد کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے ایک مضمون "سیزر، ماتا ہری اور مرزا" میں کسی بوگن ویلیا کی بیل کا ذکر ہے جس کی چھاؤں میں سیزر نام کا کتا آرام کیا کرتا تھا، ہمارے ہاں کی اشرافیہ کلاس کے کتے جس طرح بوگن ویلیا کی چھاؤں میں آرام کرتے ہیں۔ شاید اتنا آرام تو اپنے زمانے میں خود اصلی "رومن بادشاہ سیزر" کو بھی نصیب نہیں ہوا ہوگا۔ یہ بوگن ویلیا نام کی بیل کس طرح کی ہوتی ہے اس سے یوسفی صاحب ہی واقف ہو سکتے ہیں یا ان کے ممدوح سیزر حضرات و حاضرات ہو سکتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے کے ہم جیسے اٹھانوے فیصد لوگ تو کڑوے نیم اور کانٹے دار بیریوں کی چھاؤں میں پلے بڑھے ہیں، اس طبقے کے گھروں میں پہلی بات تو یہ کہ آنگن ہی نہیں ہوتے اور اگر آنگن ہیں تو ان میں "بوگن ویلیا کی بیل" نہیں ہوتی، کدو کی بیل ہوتی ہے یا پھر گھر کی سگھڑ بیبیاں ان آنگنوں میں دھنیا، پودینہ، مرچیں اور ٹماٹر لگاتی ہیں، کیونکہ ان گھروں کا مسئلہ آٹا دال چاول کی مہنگائی کے بعد سبزیوں کی مہنگائی کا ہوتا ہے گھر والیوں کے خیال میں سبزیوں کی اس گھریلو دستکاری سے ایک وقت کی روزی روٹی کا بندوبست ہو سکتا ہے۔

یوسفی صاحب کے ہاں مزاح یہ ہے کہ مرزا کی پالتو کتیا "ماتا ہری" حلوائی کے کتے کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہم اسے اپنے ہاں کی اشرافیہ کی کلاس پر "[illegible] یا کلاس اسٹرگل" سمجھ کر اپنی زبان حال پر خاموش ہو گئے یعنی ماتا ہری نام کی کتیا حلوائی کے کتے کے ساتھ بھاگی تو اشرافیہ مزاح نے جنم لیا، ڈیفنس سوسائٹی کے کسی [illegible] کے ساتھ بھاگتی تو مزاح نہیں تھا نارمل حالات سمجھے جاتے، ہماری مزدور کلاس میں مزاح یوں بنتا ہے کہ حلوائی کا کتا جو بڑا انقلابی مزاج رکھتا ہے مرزا کی کتیا کو لے بھاگا، اخبارات کے پہلے صفحے پر خبر اور فوٹو لگی ہے۔ دونوں حلوائی کی دکان کے تھڑے کے نیچے پائے گئے ہیں، ہمارے ہاں کا رومان ہی یہ ہے اپنی کلاس سے اوپر اٹھ کر واردات کی جائے تب واردات مزاح بنتی ہے۔ ہمارے ہاں کی مزدور کلاس وہ کلاس ہے جو سیزر جیسے بھاری بھر کم اشرافیہ کتے پالنے کی استطاعت نہیں رکھتی اس کلاس کو جب بھی اشرافیہ مزاح سے لطف لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے یہ لوگ گذشتہ روز کی قومی اسمبلی کی کارروائی پڑھ لیتے ہیں۔ عوام کو اشرافیہ کلاس کے طنز و مزاح کا لطف بھی آجاتا ہے اور سیزر حضرات کا صحیح شجرہ نسب کا پتہ بھی چل جاتا ہے، کون کس کا بیٹا ہے کون کس کا باپ ہے۔ ہماری مزدور کلاس کے ہاں اگر سیزر نام کا کتا پال بھی لیا جائے تو یوں ہو گا کہ سیزر کیلئے لائے ہوئے بسکٹوں کا ڈبہ چھوٹا منا چٹ کر گیا اور ٹین کے ہوا بند ڈبے میں سیزر کیلئے آنے والی صحت بخش غذا "منتظم باورچی خانہ" نے سرسوں کے تیل سے بگھار کر دستر خوان پر سجا دی۔ یہ ڈبے گھر آئے مہمانوں کے آگے رکھ دیئے جائیں تو وہ اسے امریکی درآمدات کے تحائف میں سمجھ کر میزبان کے اعلیٰ مرتبے کے قائل ہو جائیں، ویسے بھی ترقی یافتہ ممالک میں سیزروں کیلئے صحت بخش غذا کے اشتہارات پر جتنا خرچ کیا جاتا ہے ہمارے جیسے غریب اور استحصال زدہ ملکوں کے بجٹ میں اپنے عوام کی صحت پر خرچ کرنے کیلئے اس بجٹ کا اعشاریہ حصہ ہی ہوتا ہے۔ اس لئے امریکہ سے آئے ہوئے ہوا بند ڈبوں والی غذا ان ملکوں کے عوام میں مشہور و مرغوب کر دینی چاہیے، کوئی تو صحت بخش چیز تیسری دنیا کے عوام کو بھی ملے۔

یوسفی صاحب کے مزاح سے لطف لینے کیلئے زیادہ تکلف کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی، وہ لوگ جن کا نہ وہ مخصوص مزاج ہو اور نہ وہ کلچر ہو وہ اپنے طور پر لطف لیتے ہیں۔ ہم نے یوسفی صاحب کے طنز و مزاح سے لطف لینے کا یہ طریقہ کیا ہوا ہے کہ یوسفی صاحب کی کتاب سے چار پانچ صفحات پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد کسی عام سے غیر معیاری مزاح نگار کا ایک صفحہ نوش جان کر کے بہت ہنستے ہیں۔ ہمارے علاوہ ہماری کلاس کے اکثر عوام الناس بھی یہی کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ یوسفی صاحب کو پڑھنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ فیروز اللغات یا نور اللغات لے کر بیٹھ جائیں اور پہلے تمام متروک اور غیر مانوس الفاظ کی ایک فہرست بنا کر تیار رکھی جائے، یوسفی صاحب کو پڑھتے جائیں، فہرست سے معنی دیکھتے جائیں، کھلکھلا کر ہنستے جائیں۔ ہمارے اس دوست نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں سارے امتحانات میں اسی تکنیک سے کامیابی حاصل کی ہے۔ ہم نے اپنے دوست سے کہا تمہارا ادب پڑھنے کا انداز جاگیر دارانہ طرز تعلیم میں نصاب کی کتابیں پڑھنے جیسا ہی لگتا ہے۔ تم کھلکھلا کر ہنسنے کا سرٹیفکیٹ رکھتے ہو حق نہیں رکھتے۔ ادب عالیہ کے جتنے اہم موضوعات ہو سکتے تھے، یوسفی صاحب ان سب پر طبع آزمائی فرما چکے ہیں، مثلاً مرغیاں، باورچی، سگریٹ، سگار، کتے، کرکٹ، کافی چائے، چارپائی وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے ان موضوعات کو ادب عالیہ کے موضوعات اس لئے کہا ہے کہ ہمارا ادب ہی نہیں سارا معاشرہ ان ہی چند موضوعات کے گرد گردش کر رہا ہے۔ ہمارا ادب آج تک اس سے باہر نہیں نکل سکا۔ ہمارے ادب عالیہ میں استحصال، غربت، بھوک، سماجی ناانصافی، طبقاتی تفاوت، جیسے موضوعات پر لکھنے کی ممانعت ہے اس سے جمخانہ کلب والی کلاس ناراض ہو جاتی ہے۔ جمخانہ کلب کے پسندیدہ موضوعات وہی ہیں جن موضوعات عالیہ پر یوسفی صاحب نے لکھا ہے بلکہ خوب لکھا ہے۔ اتنی تفصیل سے لکھا ہے کہ مزید لکھنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ یوسفی صاحب کی معلومات بھی ان موضوعات پر بہت وسیع ہیں، مثال کے طور پر وہ کتوں اور ان کی اعلیٰ نسلوں کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہیں کہ ہم جیسے لوگ اپنے ہاں کے معتبر طبقے کی ذات، برادریوں اور خاندانوں کے بارے میں نہیں جانتے، یوسفی صاحب کے بعد ادب عالیہ کے ان اہم موضوعات پر لکھنے کی گنجائش باقی نہیں رہی، ہمیں تو یہ حقیقت دل سے تسلیم ہے کہ "سیزر" اور "ماتا ہری" کا انسانی معاشرے میں اپنی جگہ ایک مقام ہے اور یوسفی صاحب کے قلم سے ان کا بیان ہونے کے بعد تو تمنا ہوتی ہے کہ ہمارا نصیب سیزر جیسا کیوں نہ ہوا، ڈیفنس سوسائٹی کے اندر کسی بڑے صاحب کے در پر بوگن ویلیا کی چھاؤں میں پڑے ہوتے تو آج کے اشرافیہ ادب میں ہمارا نام بھی لازوال ہوتا اور ہم بھی عہد یوسفی کا حصہ شمار ہوتے۔ خدانخواستہ کہیں اوپر کی باتوں سے آپ یہ نہ سوچ رہے ہوں کہ ہم مشتاق یوسفی صاحب کی تحریروں کے مداح نہیں ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہم جناب مشتاق یوسفی کے بڑے مداح ہیں بس اختلاف اتنا سا ہے کہ مزاح کا ہدف سماجی ناہمواری اور ناانصافی ہے یہی انقلابی شاعری کا ہدف بھی ہے ہم میں خامی یہ رہی ہے کہ ہمارا ذہن نہ فیض کی شاعری پڑھ کر آج تک باغی یا انقلابی ہوا ہے نہ یوسفی صاحب کی تحریریں پڑھ کر ہم میں کوئی سماج سدھار جذبہ انگڑائیاں لے کر اٹھا ہے، مگر ہم دونوں کے یکساں مداح ہیں۔ یہ تحریریں خوب بلکہ بہت خوب ہیں اور ہم نے ان تحریروں کو لطف لینے کی نظر سے پڑھا ہے۔ لطف لے لے کر پڑھا ہے، بار بار لطف لیا ہے۔

مزاح نگاری کیلئے کیلے کے چھلکے پر پھسلن کی منظر کشی بیان کرنے کا نام ہے، منظر یوں ہے کہ ایک صاحب گھر سے ون سٹور کو نکلے، فٹ پاتھ پر کیلے کا چھلکا پڑا تھا پاؤں پڑا وہ ہوا میں

معلق پاؤں اٹھائے سڑک پر گندے پانی کے گڑھے میں جا کر گرے، اس دلچسپ منظر کو دیکھ کر ایک اچھا مزاح تحریر کیا جا سکتا ہے۔ عام مزاح نگار اس منظر پر کئی خوبصورت جملے اور بہت اچھا پایہ مزاح تحریر کر سکتا ہے مگر ہمیں سوچنا پڑتا ہے کیا اس منظر میں موضوع گرنے والے کو بنایا جائے یا گرنے کے سبب کو بنایا جائے، اس منظر میں خرابی کا سبب اور اس کا شکار دونوں موجود ہیں، گرنے والا شکار ہے، سڑک پر کیلے کا چھلکا پھینکنا اور سڑک پر گندے پانی کا گڑھا ہمارے نظام کی خرابی کی نشاندہی کرتے ہیں، اکثر مزاح نگار گرنے والے پر ہنستے ہیں، نظام اور معاشرے کی خرابیاں نظر انداز کر جاتے ہیں، کاش مزاحیہ ادب گرنے والے پر نہیں گرانے والے کے بارے میں تخلیق ہوتا تو ہم آج اپنے گریبان میں منہ ڈالے شرمندہ نہ ہوتے۔ ہمارے مزاح نگاروں نے اپنے مزاح سے وہ کام نہیں لیا جو گلیور ٹریولز اور ڈان کیخوٹے لکھنے والے طنز و مزاح نگاروں جوناتھن سوفٹ اور سروینٹیز نے اپنے معاشرے کی اجتماعی نامعقولیت کی نشاندہی کیلئے طنز و مزاح نگاری سے لیا ہے۔ میں یوسفی صاحب کی تخلیقی صلاحیت یا عظمت کے سورج کو چراغ دکھانے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں، یوسفی صاحب پر بات کرتے ہوئے کوئی بھی شخص خود اپنی عزت افزائی بھی خود حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ بلاشبہ صرف اردو ادب کے طنزیہ، مزاحیہ ادب کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا یہ دور مزاح کے معاملے میں مشتاق یوسفی صاحب کا دور ہے اور آج ہم مزاح کے عہد یوسفی میں رہ رہے ہیں مگر تشنگی یہ محسوس ہوتی ہے کہ اکادکا مزاح نگار اکادکا اور اعیان ادب اگر اپنی کلاس سے خوفزدہ ہو کر سماجی ناانصافیوں کے موضوعات سے صرف نظر کر جائے تو مجھ جیسے لکھنے والے جو طبقاتی اعتبار سے بوگن ویلیا کی چھاؤں میں خاموش پڑے ہوئے ہیں، عہد یوسفی کی تحریروں اور ترتیب کو لب بستہ ہو کر ہی دیکھ سکتے ہیں۔

◆◆◆

جانے والے کبھی نہیں آتے
شوکت فہمی

یہ ترا شہر بھی ہے شہرِ زلیخا جاناں
وہ پیمبر ہے جو دامن کو بچا لے جائے

رباعی ـــــــــــــــــــ علامہ اقبال

دل ہوتا ہے رو بہ راہ گاہے گاہے
رو لیتے ہیں بھر کے آہ گاہے گاہے
اس ڈر سے خودی، خدا نہ بن جائے کہیں
کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

عذاب سہہ کے بھی آہ و فغاں نہیں کرتے
کسی سے حالِ دل اپنا بیاں نہیں کرتے
ہم احتجاج کے فن سے تو خوب واقف ہیں
گلۂ آسماں نہیں کرتے

(ڈاکٹر صبیحہ صبا)

شاعر، ادیب اور میڈیا

جوہر میر

تخلیقی ادب ہی نہیں، زندگی کے کسی بھی شعبے میں ریڈیو، ٹی وی، فلم اور پرنٹ میڈیا کا کردار بہت ہی اہم نظر آتا ہے، سائنسی ترقی نے جہاں مواصلاتی ذرائع کو فراواں اور سہل بنا دیا ہے وہاں کسی ادیب اور شاعر کیلئے جدید اظہار و ابلاغ کے وسائل اور ذرائع کو ناگزیر بھی بنا دیا ہے، کوئی تخلیق کار کتنا ہی بڑا ادب کیوں نہ تخلیق کر رہا ہو اس کی عظمت کا تعین اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ رائج الوقت ذرائع ابلاغ سے مستفید نہ ہو، تخلیقی عمل کی اصل غایت بھی یہی ہے کہ شاعر اور ادیب یا زندگی کے کسی بھی شعبے میں خصوصی کردار ادا کرنے والا کوئی شخص اپنی سوچ، اپنی تحقیق اور تخلیق عوام تک پہنچائے، اس غایت کی تکمیل کے بعد ہی کسی تخلیق کے حسن و قبح کا تعین ممکن ہو سکتا ہے اور یہ پتہ چل سکتا ہے کہ عصری ادب میں کون تخلیق کر رہا ہے اور اس کی تخلیقات کا کیا معیار ہے۔ اس اصول کا اطلاق دنیا کے ہر معاشرے اور ہر زبان کے ادب اور ادیبوں پر ہوتا ہے۔

پرنٹ میڈیا کی دریافت سے پہلے بھی اظہار و ابلاغ کے ذرائع موجود تھے، اگر موجود نہ ہوتے تو دنیا کا عظیم ادب جس نے ہمارے آج کے تخلیقی ادب پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں، موجود نہ ہوتا۔ سقراط کی علمی مجالس میں کسی بحث کو قلمبند کرنے کا رواج نہ تھا، وہ انسانی ذہن کی تشکیل میں مصروف تھا لیکن افلاطون نے اپنے استاد کے خیالات کو قلمبند کر کے مستقبل کیلئے گراں قدر علمی ذخائر چھوڑے۔ غور کیا جائے تو سقراط اور اس سے پہلے کے اخلاقیاتی فلسفیوں کی کاوشیں اگر مخطوطات کی شکل میں ہم تک نہ پہنچتیں تو پوری دنیا انسانی ذہن کے ارتقاء کے بہت ہی اہم عہد کے ادراک سے محروم رہ جاتی، ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ افلاطون نے اپنے عہد میں کن "پبلشروں اور ناشروں" کی خدمات حاصل کی تھیں مگر یہ مان لینے میں ہمیں کوئی حرج نظر نہیں آتا کہ لکھے ہوئے حروف کی تشہیر کا کوئی ذریعہ اس دور میں ضرور موجود ہوگا۔ جس نے آنے والے زمانوں کیلئے ایتھنز میں مرتب کئے گئے انسانی فلسفے سے مستفید ہونا ممکن بنا دیا تھا۔ بابل و نینوا کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حمورابی پہلا ایسا حکمران تھا جس نے ایک تحریری آئین چھوڑا تھا اور یہ تحریری آئین کاغذ کی ایجاد سے پہلے تحریر کیا گیا۔ مٹی کی ٹھیکریوں پر نقش کر کے بھٹی میں ڈھالا گیا تھا، اس عمل کا مقصد بھی وہی تھا جو افلاطون اور اس کے معاصرین کا تھا۔ مصری تہذیب بھی اسی ارتقائی عمل سے گزری اور باقی دنیا کی طرح برصغیر پاک و ہند میں بھی تہذیبی ارتقاء کے مراحل اسی طرح طے ہوئے ہیں۔

یہ تخلیق ہی ہوتی ہے جو اپنے خالق کو ادراہ سے متعارف کراتی ہے لیکن تخلیق خود کسی نہ کسی ذریعہ ابلاغ کی محتاج ہوتی ہے۔ صوتی اور بصری دونوں طرح کی تخلیقات کسی نہ کسی ذریعہ تشہیر کی محتاج ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم بھی نظر آتی ہیں، لکھا ہوا ادب ہماری سماعتوں کے علاوہ ہماری بصری استعداد کے ذریعے بھی ہمارے ذہنوں میں منتقل ہوتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر ہمارے بزرگ اور عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نہ صرف اپنے دیوان کی اشاعت کے متمنی رہے بلکہ کوٹھوں اور گلیوں میں گائے جانے کی خواہش سے بھی مغلوب رہے۔ سو ڈیڑھ سو سال پہلے ہندوستان میں پرنٹ میڈیا دریافت ہو چکا تھا۔ کتابوں کے قلمی نسخے بھی تیار کرانے کا رواج تو تھا ہی اشاعتی ادارے بھی اس عہد میں کام کرنے لگے تھے۔ یہ جان کر ہمیں حیرت نہیں ہوئی کہ غالب جیسے عظیم شاعر نے اپنے دیوان کی اشاعت کیلئے خود کسی خوشنویس کی خدمات کیوں حاصل کیں۔ اپنی جیب سے خوشنویس کو اس کی محنت کی اجرت کیوں ادا کی؟ اور یہ کہ وہ اپنے ہر دوست سے اپنے دیوان کی اشاعت کے بندوبست کا سوال کیوں کرتے رہے؟ ہمیں اس بات پر بھی حیرت نہیں ہوتی کہ اس دور میں بعض نامی گرامی ناشروں نے دیوان غالب کی اشاعت سے کیوں انکار کر دیا تھا؟ ظاہر ہے ہم جس دور کی بات کر رہے ہیں اس دور میں غالب کے شاعرانہ مقام کا تعین نہیں ہوا تھا۔ مرزا غالب اپنے مقام و مرتبے سے آگاہ تھے اور اسی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ ان کا کلام رائج الوقت ذرائع ابلاغ کی وساطت سے عوام الناس تک پہنچے، اس عہد میں کسی شاعر کی شہرت کی شرائط یہ تھیں کہ اسے مغل دربار کی سرپرستی حاصل ہو جائے۔ اس کا کلام کوٹھوں پر گایا جانے لگے۔ اس کا کلام بازاری گلیوں میں گائیں اور اس کا دیوان چھپ جائے۔ قبولیت اور شہرت کی شرائط کم و بیش آج بھی یہی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ کسی بھی زمانے میں کسی بھی معیار اور کسی بھی طرز کا میڈیا کسی بھی تخلیق کار کی بہت ہی اہم ضرورت رہا ہے۔

مرزا غالب نے جب اپنے عہد کی ناسپاسی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ –

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

یعنی میرے شعر کو آنے والے زمانے میں شہرت ملے گی تو اس کا بہت سادہ سا مفہوم یہی ہے کہ انہیں مستقبل کے اظہار و ابلاغ کا بہت اعلیٰ شعور تھا۔ یہ روایت (جو ان کی زندگی پر حالی کی قلم سے ملی ہے) اگر درست ہے کہ وہ نواب جان کے کوٹھے پر اپنی غزلیں پہنچانے کیلئے خود تشریف لے گئے تھے تو اس بات سے بھی ان کے مقام و مرتبے میں کمی نہیں ہوتی کیونکہ ان کے مقام و مرتبے کے تعین میں ان کی اس کوشش نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ مغل دربار سے ملنے والی شہرت، کوٹھے سے ملنے والی شہرت کے مقابلے میں ہیچ نظر آتی ہے۔ مغل دربار سے ان کی وابستگی ان کی معاشی مجبوری تھی، ان کی شعری مجبوری نہ تھی جبکہ کوٹھوں اور گلیوں میں گائے جانے کی ضرورت بظاہر غیر معاشی ہونے کے باوجود شہرت کے حوالے سے ان کے دیوان کی اشاعت اور مقبولیت کی ضرورت کے تابع نظر آتی ہے۔ بلاشبہ غالب کوٹھے اور گلیوں میں نہ گائے جانے اور مغل دربار میں پذیرائی نہ پانے کے

باوجود بڑے شاعر ہوتے، ان کی عظمت میں کمی نہ ہوتی مگر وہ ایک گمنام عظیم شاعر ہوتے۔ کوئی نہیں جانتا انسانی معاشرے کے ارتقائی مراحل میں ایسے کتنے عظیم تخلیق کار گمنامیوں میں دفن ہو گئے ہیں جو اپنے عہد کے ذرائع ابلاغ سے مستفید نہ ہو سکے تھے۔ یہ مان لینا بہر حال مشکل ہے کہ انسانی معاشرے کے محدود تمدنی عہد میں کوئی ذریعہ ابلاغ نہ تھا۔ ہوا ایسا بھی ہوگا کہ پیاسا دریا تک نہ پہنچ سکا ہوگا۔ دریا تو کسی زمانے میں بھی پیاسوں تک نہیں پہنچا۔ اس اعتبار سے ہم کسی بھی تخلیقی عمل کی شہرت اور بقاء کے حوالے سے کسی بھی قسم کے میڈیا کو ادیب اور شاعر کی شہرت اور بقاء کیلئے ناگزیر سمجھیں تو اس میں کسی ادیب اور شاعر کی توہین کا کوئی پہلو نہ ہوگا۔ آج کے دور میں تو شہرت اور بقاء کا یہ معاملہ بعض ادیبوں اور شاعروں کیلئے جہد للبقاء کا درجہ رکھتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اب اظہار و ابلاغ کے ادارے شہرت دینے کے علاوہ تخلیقات کا معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو جن شاعروں کا کلام نشر کرتا ہے وہ اچھے شاعروں کی شہرت میں اضافے کے علاوہ ان کے مجموعہ کلام کی فروخت میں اضافے کے امکانات بھی پیدا کرتا ہے۔ اچھے ادب کی اشاعت میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ کوئی شاعر یا ادیب اگر کسی ادبی پرچے میں اپنی کوئی تخلیق اشاعت کیلئے بھجواتا ہے تو اس کا مطلب اپنے تخلیقی ادب میں دوسروں کو شریک کرنے کے علاوہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے عصر میں موجود نظر آئے۔ اسی طرح اگر کوئی مدیر یا پبلشر اچھے ادیبوں اور شاعروں کا کلام اور ادب شائع کرتا ہے تو اس کی اس خدمت کو فی سبیل اللہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کی اس خدمت میں شعر و ادب کی خدمت کے جذبے کے علاوہ اس کی معاشی بقاء کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ (پاکستان میں ادبی جرائد کے مسائل اور ان کی مشکلات سے قطع نظر)۔

اس تمہید کا پس منظر یاران شب کی ایک گفتگو ہے جس میں کراچی کے ایک معروف شاعر جناب سلیم کوثر کی شاعری زیر بحث تھی۔ ان کا مجموعہ "یہ چراغ ہے تو جلا رہے" سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ سبھی ان کی شاعری کی ستائش کر رہے تھے مگر ایک سوال سبھی کی زبان پر تھا کہ اتنا اچھا شاعر گمنام کیوں کر رہ گیا؟! انہیں وہ شہرت کیوں نہ مل سکی جو ان سے کم درجے کے بعض اچھے شعراء کو حاصل ہو چکی تھی؟ اس سوال کا جواب دراصل شاعر کے اپنے لکھے ہوئے ایک اظہاریے میں موجود تھا۔ اس اظہاریے کے مطالعے سے پتہ چلا کہ سلیم کوثر نے اپنی "گمنامی" کی ذمہ داری اپنے سوا ہر شخص پر ڈال رکھی تھی وہ اپنی شاعری سے تو بے حد مطمئن تھے مگر ان حالات سے گلہ مند تھے جو ان کی دانست میں ان کی شہرت اور ان کے عروج کی راہ میں حائل تھے۔ زمانے کی ناقدری کا رونا روتے ہوئے خود توصیفی کے جذبے سے مغلوب ہو کر انہوں نے اپنے اظہاریے میں جگہ جگہ جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ان کی راہ میں ان کے علاوہ اور کوئی حائل نہیں رہا اور یہ کہ اپنی تمام تر شاعرانہ خود اعتمادی کے باوجود وہ اپنے زمانے کے عملی تقاضوں کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ الٹے لوٹ آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا کے غالب کو اپنی پنشن واگزار کرانے کیلئے کلکتہ جانا پڑا تھا۔ شراب کا سٹاک خریدنے کیلئے میرٹھ بھی جانا پڑا تھا۔ اور ڈومنی کے کوٹھے پر تو جانا ہی پڑا تھا کہ غالب کے عہد کے عملی تقاضے کچھ اسی قسم کے تھے۔ اس دور میں اگر ریڈیو ٹی وی ایجاد ہو چکے ہوتے تو یقیناً غالب ریڈیو ٹی وی کو مغل دربار پر ترجیح دیتے۔ غالب کو اس کے عہد کے بہت ہی محدود سے دائرے سے نکل کر دوام حاصل کرنے میں اگر اپنے عہد ہی میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی تو اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ اپنی کئی دوسری کمزوریوں کے باوجود وہ ایک عملی آدمی تھے اور اپنے مقام کو منوانے کیلئے بہت سنجیدہ تھے۔ اس کے برعکس سلیم کوثر اور ہمارے بہت سے دیگر عمدہ شاعر اگر بہت کچھ دینے کے باوجود شہرت کے آسمان پر روشن نظر نہیں آ رہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حفیظ جالندھری مرحوم نے اگر یہ کہا ہے کہ "بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں" تو غلط نہیں کہا تھا۔

اپنے اظہاریے میں اپنی شاعری کی پذیرائی کے دعوے کے ساتھ اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "1981ء سے اب تک اس مجموعہ کو کسی بھی بیورو کریٹ شاعر کی پی آر سے تولد ہونے والی شہرت سے زیادہ پڑھے جانے کا شرف حاصل ہے، یہ ادب کے وہ "پلاننگ افسر" ہیں جو آپ کو بتائیں گے کہ اعلیٰ و ارفع ادب کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں ــــ کیا واقعی اردو شاعری کے پلاننگ افسر ہیں؟ شاید ایسا ہی ہے۔ سو بہت سے لوگ ان کی بھینٹ چڑھ گئے ــــ یہ جنگ (شہرت کے حصول کی جنگ، خود کو تسلیم کرانے کی جنگ) لڑتے لڑتے میرا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، میں بھی پیوند خاک ہو جاؤں گا اور پھر ــــ پھر وطن پرستی کا تمغہ کسی اور کے سینے پر سجا دیا جائے گا"۔ ان چند جملوں میں سلیم کوثر ایک طرف تو اپنی پذیرائی کا دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف اپنی محرومی کے اعتراف کی اطلاع فراہم کرتے ہیں۔ وہ کسی اور سے زیادہ اپنے آپ کو اپنے مقام اور اپنی مقبولیت کا قائل کرتے نظر آتے ہیں، مگر قائل نہیں کر پاتے اور نامرادی کے عالم میں اپنے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے اور دفن کر دیئے جانے کے علاوہ وطن پرستی کے تمغے سے محروم رہ جانے کی بشارت دیتے ہیں۔ اسی اظہاریے کے ایک اور پیراگراف میں اسی نوحے کو وہ مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ "میری جنگ زیادہ شدید ہے، میرے پاس کوئی بڑا عہدہ نہیں جس سے مرعوب ہو کر میری شاعری کو سراہا جانے لگے اور بلا شرکت غیرے اس عہد کے تمام مثبت تنقیدی رویوں کو میرے نام لکھ دیا جائے کہ ادب میں غیر جانبدارانہ عہد اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ میرا تعلق ایسے "ترقی پسندوں" سے بھی نہیں جن کی ایئر کنڈیشنڈ کاروں کیلئے بھوک اور افلاس سے بے حال لوگوں کی گلیاں اور محلے تنگ پڑ جاتے ہوں اور جو کشادہ سڑکوں سے گزرتے ہوئے ترقی پسندی کے الہام میں مبتلا ہوں ــــ جو مزدور کے پسینے میں مارکسی نظریہ کا ابلاغ تلاشتے ہوں ــــ میں کوئی سرمایہ دار بھی نہیں کہ ادب کے پلاننگ افسروں کی خواہشوں کو جدید سہولتیں فراہم کر کے اپنے حق میں دم توڑتا ہوا فیصلہ لکھوا لوں۔" اکتوبر 1986ء میں لکھے ہوئے اس اظہاریے میں "نثری شاعری" کے انداز کے اس نوحے میں ایک عمدہ اور بلیغ شاعر اپنے خلاف جنگ لڑتے ہوئے شہادت کا درجہ حاصل کرنے کا خواہشمند نظر آتا ہے۔ وہ بار بار جنگ اور شدید جنگ کی خبر دیتا ہے۔ وہ بار بار رکاوٹوں کی نشاندہی کرتا ہے مگر وہ دیکھی بھالی رکاوٹوں کے خلاف لڑنے کیلئے تیار نہیں، ہمیں نہیں معلوم جناب سلیم کوثر نے جن پلاننگ افسروں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کون تھے، بظاہر ان کا اشارہ میڈیا کے ارباب بست و کشاد ہی کی طرف ہونا چاہیے۔ سو اگر ان کی تنقید کا ہدف درست بھی ہو تب بھی ہمیں اس بات کا قائل تو ہونا ہی پڑتا ہے کہ ایک تخلیق کار کیلئے اپنے عہد کے میڈیا تک رسائی کس قدر اہمیت کی حامل ہے۔

تخلیقی عمل کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو جانے کے بعد کسی تخلیق کار کا احساس محرومی دراصل اس ضرورت کا حامل ہے کہ تخلیق کار رائج الوقت دستور پذیرائی کو مسترد نہ کرے۔ وہ اپنی انا کو اپنے قد و قامت سے تجاوز نہ کرنے دے تاکہ کسی کو اس کے مقام کا تعین کرتے ہوئے مشکل پیش نہ آئے۔ پاکستان میں ایسے بہت سے شعراء اور ادیب بہت سے لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست تیار کی جا سکتی ہے جو اپنے تخلیقی مرتبے میں جناب سلیم کوثر یا کسی بھی گمنام "معروف" شاعر اور ادیب سے کم مرتبہ ہونے کے باوجود زیادہ شہرت پانے میں کامیاب ہوئے۔ پانچویں دہائی کی ابتدا تک تو ہمارے بہت بڑے اور اہم شاعر جناب فیض احمد فیض بھی شہرت کے اس مقام پر فائز نہ تھے جو ان کو مہدی حسن کی

گائی ہوئی غزل "گلوں میں رنگ بھرے" نور جہاں کی گائی ہوئی "مجھ سے پہلی سی محبت" کے منظر عام پر آنے کے بعد حاصل ہوا تھا۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ جناب احمد فراز کو شہرتوں کے آسمان پر پہنچانے میں میڈیا کا کردار کم رہا ہے۔ فراز تو اپنے عہد کی شاعری میں منفرد مقام کے حامل تھے ہی ابن انشاء کی شناخت تو ان کے سفرنامے ہی ہوا کرتے تھے۔ ان کی شاعرانہ شہرت سے ہم استاد امانت علی مرحوم کی آواز کو کیسے الگ تھلگ سمجھ سکتے ہیں۔ کسوٹی پروگرام کے ایک مسخرہ جناب عارف افتخار کب اور کیسے شاعر کہلائے؟ عارف افتخار نے تو ابھی بھی غزل کہہ کر بھی دکھا دی۔ ایسے لوگ بھی میڈیا ہی کے ذریعہ بام شہرت پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ جن کی شاعری پر شک و شبہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جو پرنٹ میڈیا کی کندھوں سے الیکٹرانک میڈیا میں داخل ہوئے۔ اس فہرست میں ایسے کئی نام شامل کئے جا سکتے ہیں۔ جن میں ایک تو وہ ہیں جو اپنے شہری اور ادبی مقام کے تعین کے بعد میڈیا کی توجہ کا مرکز ٹھہرے اور دوسرے وہ جو رائج الوقت دستور پذیرائی سے آگاہی کی بناء پر اوپر پہنچے۔ اس فہرست میں اگر وہ لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں جن پر طوق زریں ہمہ در گردن خرے جملہ کا اطلاق ہوتا ہے تو اس میں زیادہ قصور ان تخلیق کاروں کا ہے جو شہرت کی بے پناہ خواہش کے باوجود اپنی انا سے اپنے آپ کو لہولہان کرنے میں مصروف رہے ہیں، جو زندگی بھر اپنے آپ کو قائل کرتے رہے ہیں کہ ان کی راہ میں کوئی اور حائل ہے۔ سلیم کوثر ہمارے اچھے شعراء کے اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو حرف کی تشہیر کی اہمیت سے آگاہ ہونے کے باوجود محض اس بناء پر مشہور نہ ہو سکے کہ ان میں اپنے آپ کو منوانے کے جذبے کا فقدان تھا جو زندگی بھر اس وہم میں مبتلا رہے کہ ان کیلئے حضرت خضر آب حیات کی صراحی خود لے کر آئیں گے، ثواب کمانے کیلئے۔

اور اب جب کہ شعر و ادب کی سرحدیں خود قفس سے جا لگی ہیں، شاعر اور ادیب کیلئے الیکٹرانک میڈیا کی قربت حاصل کرنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ پاکستان جیسے ممالک میں جہاں معاشرہ بہت گہرائی تک بٹ چکا ہے وہاں، مفادات کے تضادات بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ سیاسی عدم استحکام اور آمریتوں کی مداخلت اور مخالفت میں منقسم ادیب اور شاعر حکمران طبقے کی قربت اور اس قرب کو کیش کرنا جائز سمجھتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ وہ اپنے مخالف ادیبوں اور شاعروں کو اعلیٰ مناصب سے بے دخل کرانے اور دور رکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اگلے روز ڈاکٹر انور سدید نے ایسے ادیبوں اور شاعروں کی ایک فہرست ہماری توجہ کیلئے شائع کی تھی جو سرکاری ملازمت ہوتے ہوئے ملک کے مختلف اخبارات میں کالم نویسی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اپنے کالموں میں وہ بعض اوقات جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں وہ سیاسی تعصبات پر مبنی ہوتے ہیں جو سرکاری یا تعلیمی ادارے کے کسی ملازم کیلئے نامناسب ہونے چاہئیں۔ اپنی کالم نویسی کے ذریعے وہ "پیدا" کے کئی اور ذرائع پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ ضیاء الحق کے پاکستان پر قبضے کے فوراً بعد ٹی وی پر اشفاق احمد اور سلیم احمد کے تسلط کی مثال اور آج ایک تعلیمی ادارے کے ملازم کا کالم نگاری کے توسط سے سفارتی ملازمت حاصل کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ مقابلے کی دوڑ میں شاعر اور ادیب کس حد تک آگے جا چکے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے چند ماہ پہلے کے اقتدار میں ظفر اقبال نامی شاعر کا اردو سائنس بورڈ کا سربراہ مقرر کیا جانا بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ تھا۔ اپنی تقرری کے بعد گریڈ 21 کے حصول کیلئے جناب ظفر اقبال کا صدر لغاری تک پہنچنا ایک "علاوہ ازیں" کوشش تھا جس سے ہمیں مفادات کی اس جنگ کو سمجھنے میں مزید مدد ملتی ہے۔ ایک اور نام نہاد صحافی حسین حقانی کا میاں نواز شریف اور محترمہ بے نظیر سے باری باری مستفید ہونا بھی ہنرمندی کی ایک کامیاب مثال ہے۔ نذیر ناجی نامی ایک جرنلسٹ کا پیپلز پارٹی کے اخبار کی ایڈیٹری سے نوائے وقت کی کالم نگاری تک الٹ پھیر ہونے کے بعد اکیڈمی آف لیٹرز کا سربراہ بن جانا بھی جہد للبقاء کی ایک مثال ہے اور اس کے خلاف احتجاج کا سیلاب بھی بہت سوں کی محرومی کے حوالے سے قابل فہم ہے۔ آخری مغل دربار میں استاد ذوق اور اس کے شاگردوں کی طرف سے مرزا غالب کے خلاف مزاحمتی رویہ مفادات کے اسی اصول پر مبنی نظر آتا ہے جو آج ایک بڑی حقیقت کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ غالب کے زمانے میں اگر نواب جان وسیلہ شہرت سمجھی گئی تھی تو آج ملکہ ترنم نور جہاں، طاہرہ سید، اقبال بانو، ممتاز، غلام علی، مہدی حسن اور ایسے ہی دوسرے گلوکاروں اور گلوکاراؤں تک رسائی حاصل کرنا کوئی عجیب بات نہیں۔ عجیب بات یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی رائج الوقت دستور پذیرائی کو نظر انداز کر کے "حب الوطنی" کا تمغہ حاصل کر لینے کا خواب دیکھے، جیسا کہ سلیم کوثر صاحب نے دیکھا تھا۔ شعر و ادب کے میدان کو میدان جنگ سمجھ کر اس میدان میں اترنے والے دراصل جنگ کے ایک بہت ہی شہرۂ آفاق اصول پر کاربند نظر آتے ہیں۔ یعنی Do or Die تم اگر اپنے دشمن کو نہیں مارو گے تو دشمن کے ہاتھوں مرنے کیلئے تیار ہو جاؤ، نیک نامی اور گمنامی کی موت۔

◆ ◆ ◆

DESIGNING WORKS
For Assurance of International Professionalism in your work.
CONTACT For:
GRAPHIC DESIGNING
WEB PAGE DEVELOPMENT
URDU & ENGLISH COMPOSING
And All Printing Solutions
COMPUART
Designing Works
Confirm here for best price, before placing your orders.
Tel:(718)347-1582
Email:manzar.khurshid@usa.net

سب سے بہتر ریٹ۔ سب سے بہتر سروس

اِدھر ڈالر دیں
اُدھر روپے لیں

FASTEST WAY TO SEND
MONEY TO PAKISTAN

**ZAR
MONEY
TRANSFER**

زر منی ٹرانسفر

دفاتر سے
ادائیگی کی
سہولت بھی
موجود ہے

فری اوور نائٹ ہوم ڈیلیوری

پاکستان کے تمام بڑے شہروں کے علاوہ ملتان، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور جھنگ میں سروس حاضر ہے

**265 NEPTUNE AVENUE, (Btwn: Brighton 6 & 5)
BROOKLYN NY 11235**

Tel: 718-332-3300 Fax: 718-332-0692

PUNJAB
AUTO REPAIR & BODY WORK
FOREIGN & DOMESTIC CARS
ONE WINDOW SERVICES

OPEN 24 HOURS

- All kinds of Auto Repairs
- NYC Inspection
- Auto Electrical Repair
- Auto paint through Oven Spray
- Booth Technology
- Free Estimate
- Free Towing Service for Collision Jobs

گاڑیوں سے متعلقہ تمام
معاملات کا حل ایک ہی جگہ پر

گاڑی کا مکینکل کام کروانا ہو
یا باڈی ورک ہم سے رجوع کریں

Contact:

Chaudhry Khizar & Chaudhry Akbar

33-56 21st Street, LIC, NY 11106

Tel: 718-728-4600

Fax: 718-728-5700

غزلیں

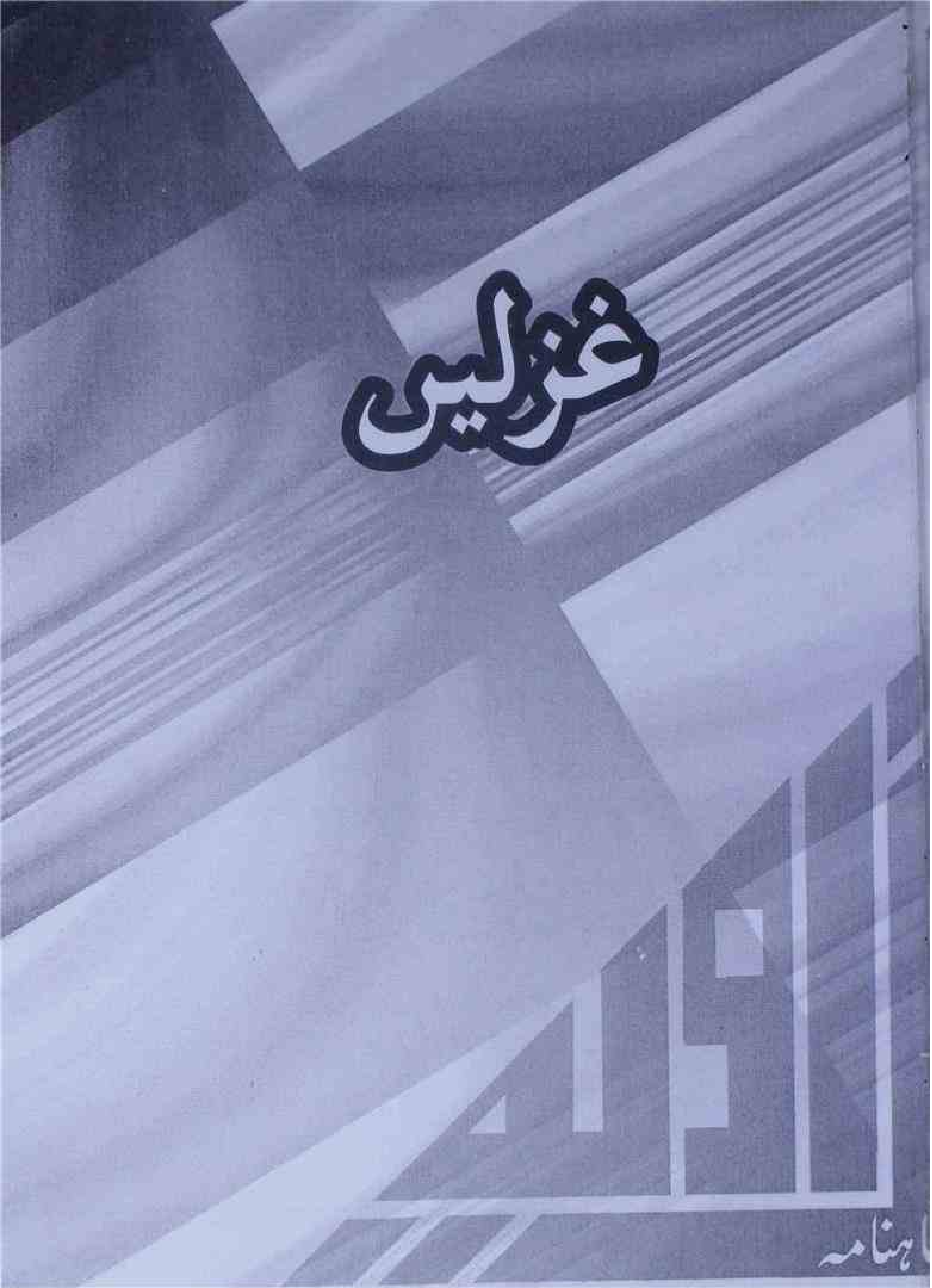

احمد فراز

دشتِ افسردہ میں اک پھول کھلا ہے سو کہاں
وہ کسی خوابِ گریزاں میں ملا ہے سو کہاں

ہم نے مدت سے کوئی ہجو نہ واسوخت کہی
وہ سمجھتے ہیں ہمیں ان سے گلہ ہے سو کہاں

ہم تری بزم سے اٹھے بھی تو خالی دامن
لوگ کہتے ہیں کہ ہر دکھ کا صلہ ہے سو کہاں

آنکھ اسی طور برستی ہے تو دل رستا ہے
یوں تو ہر زخم قرینے سے سلا ہے سو کہاں

بارہا کوچۂ جاناں سے بھی ہو آئے ہیں
ہم نے مانا کہیں جنت بھی ولا ہے سو کہاں

جلوۂ دوست بھی دھندلا گیا آخر کو فراز
ورنہ کہنے کو تو غم، دل کی چلا ہے سو کہاں

نہ شب و روز ہی بدلے ہیں نہ حال اچھا ہے
کس برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

ہم کہ دونوں کے گرفتار رہے، جانتے ہیں
دامِ دنیا سے کہیں زلف کا جال اچھا ہے

میں نے پوچھا تھا کہ آخر یہ تغافل کب تک؟
مسکراتے ہوئے بولے کہ سوال اچھا ہے

دل نہ مانے بھی تو ایسا ہے کہ گاہے گاہے
یارِ بے فیض سے ہلکا سا ملال اچھا ہے

لذتیں قرب و جدائی کی ہیں اپنی اپنی
مستقل ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے

رہروانِ رہ الفت کا مقدر معلوم
ان کا آغاز ہی اچھا نہ مآل اچھا ہے

دوستی اپنی جگہ، پر یہ حقیقت ہے فراز
تیری غزلوں سے کہیں تیرا غزال اچھا ہے

نامرادی کا یہ عالم بھی تو اے دل نہ رہے
ہم تو اب ترکِ تعلق کے بھی قابل نہ رہے

بزمِ مقتل جو سجے کل تو یہ امکان بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے

یوں تو ہر شخص ہے اندیشۂ رہزن کا اسیر
کارواں نیتِ رہبر سے بھی غافل نہ رہے

آج اس نے شرفِ ہمسفری بخشا تھا
اس طرح سے کہ مجھے خواہشِ منزل نہ رہے

سامنے تُو ہو تو سو خواہشیں جاگ اٹھتی ہیں
کاش اب کہ مری آنکھوں میں مرا دل نہ رہے

جو بھی ہو صاحبِ محفل وہی کہتا ہے فراز
کہ وہ اٹھ جائے جو محفل سے تو محفل نہ رہے

افتخار نسیمؔ

چاند پھر تاروں کی اجلی ریزگاری دے گیا
رات کو یہ بھیک کیسی خود بھکاری دے گیا

ٹانکتی پھرتی ہے کرنیں بادلوں کی شال پر
وہ ہوا کے ہاتھ میں گوٹہ کناری دے گیا

کر گیا ہے دل کو ہر اک واہمے سے بے نیاز
روح کو لیکن عجب سی بے قراری دے گیا

شور کرتے ہیں پرندے پیڑ کٹتا دیکھ کر
شہر کے دستِ ہوس میں کون آری دے گیا

کوئلوں میں گیت اور ہرنوں میں آنکھیں بانٹ دیں
ناچتے موروں کو وہ خوش رنگ ساری دے گیا

اس نے گھائل بھی کیا تو کیسے پتھر سے نسیمؔ
پھول کا تحفہ مجھے میرا شکاری دے گیا

خود کو ہجومِ دہر میں کھونا پڑا مجھے
جیسے تھے لوگ ویسا ہی ہونا پڑا مجھے

دشمن کو مرتے دیکھ کے لوگوں کے سامنے
دل ہنس رہا تھا آنکھ سے رونا پڑا مجھے

کچھ اس قدر تھے پھول زمیں پر کھلے ہوئے
تاروں کو آسمان میں بونا پڑا مجھے

ایسی شکست تھی کہ کٹی انگلیوں کے ساتھ
کانٹوں کا ایک ہار پرونا پڑا مجھے

کاری نہیں تھا وار مگر ایک عمر تک
آبِ نمک سے زخم کو دھونا پڑا مجھے

آساں نہیں ہے لکھنا غمِ دل کی واردات
اپنا قلم لہو میں ڈبونا پڑا مجھے

اتنی طویل و سرد شبِ ہجر تھی نسیمؔ
کتنی ہی بار جاگنا سونا پڑا مجھے

آسماں پہ پردۂ ابرِ رواں کوئی نہ ہو
اے خدا اِک دن تو اپنے درمیاں کوئی نہ ہو

یا مرے دل سے مٹا دے دن گزر جانے کا خوف
یا زمیں وہ دے کہ جس پہ آسماں کوئی نہ ہو

طول دیتا ہے کہانی کو تو خوشیاں یاد کر
داستانِ غم میں حرفِ رائیگاں کوئی نہ ہو

پھول بھیجے ہیں جزیروں کی طرف لہروں کے ہاتھ
کوئی ہو شاید وہاں پہ بھی، جہاں کوئی نہ ہو

کیوں مرے سر پہ ہی آئے یہ عتابِ آفتاب
کیوں مرے حصے میں آخر سائباں کوئی نہ ہو

آنکھ کو بھاتی نہیں یک رنگیِ دیوار و در
اب تو ایسا شہر ہو جس میں مکاں کوئی نہ ہو

آئیے گا ایک دن تو گھر سے باہر بھی نسیمؔ
ڈھونڈیے گا اس کو بھی جس کا نشاں کوئی نہ ہو

حلیم قریشی

ایسا لگتا ہے آرزو نہیں کچھ
سامنے تو ہے اور تو نہیں کچھ

بد گمانی کے زرد صحرا میں
میرے اشکوں کی آب جو نہیں کچھ

تجھ پہ احوال کس طرح کھولیں
خالی آنکھوں میں اب لہو نہیں کچھ

جس کو روداد غم سنانی ہے
پاس بیٹھا ہے گفتگو نہیں کچھ

ایک دیوار تھی پرانی سی
اے جنوں اب تو روبرو نہیں کچھ

دل کچھ ایسے حلیم چاک ہوا
صورتِ چارہ و رفو نہیں کچھ

اشرف میاں

میرے وطن ترے احساں سبھی سنبھالے ہیں
ترے فراق نے اعصاب توڑ ڈالے ہیں

زمیں ترس گئی پانی کے ایک قطرے کو
فلک پہ چھائے ہوئے ابر کتنے کالے ہیں

یہ فاصلہ کوئی صدیوں پہ تو محیط نہیں
شبِ سیاہ سے بس دو قدم اجالے ہیں

ہمیں پتہ ہے مگر مصلحت نے مار دیا
فصیلِ شہر میں جس نے شگاف ڈالے ہیں

پکارتے ہیں مدد کیلئے محافظ کو
یہ میرے شہر کے باسی بھی بھولے بھالے ہیں

شہابؔ کاظمی

شجر سروں پہ گھنے سایہ دار اگر ہوں گے
بہت سے لوگ ہمارے بھی ہمسفر ہوں گے

فقط ہمیں پہ نہیں ہے عذابِ تنہائی
بہت سے اور بھی دنیا میں خود نگر ہوں گے

بجھیں گے اپنی ہی ناطاقتی سے کتنے دیئے
لکھے کہ جرم ہواؤں کے نام پہ ہوں گے

ہمیشہ ہم پہ رہا التفاتِ برق و شرر
جو راکھ ہوں گے وہی تو ہمارے گھر ہوں گے

کسی طرف تو یہ ذی ہوش رخ کریں گے ضرور
ذرا سے بھٹکے ہوئے اس کی راہ پہ ہوں گے

نہ جانے کتنے ہوئے دربدر وطن آ کر
نہ جانے کتنے ابھی اور دربدر ہوں گے

سمجھ میں آگئی زندانیوں کے رسمِ وفا
اگر یہاں سے چھٹے بھی تو دار پہ ہوں گے

وہ ہوں گے مصلحتِ وقت ناشناس ضرور
حریفِ بادِ مخالف شہابؔ اگر ہوں گے

گرفتارِ بلائے شک رہا ہوں
اب اپنا آپ رستہ تک رہا ہوں

معاف اے زندگی کر دے مجھے اب
ترا مجرم تو میں بیشک رہا ہوں

مجھے کھو دے تو شاید خود کو ڈھونڈے
میں اس کے ساتھ اس حد تک رہا ہوں

نبھائے دوستی کے سارے موسم
مگر اے زندگی اب تھک رہا ہوں

درِ ایفاء پہ مثلِ حرفِ آخر
جبینِ شوق کی دستک رہا ہوں

شہابؔ آئی نہ مجھ کو دنیا داری
نصابوں تک تو میں زیرک رہا ہوں

انور شعور

کھلتی نہیں زبان ترے رُوبرو ہنوز
کرتا ہوں اپنے آپ سے میں گفتگو ہنوز

ہیں ایک دوسرے کیلئے کتنے بے وجود
دنیائے ہست و بود میں، میں اور تُو ہنوز

ایک ایک چیز وقت کے ہاتھوں بکھر گئی
دل میں بسی ہوئی ہے تری آرزو ہنوز

رہتی تھی ابتداء میں طلب جس کی گاہ گاہ
آتا ہے یاد وہ دہنِ مشک و بُو ہنوز

آغاز شام جشن طرب اور اس طرح؟
ساقی نہ مے گسار نہ جام و سبو ہنوز

دیکھیں ادائے فرض ہو کس روز کس جگہ
ہوتا ہے راستوں کی ندی پر وضو ہنوز

سب لٹ چکا جواہر و ملبوس و اسلحہ
البتہ طوقِ زیست ہے زیبِ گلو ہنوز

اے طوقِ خانۂ غیر آنکھ تو اٹھا
گردباد ہے شعور ترا کُو بہ کُو ہنوز

بخش لائلپوری

مرے گھر کی فضا بدلی نہیں ہے
ستم گر نے سزا بدلی نہیں ہے

ازل سے آہ و زاری سن رہے ہیں
اسیروں نے نوا بدلی نہیں ہے

مرے ہمدم دعائیں مانگنے سے
کبھی آب و ہوا بدلی نہیں ہے

گلوئے حق پہ ہے باطل کا خنجر
حدیثِ کربلا بدلی نہیں ہے

وہی بوسیدگی ہے تن بدن پر
فقیہوں نے قبا بدلی نہیں ہے

کمی آتی نہیں شور فغاں میں
ابھی رسمِ جفا بدلی نہیں ہے

وہی صیاد ہے دامِ ہوس ہے
گلستاں کی فضا بدلی نہیں ہے

میں ہر گم گشتہ چہرہ ڈھونڈتا ہوں
مری عادت ذرا بدلی نہیں ہے

مرض کچھ اور مہلک ہو گیا ہے
طبیبوں نے دوا بدلی نہیں ہے

خداوند زمیں بدلے گئے ہیں
مگر خلقِ خدا بدلی نہیں ہے

حسن عابد

عشق بے باک ہے پابندِ سلاسل میرا
شہر میں سارے ہیں آزاد مگر دل میرا

زندگی کے نئے احساس کے رشتے جاگے
آگ جنگل کو لگی جلنے لگا دل میرا

شیشۂ آب رواں میں ہے وہی عکسِ جمیل
موج در موج ہے بہتا ہوا ساحل میرا

ابر نسیاں نے عجب حال کیا راہوں کا
چشم نم آب ہوا جادۂ منزل میرا

سب ہی آغوش تمنا میں تھے صورت والے
کیا بتاؤں کہ دکھا کس کے لئے دل میرا

پھر ہے سنگِ ملامت سرِ بازار حرم
پھر لہو رنگ ہوا جادۂ منزل میرا

اب نہ مفتی نہ فقیہانِ حرم، سب چپ ہیں
صاحبِ مسند اورنگ ہے قاتل میرا

عباس تابش

پانی آنکھ میں بھر کر لایا جا سکتا ہے
اب بھی جلتا شہر بچایا جا سکتا ہے

ایک محبت اور وہ بھی ناکام محبت
لیکن اس سے کام چلایا جا سکتا ہے

دل پر پانی پینے آتی ہیں امیدیں
اس چشمے میں زہر ملایا جا سکتا ہے

مجھ گمنام سے پوچھتے ہیں فرہاد و مجنوں
عشق میں کتنا نام کمایا جا سکتا ہے

یہ مہتاب یہ رات کی پیشانی کا گھاؤ
ایسا زخم تو دل پر کھایا جا سکتا ہے

پھٹا پرانا خواب ہے میرا پھر بھی تابش
اس میں اپنا آپ چھپایا جا سکتا ہے

شوکت فہمیؔ

کاش آ جائے مجھے جاں سے گزرتے دیکھے
اس کی خواہش تھی کبھی مجھ کو بکھرتے دیکھے

وہ سلیقے سے ہوا ہم سے گریزاں ورنہ
لوگ تو صاف محبت سے مکرتے دیکھے

ایک سہمے ہوئے ساحل کی طرح آنکھوں نے
کتنے چڑھتے ہوئے طوفان اترتے دیکھے

تم نے دیکھا ہے نکلتا ہوا سورج لوگو!
تم نے کچھ خواب سہانے نہیں مرتے دیکھے

وقت ہوتا ہے ہر اک زخم کا مرہم فہمیؔ
پھر بھی کچھ زخم تھے ایسے جو نہ بھرتے دیکھے

ریحانہ قمرؔ

انگلیاں پھیر رہا تھا وہ خیالوں میں کہیں
لمس محسوس ہوا ہے مرے بالوں میں کہیں

اب مرا ساتھ نہیں دیتا پیادہ دل کا
ہار جاؤں نہ میں آ کر تیری چالوں میں کہیں

اس تشخص پہ بھی رہتا ہے یہ دھڑکا دل کو
کھو نہ جاؤں میں ترے چاہنے والوں میں کہیں

ایک سورج نے مجھے چاند کا رتبہ بخشا
ورنہ ہوتی میں کتابوں کے حوالوں میں کہیں

مجھ کو لگتا تو نہیں وہ متزلزل لیکن
اس کو وحشت ہی نہ لے جائے غزالوں میں کہیں

رندھیر سنگھ

آنڑاں دل دا
جانڑاں دل دا
اے دنیا ہے
ٹھانڑاں دل دا

دل دا بھانڑاں
بھانڑاں دل دل
کھیت غماں دے
واہنڑاں دل دا

پیار چ رونڑاں
گانڑاں دل دا
لہنڑی رُت وچ
نھانڑاں دل دا

روگ لگانڑاں
لانڑاں دل دا
مولوں اپنا
کانڑاں دل دا

رب نوں پانڑاں
پانڑاں دل دا
عقل دا پیٹا
تانڑاں دل دا

پریم بھکھاری
رانڑاں دل دا
پھل سکھ دکھ دے
ٹاہنڑاں دل دا

صبر دا چولا
بانڑاں دل دا
دیہ دھرتی تے
چھانڑاں دل دا

MEHRAN MOTORS

ایک خوشخبری سنیئے

جو حضرات 1995 ماڈل اور اسکے بعد کے ماڈل کی گاڑیاں خریدیں گے،
انکی گاڑی میں دیکھا جانے والا ٹی وی سیٹ مفت نصب کرکے دیا جائے گا

- ہمارے پاس ہر ماڈل اور ہر کلر میں ٹاؤن کاریں دستیاب ہیں
- ٹیکسی ڈرائیورز کیلئے اسپیشل ہول سیل ریٹ
- اسکے علاوہ ہمارے پاس Nissan, Mazda, Toyota, Chevy, Mistubisi and Ford کی کاریں، وین اور جیپ دستیاب ہیں
- ہول سیل آکشن سے گاڑی خریدنے میں بھی مدد کرتے ہیں

الیکٹرک کا کام تسلی بخش کیا جاتا ہے

WE SPECIALIZE IN TOWN CARS

- **Best Price in Town**
- **We Sale, Trade, Purchase Used Cars**
- **Financing Available**
- **Get Approved in One Hour**
- **Bad Credit, No Credit, Bankruptcy NO PROBLEM!!**

TOWN CARS AVAILABLE IN ALL COLORS & MODELS

رابطہ کیلئے: میاں ریاض اور ارشد بٹ

Tel: (718) 784-9807 • Fax: (718) 784-9861

38-21 23d Street, L.I.C., NY 11101

E-Mail: MehranMotor@aol.com

افسانے

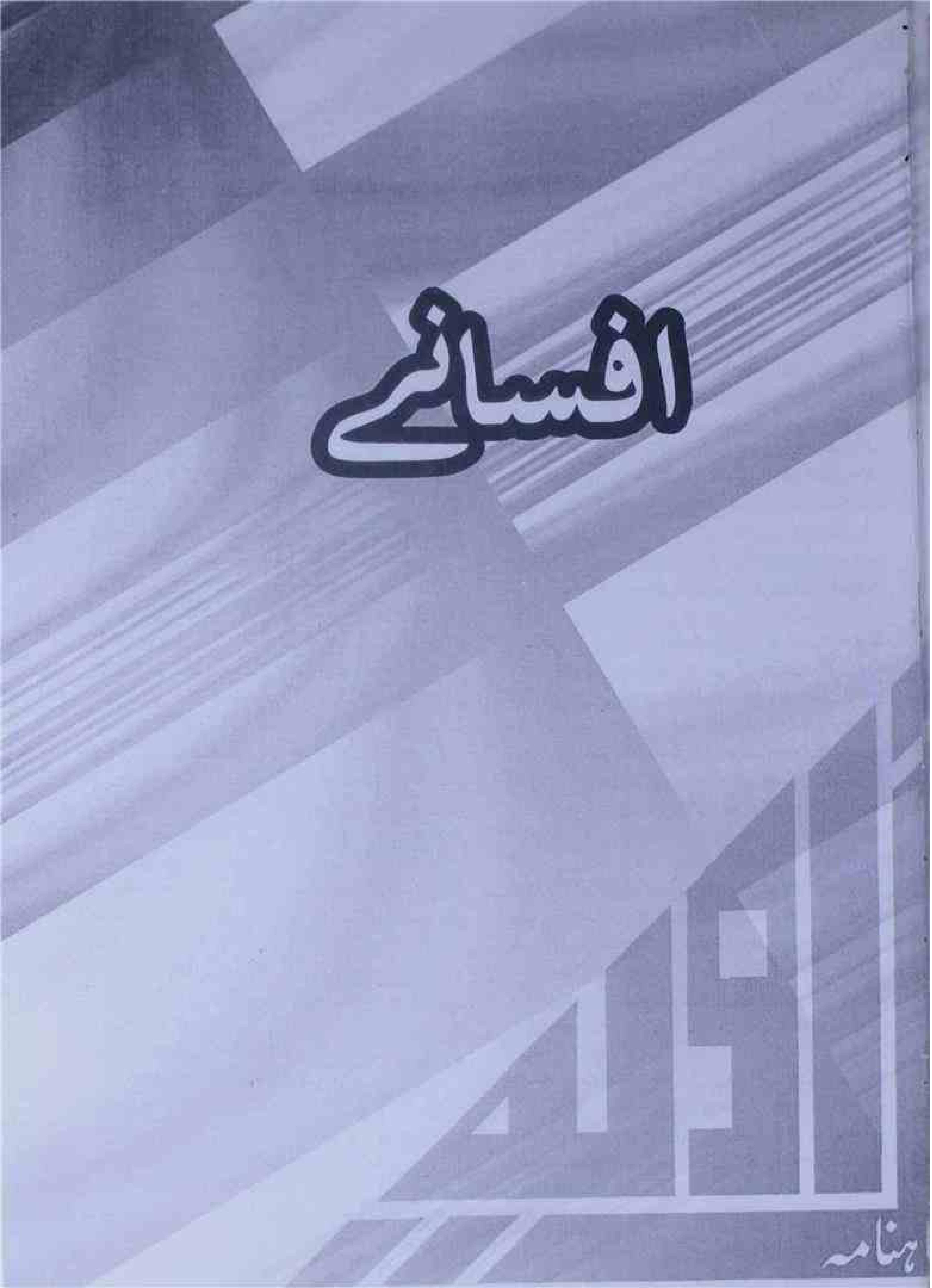

انگلش چینل کا پیراک

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی روح ایک صاف تہہ شدہ رومال کی طرح اس کی آنکھوں سے نکلی۔ ایک لمحہ کے لیے ہوائی اڈے کی ٹرانزٹ لاؤنج کی بوجھل فضا میں معلق رہی، پھر شیشے کے وزنی دروازوں کو توڑ کر باہر ہوائی پٹڑی کی طرف بڑھی۔ اور پھر اڑان بھرتے ہوئے ایئر انڈیا کے طیارے کے پیچھے پرواز کر گئی۔

جب اس نے میری طرف آنکھیں گھمائیں تو وہ بے جان تھیں۔

اتنی دیر کے بعد میں نے کہا، "اجیت سنگھ تم بہت بدل گئے ہو۔"

"ہاں بھائی صاحب۔" وہ بولا "تبدیلی تو قدرت کا اصول ہے۔ اگر ہم بدلیں نہیں، تو جامد ہو جائیں۔۔۔۔ ہم ملے بھی تو پندرہ برسوں کے بعد میں۔ آیئے، ایک بیئر ہو جائے۔"

ہیتھرو کا ہوائی اڈہ یورپ کے مصروف ترین اڈوں میں سے ایک ہے۔ ہر طرف گہما گہمی، قسم قسم کی زبانوں میں گفتگو، چہل پہل، لیکن ریل پیل نہیں۔ ٹرانزٹ لاؤنج کا ماحول خود میں ایک کشش رکھتا ہے۔ گدے دار کرسیوں پر لوگ بیٹھے یا اونگھتے ہوئے۔ کچھ لوگ ڈیوٹی فری دکانوں کا طواف کرتے ہوئے، کچھ وقت کشی کیلئے بے ارادہ ٹہلتے ہوئے اور کچھ میری طرح اخبار پڑھتے ہوئے۔ میں وارسا سے لندن تک پولش ایئر لائنز کی صبح کی فلائیٹ سے پہنچا تھا۔ اور مجھے دس گھنٹوں کے انتظار کے بعد ایئر کینیڈا کی فلائٹ ٹورنٹو کیلئے پکڑنی تھی۔ ابھی چار گھنٹے ہی گزرے تھے، مجھے کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اخبار کو تہہ کیا اپنی پڑھنے والی عینک اتاری۔ تبھی مجھے محسوس ہوا جیسے مجھ سے دس قدم دور کھڑا ہوا ایئر پورٹ سیکورٹی کی وردی میں ملبوس ایک شخص مجھے بنظرِ غور دیکھ رہا ہے۔ رنگ اور چہرے کے خدوخال سے وہ ہندوستانی نژاد تھا۔ لیکن اس کی غیر معمولی توجہ میرے لیے سر درد کا سبب بن گئی۔ طیاروں کے اغواء اور بین الاقوامی دہشت گردی کے اس زمانے میں کون ایسا ہوائی مسافر ہو گا جو ہوائی سیکورٹی کے کسی کارندے سے الجھنے کی کوشش کرے گا؟ میں نے پہلو بدلا۔ تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی۔ لیکن لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے اخبار پھر پوری طرح کھول کر اپنے چہرے کے سامنے کر لیا۔ ایک منٹ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ایئر پورٹ سیکورٹی کا کارندہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اخبار ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ "جی۔۔۔۔؟"

میں نے انگریزی میں کہا۔ "کیا بات ہے؟"

خلاف توقع وہ پنجابی میں بولا۔ "بھرا جی۔ آنند صاحب؟"

"جی۔۔۔!" میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ "آپ کو پہچانا نہیں میں نے؟"

وہ آگے بڑھ آیا۔ "اوئے بھرا جی۔ آپ نے اجیت سنگھ کو نہیں پہچانا؟ جیتو کو؟ اپنے چھوٹے بھائی کو؟ اپنے غلام کو؟" اپنے ہاتھوں سے میرے گھٹنے چھوتے ہوئے اس نے احترام کا مظاہرہ کیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے مجھے اٹھاتے ہوئے مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

"میں جی۔ میں آپ کا جیتو۔ آپ کا چھوٹا بھائی۔ آپ کا غلام جی!" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "آپ نے مجھے نہیں پہچانا جی؟ آپ کو تو روز یاد کرتا ہوں۔ اب پنجاب میں میرا کون ہے؟ آپ بھی مجھے بھول گئے جی؟"

"اجیت سنگھ!" میں نے کہا۔ "ارے تم ہو میرے بھائی! میں نے تو سوچا کوئی سیکورٹی کا افسر میری تلاشی لینے کے درپے ہے۔" میں نے پھر اسے گلے سے لگا لیا۔ "تمہیں کیسے بھولوں گا۔ میرے عزیز! کیا میں پنجاب کے سب سے بڑے پیراک اور اپنے دوست کو بھول سکتا ہوں؟"

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ جب میں نے دیکھا آپ کو تو میں نے کہا، دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے، میں غلطی نہیں کر سکتا۔ یہ میرے بھرا جی ہیں، تب میں نے سوچا، دیکھوں مجھے پہچانتے ہیں بھی کہ نہیں؟"

میں نے بھرپور نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ بیس برس پہلے اجیت سنگھ میری آنکھوں کے سامنے ابھر آیا۔ یوں تنا ہوا سینہ، بھرا ہوا چہرا، جس پر ابھی مسیں پھوٹی ہی تھیں۔ آنکھوں میں شروع جوانی کی خمار مستی اور اس پر بازوؤں کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں۔ جو ایک پیراک کی خاصہ تھیں۔ اجیت سنگھ، عرف جیتو، جو سارے دیہاتی علاقے کا مانا ہوا پیراک تھا، جس نے ہر سال دیہات کے صوبائی کھیلوں کے مقابلوں میں تالاب کی دو دو سو بار لمبائیاں تیر کر کھلاڑیوں اور منتظمین سے اپنا لوہا منوایا تھا۔ اجیت سنگھ، جس پر گاؤں کی الھڑ دوشیزائیں مرتی تھیں۔ جو الجبرے اور جیومیٹری میں تو ہر بار فیل ہوتا تھا لیکن تیراکی کے مقابلوں میں ہر بار پہلا انعام جیتا کرتا تھا۔

جیتو!

وہی جیتو تھا لیکن کتنا مختلف! جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا اس کے گال پچکے ہوئے تھے، سر کے بال پکتے ہوتے ہوئے غائب ہونے لگے تھے۔ اس کا سینہ ابھرا ہوا تھا لیکن سانس ایک دمے کے مریض کی طرح تھی۔ چالیس ایک برس کا ہوتے ہوئے بھی وہ پچاس پچپن سے کم کا دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ ہاں اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ زندگی کی روشنی کی وہ لہر تھی جو مدوجزر کے انخلاء کے بعد بھی آتی جاتی رہتی ہے۔ جب اس روشنی کی لہر نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تو میں نے پوچھا۔

"پندرہ برسوں میں ایک بار بھی واپس وطن نہیں گئے؟"

اور تب مجھے ایک لمحے کیلئے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی روح ایک صاف تہہ شدہ رومال کی طرح اس کی آنکھوں سے نکلی ہو۔ تھوڑی دیر کیلئے ہوا میں معلق رہی ہو اور۔۔۔۔ پھر ایئر انڈیا کے طیارے کے پیچھے اڑ گئی ہو۔

ہم لوگوں نے ایک ایک بیئر پی۔ پھر اس نے کہا۔ "بھرا جی! آپ تھوڑی دیر بیٹھے میں آدھ

گھنٹہ کی شارٹ لیو (قلیل المدت چھٹی) لے کر آتا ہوں۔ پھر تسلی اور دل جمعی سے بیٹھیں گے۔"

جب وہ چلا گیا اور میں نے بئر کا ایک اور مگ سامنے رکھ لیا تو یادوں کے ریلے میں ہیتھرو کے ہوائی اڈے کی بار کا ماحول بہہ گیا۔ اور میں پندرہ بیس برس پہلے کی اس دنیا میں پہنچ گیا جہاں میں یونیورسٹی پروفیسر نہ تھا۔ اور اجیت سنگھ ایئرپورٹ سیکورٹی کا کارندہ نہ تھا۔ جہاں ہم دونوں گھگن کے رفیق تھے۔

اجیت سنگھ مجھ سے تین برس چھوٹا تھا۔ صوبیدار بہروت سنگھ کا لڑکا۔ الہڑ، اکھڑ، تند مزاج، لیکن بہت ہی پیارا، دوستوں کا دوست، یاروں کا یار۔ اس کے والد کو اٹلی کے مورچے پر لاثانی بہادری کیلئے وکٹوریا کراس ملا تھا جو برطانوی سلطنت کا سب سے بڑا فوجی اعزاز تھا۔ مشہور تھا کہ صوبیدار بہروت سنگھ اپنا دایاں ہاتھ دستانے میں ہمیشہ اس لئے رکھتے تھے کہ جس ہاتھ کو تمغہ سینے پر آویزاں ہونے کے بعد فرمانروائے انگلستان سے ملانے کا اعزاز عطا ہوا ہو وہ اب کسی اور معمولی شخص سے ملانا ہتک عزت ہے۔ صرف اجیت سنگھ یا اس کے قریبی دوستوں کو ہی اس بات کا علم تھا کہ صوبیدار صاحب کا دایاں ہاتھ کٹا ہوا تھا اور اس کی جگہ ربڑ کا مصنوعی ہاتھ تھا۔ جس پر وہ ہمیشہ دستانہ چڑھا کر رکھتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس مصنوعی ہاتھ کی انگلیاں قدرتی ہاتھ کی طرح چلتی تھیں۔ اس میں وہ گلاس پکڑ سکتے تھے، گانٹھ کھول سکتے تھے۔ ستر برس سے اوپر کی عمر ہونے کے باوجود اپنے بڑھاپے کی اولاد اجیت سنگھ کی پٹائی کر سکتے تھے۔ اجیت سنگھ کی ماں تو اسے پیدا کرتے ہی مر گئی تھی۔ ایک بوڑھی پھوپھی نے اسے پالا تھا۔ لیکن وہ بھی اجیت سنگھ کی کم عمری میں ہی خدا کو پیاری ہو گئی تھی۔

جیتو پہلی بار چھٹی جماعت میں فیل ہوا۔ میں تب نویں جماعت میں تھا۔ نتیجے کے دن گھر پر اس کی خوب پٹائی ہوئی لیکن ایک ہفتے کے بعد ضلع کے پیراکی کے مقابلوں میں اول آنے پر اسے تمغہ، سرٹیفکیٹ اور دو سو روپے نقد انعام میں ملے۔ تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے ذاتی اختیارات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ساتویں جماعت میں بٹھا دیا۔ اس کے بعد جب محکمہ تعلیم سے کھیلوں، جسمانی مقابلوں اور پی ٹی کا اختیاری مضمون وجود میں آ گیا تو جیتو کے دن بدل گئے۔

مجھے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہے جب ہم سب نے جلوس کی شکل میں جیتو کو پھولوں کے ہار پہنا کر بس پر بٹھایا تھا کہ وہ ضلع کے صدر مقام پر جا کر اپنی تیراکی کا مظاہرہ کر سکے۔ مقابلہ مختلف ضلعوں کے کھلاڑیوں میں تھا۔ گاؤں کے تالاب اور نواحی گاؤں کی جھیلوں اور نہروں میں تیرنے والے جیتو نے نہ صرف ہر مقابلہ جیتا اور کئی ریکارڈ توڑ دیے بلکہ تماشائیوں کی خاص فرمائش اور ڈپٹی کمشنر صاحب کے ایک خاص ذاتی انعام کے اعلان کے بعد سوئمنگ پول کے چھ گھنٹوں میں 180 چکر پورے کر کے صوبائی ریکارڈ بھی توڑ دیا تھا۔ اخباروں میں اس کی تصویریں چھپیں تو ان کے تراشے کئی مہینوں تک ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں دیواروں پر آویزاں رہے۔ اس کے والد نے تراشوں کو فریم کروا کے اپنی فوجی تصویروں کے ساتھ لٹکایا۔ اور وہ دن میں کیسے بھولوں گا جب آدھی رات کے وقت میری بیٹھک کے باہر گلی میں کھلنے والے دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھولا تو جیتو کو کھڑے پایا۔ اس کے پیچھے سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے ہوئے ایک شبیہہ تھی جو سردی سے کانپ رہی تھی۔

"جیتو!۔۔۔۔ اندر آجاؤ۔ کیا بات ہے؟ کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"بھراجی! ہرجس کور ہے، چرن سنگھ کی بہن۔" اس نے کہا "میں اندر نہیں آؤں گا، مجھے آپ کی موٹر سائیکل چاہیے، مجھے اسے شہر لے جانا ہے۔"

"جیتو! اندر تو آؤ۔" میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ اس کے پیچھے ہرجس کور بھی جھجکتی، کپکپاتی ہوئی اندر آ گئی۔ "بیٹھ جاؤ، ہرجس کور۔" میں نے کہا "ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

"اس کی شادی کر رہے ہیں جی، پرسوں، ماما والے کے زمیندار جوگندر سنگھ کے ساتھ۔ جوگندر سنگھ پچاس سال کا ہے اور اس کے بھائی نے پانچ ہزار روپے لئے ہیں اس سے۔۔۔۔ میں نہیں ہونے دوں گا یہ شادی! واہگورو کی سوگند کبھی نہیں ہونے دوں گا!"

"شہر میں کہاں لے جا رہے ہو اسے؟"

"ڈی سی صاحب کے پاس جی۔۔۔۔ ابھی پچھلے ہفتے تو انہوں نے کہا تھا جیتو! جب جی چاہے میری کوٹھی آ جایا کرو۔۔۔۔ میں ان کے لڑکے کو تیرنا سکھاتا ہوں۔ بھراجی۔۔۔۔ بڑے اچھے افسر ہیں۔ خود تیراک رہے ہیں، مجھے مدراس مقابلے کیلئے بھیج رہے ہیں۔ کہتے ہیں روس بھی بھیجیں گے۔ انہیں کہوں گا، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اٹھارہ برس کی لڑکی کا بیاہ اس کی مرضی کے بغیر ہی کر دیا جائے؟ عدالت میں اس سے شادی کروں گا جی!"

جیتو ہرجس کور کو لے کر ڈی سی صاحب کے پاس نہیں گیا کیونکہ اسی وقت میری ماں اور میرے والد اندر سے آ گئے اور انہوں نے چرن سنگھ کو بلا کر اس کی بہن کو اس کے حوالے کر دیا۔ صوبیدار بہروت سنگھ بھی آ گئے۔ اور جب سمجھانے بجھانے کے بعد جیتو بھی ان کے ساتھ چپ چاپ چلا گیا تو میں نے سوچا، یہ جیتو کی زندگی کی سب سے بڑی شکست ہے اب وہ کبھی تیراکی کے مقابلے نہیں جیت سکے گا۔ کبھی سر اٹھا کر گاؤں کی گلیوں میں نہیں چل سکے گا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ریت کی طرح خشک ہو کر نیم جان ہو جائیں گی۔ وہ ٹوٹ جائے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ گاؤں چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ اس نے کسی کلب کے سوئمنگ پول میں لائف گارڈ کی نوکری کر لی ہے۔ چھ ماہ میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ گاؤں لوٹا تو میں یونیورسٹی میں داخلے کیلئے شہر جا چکا تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ میرے ہوسٹل میں مجھ سے ملنے آیا۔

"بھراجی! ایک مقابلے کیلئے یہاں آیا تھا۔ آپ سے ملے بغیر کیسے جا سکتا تھا۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک سنجیدگی تھی۔ ایک ٹھہراؤ تھا، زندگی نے اسے سوچنا سکھا دیا تھا۔ "کیا پروگرام ہے اب؟" میں نے پوچھا تھا۔

"بھراجی" اس نے کہا تھا "میں مدراس بھی گیا تھا۔ دھنش کوٹی کے ساحل سے لنکا تک تیرا جا سکتا ہے۔ کئی لوگوں نے یہ فاصلہ عبور بھی کیا ہے۔ مجھے مدراس کی ایک کلب سے آفر بھی ہے، میں آپ کی دعا سے یہ دوری طے کر لوں گا۔"

"بہت خوب، اجیت" میں نے کہا تھا۔ "وہ دن بھی آئے گا جب تم انگلش چینل پار کرو گے۔"

"وہ کہاں ہے بھراجی؟" اس کی آنکھوں کی چمک اور گہری ہو گئی تھی۔

اور تب میں نے اسے انگلستان اور فرانس کے ساحلوں کو دھوتے ہوئے اس چھوٹے سمندر کا ذکر کیا تھا جو 24 کلومیٹر چوڑا ہے اور جسے تیر کر پار کرنے والے ایک نہیں درجنوں ایسے تیراک ہیں جو کئی کئی برس کی مشق اور کئی بار کی کوشش کے بعد کامیاب ہوئے ہیں۔ میں نے اٹلس نکال کر اسے پوری تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔ "انہی دنوں۔۔۔۔" میں نے اسے بتایا تھا "ایک بنگالی نوجوان نے بھی یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اور شاید ایک یا ایک سے زیادہ عورتیں بھی اسے تیر کر پار کر چکی ہیں۔"

"اس کیلئے انگلستان جانا پڑے گا؟" اس نے پوچھا۔ "پاسپورٹ بنوانا پڑے گا؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اور ویزا بھی لینا پڑے گا جو ذرا زیادہ مشکل کام ہے۔"

بائیس تئیس برس کا جیتو، جسے تیراکی کے سب چیلنج پسند تھے، جو عورت کے پیار کی بازی ہار

چکا تھا۔ جب میرے کمرے سے گیا تو پوری تفصیل لکھ کر دے گیا ایک امید کے ساتھ جو اسے ایک دن انگلستان لے جا کر یہ مقابلہ جیتنے میں مددگار ثابت ہو گی۔

یادوں کے بادل گہرے ہوتے چلے گئے۔ میں نے مختر سلگوائی اور پھر ماضی کے دھندلکے میں کھو گیا۔

میں جب گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دو بار گاؤں گیا تو جیتو کی خبریں ملیں، وہ فلاں مقابلے میں اوّل آیا۔ اسے فلاں انعام ملا۔ فلاں افسر یا وزیر نے اسے ولایت بھیجنے کا وعدہ کیا اور صوبائی صدر مقام پر آکر ملنے کیلئے کہا۔ فلاں جگہ بھرے ہوئے جلسے میں یہ کہا گیا کہ جیتو دنیا کا سب سے عمدہ تیراک ہے اور اگر اسے باقاعدہ ٹریننگ ملے تو وہ اولمپک کھیلوں کے مقابلے میں سونے کا تمغہ جیت سکتا ہے۔ لیکن ہر بار یہ بھی سننے کو ملتا کہ بسیار کوششوں کے باوجود جیتو کی شنوائی سرکار کے ان طبقوں تک نہ ہوئی جو ان کاموں کیلئے رقمیں مخصوص کرتے ہیں یا کھلاڑیوں کی فہرست کو آخری شکل دیتے ہیں، ہر بار اس کی جگہ کسی سفارشی کا نام ڈال دیا جاتا اور اس کی پیٹھ تھپتھپا کر، اس کی تعریف کے پل باندھ کر افسر لوگ اسے کہہ دیتے کہ اگلی بار تمہارا نام ضرور سر فہرست ہو گا۔

یونیورسٹی میں لیکچرر رہنے کے بعد میرا گاؤں آنا جانا بالکل ہی بند ہو گیا۔ زندگی ایک دوسری ڈگر پر چلنے لگی۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیلئے امریکہ گیا تو تین برس لگ گئے۔ اس کے بعد بھی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کیلئے کئی بار بیرون ملک جانا پڑا۔ اس لئے جیتو سے تعلق تو ایک طرح اختتام کی منزل تک پہنچ گیا۔

کئی برسوں کے بعد گاؤں کے اسکول سے ایک ٹیچر کسی ذاتی کام سے یونیورسٹی میں آئے اور مجھے ازراہ عنایت ملے تو انہوں نے بتایا کہ جیتو انگلستان پہنچ گیا ہے۔

میں بہت حیران ہوا "وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت مایوس ہو گیا تھا بے چارہ!" وہ بولے۔ "بھارت سے سری لنکا کا فاصلہ ایک بار نہیں دو بار اس نے طے کیا۔ اودے پور، راجستھان کی اودے ساگر جھیل کا گولائی میں چار بار طواف کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ لیکن اسے باہر جانے کیلئے مالی امداد کسی نے بھی نہ دی۔ وزیروں، افسروں اور کھیل مقابلوں کے کارکنوں کے وعدے کبھی پورے نہ ہوئے۔ بے چارے کو قدم قدم پر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ---- پھر ایک دن گاؤں آ کر اس نے اپنے کھیت اور اپنا مکان بیچ دیئے اور جو تیس چالیس ہزار ملے وہ ایک ٹریول ایجنٹ کو دے کر جعلی ویزے پر ایران اور پھر وہاں سے ترکی پہنچ گیا۔ وہاں سے مغربی جرمنی اور کئی ایک مہینوں کے بعد انگلستان۔ نہ معلوم یہ سارا سفر اس نے کیسے طے کیا۔ لیکن مجھے اس کے خط باقاعدگی سے ملتے رہے اور مجھے علم ہوتا رہا کہ وہ کہاں ہے ---- میرے خیال میں اب اسے انگلستان میں قانونی طور پر رہنے اور کام کرنے کی اجازت ملی ہوئی ہے۔"

"یہ تو بہت مزے کی خبر ہے۔" میں نے کہا "اس کی بچپن کی یہ خواہش تھی کہ وہ تیر کر انگلش چینل کو پار کرے۔ ابھی اخبار میں تو کوئی خبر نہیں آئی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہو گا۔"

"بھراجی ---- !" جیتو مجھے یادوں کے گہرے دھندلکے سے واپس ہیتھرو کی بھیڑ کے ماحول میں کھینچ لایا۔ "معاف کریں۔ مجھے دیر ہو گئی۔"

"آپ کی فلائٹ گیٹ نمبر 12 پر ہے۔ ہمارے پاس وقت ہے۔ آیئے کچھ پیٹ پوجا کر لیں۔"

ہم دونوں ٹرانزٹ لاؤنج کے ریسٹوران میں چلے گئے۔ وہ اداس تھا۔ لیکن اس اداسی کی مہین چادر کے اوپر بھی ایک اور دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ جس سے وہ بار بار اپنے دل کی کشمکش کو چھپا رہا تھا۔ "آپ کیلئے کیا تحفہ لاتا، بھراجی ---- " اس نے کہا۔ "آپ تو ساری دنیا گھوم چکے ہیں۔ آپ کیلئے کون سی چیز نئی ہے؟ بس میری تو دعا ہے کہ واہگورو آپ کو سکھی رکھیں۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ "جیتو! پنجاب لوٹ جاؤ۔ یہاں کی آب و ہوا نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"کہاں جاؤں گا، بھراجی؟ وہاں اب میرا کون ہے؟ یہاں بھی اپنے ہیں، دوست یار، بھائی بند، میری زبان بولنے والے، ایئرپورٹ پر کئی علاقے کے لوگوں سے بھی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔"

"تمہاری صحت کو کیا ہوا جیتو؟" میں نے آخر پوچھ ہی لیا۔

"بھراجی! صحت تو ترکی میں ہی خراب ہونے لگی تھی۔ کئی مہینوں ہوٹلوں میں برتن دھوئے، کاریں صاف کیں۔ عمارت سازی کے کارخانوں میں کام لیا۔ کام کا پرمٹ نہ ہونے کی وجہ سے جرمنی میں جیل بھی کاٹی۔ پھر یہاں جعلی پاسپورٹ پر پہنچا۔ اجیت سنگھ تو ایک عام نام ہے۔ اس نام کے پاسپورٹ اور ویزے عام ملتے ہیں۔ یہاں آکر پہلے کپڑے کی ملوں میں کام کیا۔ کچھ مہینے کوئلے کی کانوں میں بھی کام کرنا پڑا۔ تب نمونیا ہو گیا۔ پھر پلیورسی ہو گئی اور ایک پھیپھڑے میں پانی بھر گیا۔ علاج ٹھیک ہو گیا ---- ڈاکٹر کہتے تھے، میں نے تیر تیر کر اپنے پھیپھڑوں کی حالت ہی خراب کر لی ہے۔" وہ ہنسا۔ "خیر علاج ہو گیا۔ پھر لندن آ گیا۔ اب آٹھ برس سے یہاں ہوں۔ ایئرپورٹ سیکورٹی میں اچھی نوکری ہے۔ چھ سات سو پاؤنڈ مل جاتا ہے اور گزارہ مزے سے ہو رہا ہے۔"

"اور تمہاری تیراکی کا شوق، جیتو؟"

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کیلئے روشنی سی لہرا گئی۔ لیکن وہ چپ رہا۔

"اور انگلش چینل کو عبور کرنے کا عزم؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا، اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "انگلش چینل تو میں نے عبور کر لیا، بھراجی!" اس نے کہا۔ "پوری طرح عبور کر لیا ---- وہ دیکھئے۔" اس نے دائیں طرف اشارہ کیا۔ کچھ دوری پر ایک گوری انگریز عورت مسکراتی ہوئی ہماری طرف آ رہی تھی۔ "آپ کو ملوانے کیلئے اسے کام سے بلوا لیا ہے۔ خاص طور پر کہا کہ آ جائے اور اپنے جیٹھ بھائی سے مل لے۔"

اس سے پہلے کہ میں حیرت میں ڈوبا ہوا اس سے کچھ پوچھ سکتا۔ قریب آنے والی گوری عورت کو اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر میرے سامنے کر دیا۔ "یہ میگی ہے جی! مارگریٹ سنگھ، میری بیوی ---- میرے بیٹے کی ماں ---- اینڈ دس از مائی بردر، مائی فرینڈ، مائی بھراجی!"

اس نے انگریزی میں اسے میرا تعارف کرا دیا۔ "ہماری شادی، بھراجی آٹھ برس پہلے ہوئی تھی۔ میگی ہسپتال میں نرس ہے۔ اس نے میری بیماری کے دنوں میں میری خدمت کی تھی۔" اس نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ "بھراجی از آن ہز وے ٹو کینیڈا۔" اس نے اسے انگریزی میں بتایا۔

میں نے کہا۔ "مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ---- میری دعا ہے کہ آپ دونوں خوش رہیں۔"

میگی نے انگریزی میں کہا۔ "میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اجیت ملا۔ میں اسے بہت پیار کرتی ہوں۔ اور اس کا بہت خیال رکھتی ہوں۔"

اور گیٹ نمبر 12 کی طرف بڑھتے ہوئے جیتو نے کہا۔ "بھراجی اب تو آپ کو یقین آ گیا کہ میں نے انگلش چینل کو عبور کر لیا ہے۔"

"ہاں!" میں نے کہا۔ "گاؤں کے تالاب سے انگلش چینل تک کا فاصلہ تم نے خوبی پار کر لیا جیتو!" ---- میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔

* * *

صلیبِ ملامت

ارشاد احمد صدیقی

سلور گرے BMW ایبٹ آباد سے نکل کر مانگی کی پر پیچ سڑک پر سرعت سے مانسہرہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کار کے پچھلی سیٹ پر معمر امریکن اٹارنی قتیل عبداللہ اور اس کی بی بی ڈور تھی شلوار قمیض میں ملبوس دوپٹے سے سر ڈھانپے بیٹھی تھی، وہ دیر سے خاموش اپنی اپنی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قتیل نے گردن گھما کر ڈور تھی کی طرف دیکھا اور آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ڈور تھی نے مسکرا کر قتیل کی طرف دیکھا اور اپنے ہاتھ کی گرفت اس کے ہاتھ پر مضبوط کر لی۔ وہ شان بابا کے سالانہ عرس میں شرکت کیلئے نیویارک سے آئے تھے۔ شان، قتیل کا گہرا دوست تھا۔ وہ دونوں رائی فیلر یونیورسٹی (نیویارک) میں طالب علم تھے۔ قتیل لاء کی طرف راغب تھا۔ شان ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ شان اپنے والد جاگیردار خان محمد سلیمان خان کی برسی پر پاکستان آیا تھا اور پھر لوٹ کر نہیں گیا۔ شان نے قتیل کو لکھا تھا۔ "اب شاید ہی ملاقات ہو، میری زندگی کے دھارے بدل چکے ہیں، میں جرم و سزا کی خاردار سرحد پر زخم زخم کھڑا ہوں۔ کیا سزا جرم کی اہل ہو سکتی ہے۔ "There is no salration without punishment." قتیل واحد شخص تھا جس سے شان کی خط و کتابت مدت تک جاری رہی۔ وہ اس کے گہرے غم کا امین تھا۔

شان نے خاندان کی مخالفت کے باوجود ایک چھوٹا سا مطب کھولا۔ مزدور بھرتی کئے، گاؤں گاؤں پھر کر نادار کنبوں کی جھونپڑیوں کی مرمت کی۔ نئی جھونپڑیاں تعمیر کیں۔ بیماریوں کا علاج کیا مفت دوائیاں تقسیم کیں۔ پھر اس پر چپ کے دورے پڑنے لگے۔ مولانا جلال الدین رومی کا دیوان، ملٹن کی Paradise Lost اور دیوان غالب اس کی ہم سفر رہیں۔ وہ ہر صبح مطب کھولتا۔ نادار مریضوں کو دیکھتا، دوائیاں دیتا، باتیں کم ہی کرتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ مطب کے سامنے دری بچھا کر چٹان سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ لوگ اس کے گرد جمع رہتے۔ دعا کی التجا کرتے اور جب دو وقت ملنے لگتے تو شان ہاتھ بلند کر کے دعا مانگتا۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے ..... پھر وہ مطب ہی میں رہنے لگا۔ ہجوم دن رات اس کے مطب کے گرد موجود رہتا۔ لوگ دعا کی قبولیت کے نذرانے لے کر آتے۔ اس دوران اس نے قتیل کو لکھا تھا۔ "خدا وہ دن نہ لائے کہ یہ لوگ میری پوجا کرنے لگیں۔ یہ کتنے سادہ دل لوگ ہیں، میں انہیں کیسے سمجھاؤں؟ ان کے دکھ کتنے گہرے ہیں، ان کی سوچ کتنی محدود ہے، ان کا کوئی گوتم نہیں، کوئی عیسیٰ، کوئی رسول نہیں، اگر ہے تو صرف خدا ہے جسے وہ نہیں جانتے۔"

قتیل نے آنکھیں بند کر کے کاہلی سے اپنا سر سیٹ کی پشت پر رکھ دیا اور اس کے ذہن میں شان کی ڈائری کے اوراق (جو اس کے پاس محفوظ تھی) الٹنے لگے ..... گزرے دنوں کی پرچھائیاں مجسم ہونے لگیں۔

"گذشتہ ہفتے سے موسم خراب تھا۔ برفباری بھی تھی لیکن کہر اور سماگ نے سارے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ٹریفک سڑک پر رینگ رہی تھی۔ سبھی محتاط تھے۔ میں عموماً سنی سائیڈ (کوئینز) سے سب وے میں ہی رائی فیلر یونیورسٹی جاتا تھا۔ لیکن آج کار لانا ضروری تھی کیونکہ مجھے کالج کے بعد نیو جرسی میں قتیل عبداللہ کے رشتہ داروں کی شادی میں شرکت کرنا تھی۔ قتیل نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ ڈور تھی کو ساتھ لے کر آنا۔ ڈور تھی میری کلاس فیلو تھی۔ اسے پاکستانی رہن سہن اور کلچر کا تجسس تھا۔ اس سے قبل میں نے ڈور تھی کو کالج کے بعد ملنے کا کبھی نہ کہا تھا۔ البتہ ہم لنچ یا کافی کیلئے کیفے ٹیریا میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ قتیل بھی کبھی کبھی آجاتا تھا۔ قتیل ڈور تھی کو پسند کرتا تھا لیکن وہ قتیل کی طرف کم ہی توجہ دیتی۔ اسے مروت اور خوش دلی سے ملتی تھی، ڈور تھی کو شادی میں شرکت کی دعوت پر بہت ہی خوشی ہوئی۔ اس نے خوشی میرے ساتھ جانے کی نہ صرف حامی بھر لی بلکہ بڑی جذباتی مسرت کا اظہار بھی کیا۔

ٹریفک بدستور رینگ رہی تھی، برف کے گالے بے ترتیبی سے اتر رہے تھے، سڑک پر پھسلن محسوس ہو رہی تھی، ریڈیو خطرناک موسمی خبریں سنا رہا تھا۔ اب میں کوئینز بلوارڈ پر تھا، ٹریفک مناسب رفتار سے چل رہی تھی۔ شاید سبھی کو وقت مقررہ منزل تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ اچانک میری دائیں لین سے ایک ٹرک تیزی سے بے قابو ہو کر پھسلتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میری چاروں طرف کاروں کے کارواں تھے۔ ٹرک ایک دھماکے کے ساتھ میری کار سے ٹکرایا۔ میری کار بائیں طرف کار سے ٹکرائی۔ میری کار کے عقب سے ایک زوردار جھٹکا لگا، بہت سی کاریں بے قابو ہو گئیں۔ دھماکوں اور بریکوں کی چنگھاڑ کے ساتھ میری ٹانگوں میں شدت کا درد سرایت کر گیا۔ میرے سینے میں تکلیف دہ ٹیس اٹھی۔ میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ گہرا اندھیرا اور تیز بارش، میرا الجھتا ہوا جسم پرواز کرنے لگا۔ دور خلاؤں سے ابھرتی موسیقی کی یکسانیت ناگوار محسوس ہونے لگی۔ ہوا کے یخ بستہ جھونکے جسم کو منجمد کرنے لگے۔ میرا جسم بدستور بارش میں بھیگ رہا تھا۔ بارش کے قطرے جسم کو تکلیف دے رہے تھے۔ میں بدستور محو پرواز تھا۔ وہ موسیقی، وہ ناگوار موسیقی قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ یخ بستہ درد کی ٹیس اٹھی، اچانک اندھیرا گہرا ہو گیا، جیسے ہم کسی غار ہی میں داخل ہو گئے ہوں۔ یخ بستہ ہواؤں کے منہ زور جھونکے تھم گئے۔ درد کی ٹیس رک گئی۔ میں آرام سے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ خوشگوار ہوا میرے سانسوں میں بس گئی، میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن سورج کی تیز کرنوں سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ میرے جسم کو ہلکا ہلکا سرور میسر تھا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ مجھے نیند آ گئی۔ صبح صبح میری آنکھ کھلی تو کوئی میرا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن آنکھیں بدستور سو رہی تھیں۔ شاید یہ میری امی کی آواز تھی، وہ کہہ رہی تھیں اتنی جلدی جاگنے کی کیا پڑی ہے، تھوڑی دیر اور آرام کر لو، ماسی روشو تمہارے لئے ناشتہ کمرے میں

لے آئے گی۔ ماسی روشو ہماری پرانی خدمتگار تھی۔ اس نے ماں کی طرح ہمیں پالا تھا۔ دن رات ہماری دیکھ بھال میں جتی رہتی تھی۔ شام کو ہم کالے بابا کے ساتھ سیر کو جاتے تھے۔ اس کا نام کالا خان تھا لیکن ہم اسے کالا بابا کہتے تھے۔ بعض اوقات ہم سیر کرتے ڈاک بنگلے تک چلے جاتے تھے۔ ڈاک بنگلے کا محافظ، پہاڑی میر زمان کالے بابا کا دوست تھا۔ ہمارے آتے ہی چائے کی کیتلی چولہے پر رکھ دیتا۔ ہمیں چائے اور بسکٹ دیتا۔ کالا بابا اور پہاڑی میر زمان اپنے لئے علیحدہ چائے بناتے اور باورچی خانے کے سامنے پیڑھیوں پر بیٹھ کر کڑوے تمباکو کی چلم اور چائے پیتے۔ ہم ڈاک بنگلے کے پیچھے پہاڑی پر جاتے۔ جہاں ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے جسم میں خوشگوار کپکپی پیدا کرتے۔ چیل کے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ پراسرار سرگوشیاں کرتی۔ اس پہاڑی پر یہ چٹان ہمارا نشان تھی۔ ہم اس چٹان سے پشت لگا کر "او ہو او ....." کی زور سے آواز لگاتے ہماری آواز وادی کے اس پار پہاڑ سے ٹکرا کر لوٹتی اور فضا میں ایک بار پھر "او ہو او ....." کی صدا گونج جاتی۔ جھاڑیوں سے خرگوش نکل کر دوسری جھاڑی میں روپوش ہو جاتا۔ کالا بابا کہتا پہاڑ بابا نے تمہاری آواز سن کر جواب دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہاڑ بابا تم سے خوش ہے۔ ہم شام کے اندھیرے اترنے سے پہلے گھر لوٹ آتے۔ میرا سر امی کی راحت انگیز گود میں رکھا تھا۔ وہ اپنی انگلیوں سے میرے بال سنوار رہی تھیں اور ساتھ ساتھ گنگنا رہی تھی۔

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تیری گلی میں

انہوں نے اچھی طرح مجھے کمبل میں ڈھانپ دیا اور اٹھ کر چلی گئیں۔ سارا گھر اچانک خاموش ہو گیا۔ یہ سارے کہاں چلے گئے؟ مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟ دور سے آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید مہمان آئے ہیں، وہ بڑے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟ میں تو جاگ رہا ہوں یا میں سویا ہوا ہوں؟ میرے بازو میں ہلکی سی چبھن محسوس ہوئی۔ میری امی نے میرا سر سہلایا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئیں۔ ہمارے گھر کے صحن میں بڑے درخت کے ساتھ جھولا لٹکا ہوا تھا۔ میں جھولے میں بیٹھا آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔ میں نے کمبل سے اپنے آپ کو ڈھانپ رکھا تھا۔

ماسی روشو ناشتہ لے کر آئے گی، ابھی تو رات ہے سارے سو گئے ہیں۔ رات کی ہوا میں بڑی تازگی ہے، میری سانس خوشگوار ہے، سارے سو گئے ہیں۔ میری آنکھ کھلی، اچانک اجنبی ماحول کا احساس ہوا۔ میری چارپائی کے گرد پردہ لٹک رہا تھا، میری ناک میں آکسیجن کی نالیاں تھیں۔ میرا جسم چور چور تھا۔ میں ہسپتال میں تھا، میرے بازو سلامت تھے، میں نے گھنٹی بجائی، نرس مسکراتی ہوئی آئی۔ ہم سوچ رہے تھے آپ کے جاگنے کا وقت ہو چکا ہے۔"

"میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"

"جی آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ یاد ہے؟ ..... میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔" وہ گھبرائی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ قدرے سفید بالوں اور مہربان چہرے والا ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔

"میں ڈاکٹر جمز سنائیرگ ہوں، کیسے ہیں آپ؟" اس نے مسکرا کر کہا۔

"معلوم نہیں ..... !"

"آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، آپ اس وقت انٹر سٹ میڈیکل سنٹر کے ایمرجنسی وارڈ میں ہیں۔ مسٹر شان آپ خوش قسمت ہیں کیونکہ حادثے کی جو تفصیلات مجھے ملی ہیں، ایسے حادثے سے سلامت بچ جانا معجزہ ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی بائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے جو زیادہ تشویش کی بات نہیں۔ آپ کی پسلیوں پر زور پڑا ہے، لیکن ٹوٹی نہیں۔ جسم پر معمولی خراشیں آئی ہیں۔ آپ کا آپریشن کامیاب رہا۔ آپ کی ٹانگ میں ہڈی کو جوڑنے کیلئے لوہے کی پلیٹ لگائی گئی ہے جو بعد میں اتاری جا سکتی ہے۔ ٹانگ کے پلاسٹر کی وجہ سے تو نہیں البتہ پسلیوں کے پلاسٹر کی وجہ سے شاید آپ کو الجھن محسوس ہو لیکن یہ ضروری تھا۔ آپ کی گردن کے گرد جو ہالہ باندھا گیا ہے وہ عارضی ہے۔ آپ کی گردن بالکل محفوظ ہے، ایکسیڈنٹ میں گردن کو جھٹکا ضرور لگا ہے لیکن آپ کی سیٹ بیلٹ اور آپ کی کار کے ایئر بیگ نے آپ کو محفوظ رکھا..... آپ کو کم از کم چوبیس گھنٹے بستر پر ہی رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ آپ جسمانی طور پر (اس حادثے کے باوجود) بہت ہی بہتر ہیں۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی سوال ہو تو کہیے؟" ڈاکٹر مسکراتا ہوا مجھے دیکھتا رہا۔ میرے ذہن میں بہت سے سوالات تھے لیکن میں اس سے کیا پوچھتا؟ میں اسے گھورتا رہا۔

"اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں آپ کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے میری آنکھوں میں روشنی ڈال کر آنکھوں کا معائنہ کیا، کان دیکھے ..... دانت دیکھے، پھر میرے سینے کے پلاسٹر کو دیکھا، ٹانگوں کو دیکھا۔ پھر نرس کو بلا کر ہدایت کی کہ میرے جسم سے آویزاں پلاسٹک کی تھیلیوں پر نظر رکھے۔ اگر ان میں خون کی آمیزش نظر آئے تو فوراً معائنہ کیلئے لیبارٹری بھجوائی جائے۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے مجھ سے مصافحہ کیا اور چلا گیا۔ نرس نے مجھے بتایا کہ میں سارا دن اور ساری رات Anestahsia کے زیر اثر بے ہوش رہا۔

"آپ کچھ کھانا پسند کریں گے؟" نرس نے مسکرا کر کہا۔

"کیا ہے کھانے کو؟"

"میں آپ کو فروٹ جوس لا کر دیتی ہوں پھر آدھ گھنٹہ بعد دوپہر کا کھانا شروع ہو گا۔ ویسے آپ جو چاہیں کھا سکتے ہیں۔ لیکن بہتر ہے کہ آج پرہیز ہی رکھیں۔"

تھوڑی دیر بعد نرس جوس اور کریم بسکٹ لے کر آئی۔ کہنے لگی اگر میں کسی کو اطلاع دینا چاہوں تو وہ خوشی فون کر سکے گی۔ میں نے انکار کر دیا۔ اب میں اسے کیسے کہتا کہ پاکستان فون کرنا ہے۔ کیلی فورنیا فون کرنا ہے۔ نیویارک اور نیوجرسی دوستوں کو فون کرنے ہیں۔ سوچا جب طبیعت بحال ہو جائے تو سبھی کو فون کروں گا۔ بار بار قتیل کے رشتہ داروں کی شادی کا خیال آ رہا تھا لیکن ان کو اس وقت اطلاع دینا خارج از بحث تھا۔ بسکٹ چباتے ہوئے میرے جبڑوں میں تکلیف ہو رہی تھی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا۔ غنودگی بدستور تھی۔ میرا ذہن اور میرا جسم غنودگی اور بیداری میں غلطاں تھے۔ مجھے امریکی کھانے کبھی پسند نہ تھے اور پھر امریکی ہسپتال کے کھانے ایک اور عذاب تھا۔ دو دن بدمزہ کھانے اور Pain Killer کے علاوہ میری رگوں میں خون اور گلوکوز کی نالیاں میرے جسم کو زندگی سے روشناس رکھتی رہیں۔ دو دن میں نے کسی سے بات نہ کی۔ "ہاں، نا" میں جواب دیتا تھا۔ سوائے ناشتہ کے کھانا دیکھ کر واپس کر دیتا تھا۔ فروٹ، فروٹ جوس اور چائے بسکٹ پر گزارا رہا۔ دوسرے دن شام کو ڈاکٹر بدستور مسکراتا ہوا آیا چارٹ دیکھ کر مسرت سے کہا کہ میری Progress توقعات سے زیادہ ہے۔ "جس کی مجھے خوشی ہے۔" پھر اس نے بہت سے سوالات کئے جن کا جواب میں دیتا رہا۔

اس شام ڈاکٹر کے ساتھ کھلتے رنگ کی نرس تھی جو ہندوستانی یا پاکستانی لگ رہی تھی۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد میری تھیلیاں بدلنا، گولیاں دینا، چارپائی ٹھیک کرنا اس کا کام تھا۔

"میں آپ کی نرس ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتے اس لئے انہوں نے میری ڈیوٹی لگائی ہے۔ ممکن ہے آپ مجھ سے بات کرنا پسند کریں۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔

اس کی موٹی موٹی شربتی آنکھیں مجھے بہت ہی بھلی لگیں۔ میں نے جواب نہ دیا۔

"تو آپ واقعی باتیں نہیں کرنا چاہتے؟" اس نے اردو میں کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"آپ کو کچھ چاہیے تو بتائیں؟"

"چائے مل جائے گی؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"ضرور" میں نے بے دلی سے کہا مجھے Tea Bag والی چائے بالکل ناپسند تھی۔ اس نے چائے بنا کر میز پر رکھی اور میرا چارٹ دیکھنے لگی۔

"آپ جو چاہیں لے سکتے ہیں پابندی بالکل نہیں۔"

"وہ پلیٹ میں ابلی ہوئی بدذائقہ چیزیں رکھ کر لے آتے ہیں جنہیں دیکھتے ہی بھوک مر جاتی ہے۔"

"تو آپ کو کیا چاہیے؟"

"ایک چھوٹا سا چکن ......!" میری بات پر وہ ہنسنے لگی۔

"اس کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور کمرے سے نکل گئی، جب رات کا کھانا آیا تو میں ٹیلی ویژن دیکھنے میں مشغول تھا۔

"آپ کیلئے خاص کھانا لے کر آئی ہوں۔" آج میری پلیٹ میں چھوٹا سا سٹیک آلو اور سبزی تھی۔ اس نے میری چارپائی درست کی، کھانے کی میز لگائی، سٹیک مزیدار تھا۔

"آپ کو کچھ اور چاہیے؟"

"بہت بہت مہربانی، آپ کی بدولت آج کھانا کھا رہا ہوں، کل سے پھر وہی ہفتہ وار مینو شروع ہو جائے گا۔"

"تو ہوا کرے، آپ کے رات کے کھانے کا ذمہ میرا ہے، فکر نہ کریں۔"

دوسرے دن قتیل اور ڈورتھی مجھے دیکھنے آئے۔ قتیل نے میری کار کے بارے میں ساری تفصیل بتائی، انشورنس کمپنی سے معرکوں کا حال بتایا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ڈورتھی اور قتیل چہک چہک کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ قتیل نے کہا۔ "یار چائے مل جائے تو بات بنے گی۔"

"یہ ہسپتال ہے، ریسٹورنٹ نہیں؟" ڈورتھی نے قدرے خفگی سے کہا۔

"چائے مل سکتی ہے۔" میں نے کہا "ذرا جا کر نرس سٹیشن پر سعیدہ نام کی نرس کو بلا لائیں، پھر دیکھیں اس کا کرشمہ۔"

"کیسے ٹھاٹھ ہیں، ڈان گاڈ فادر نے اپنی پرائیویٹ نرس بھی رکھ لی ہے۔" وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ سعیدہ آئی، میں نے اسے چائے لانے کو کہا، وہ خوشی خوشی چلی گئی۔

"بات ہوئی نا —— پرسنیلٹی ہو تو ایسی ہو، مان گئے چاچا —— مان گئے لیکن چائے کے ساتھ بھی کچھ ہو جائے تو ——" وہ بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ سعیدہ چائے لے کر آئی۔ معنی خیز نظروں سے ڈورتھی کو گھورتے ہوئے چلی گئی۔

"تمہاری سٹیک بار بھی دمدار ہی لگتی ہے کوئی کام کی چیز تو ہے ہی نہیں اس میں۔" قتیل نے لفافہ کھولا اور پیسٹریاں نکالیں۔ مدت بعد ٹی ٹائم کا ذرا لطف آیا۔

"آپ کا پلستر کب کھلے گا؟" ڈورتھی نے پوچھا۔

"جب اللہ کی مرضی۔"

سینے اور ٹانگ میں تکلیف تو نہیں محسوس ہوتی؟" قتیل نے پوچھا۔

"Pain Killer پر کام چل رہا ہے۔ رات کو سونے کی گولی سے نیند آجاتی ہے۔ ان کے جانے کے بعد طبیعت بحال رہی۔ ڈورتھی اور قتیل ڈھیر سارے رسالے لے کر آئے تھے۔ میں رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔

جب رات کا کھانا آیا تو سعیدہ کھانا لانے والے کے ساتھ تھی، جب وہ کھانا چھوڑ کر چلا گیا تو سعیدہ نے پلیٹ سے ڈھکن اٹھا کر دکھایا ابلی ہوئی مچھلی تھی۔

"میں آپ کی چارپائی درست کرتی ہوں لیکن کھانا ابھی شروع نہ کریں۔" وہ جلدی جلدی کام نمٹانے لگی اور میری پلیٹ اٹھا کر بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔ چند منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئی، پلیٹ میرے سامنے رکھی۔

"بسم اللہ کیجئے۔"

میں نے ڈھکن اٹھایا، میری پلیٹ میں نرگسی کوفتہ پڑا تھا۔ تعجب اور حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور سعیدہ کے چہرے پر فتح مندی کی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"جلدی جلدی کھائیے۔" اس نے میرا تکیہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ آیا کہاں سے؟"

اس کے بعد سعیدہ کچھ نہ کچھ لے آتی اور ہم خوب مزے لے لے کر دعوت اڑاتے۔ میں بائیس دن ہسپتال میں رہا۔ میرے سینے کا پلستر اتر چکا تھا لیکن ٹانگ کا پلستر بدستور رہتا تھا۔ ڈاکٹروں نے مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ دوسرے دن دس بجے ہسپتال سے ڈسچارج ہونا تھا۔ میں خوش تھا کہ کم از کم گھر کی آسائش تو میسر رہے گی۔ قتیل نے چند دن میرے ساتھ رہنے کی حامی بھر لی تھی۔ اس نے صبح آ کر مجھے یہاں سے لے جانا تھا۔ ہسپتال میں بدستور خاموشی چھا چکی تھی۔ مریض سو چکے تھے۔ کبھی کبھی نرس کے ہال میں چلنے کی آواز آجاتی تھی۔ میں بدستور Reading Light جلائے پڑھ رہا تھا۔ پردہ سرکا، "آپ کی لائٹ دیکھی سوچا آپ جاگ رہے ہیں۔"

"سعیدہ میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں، میں کل جا رہا ہوں۔"

"جی ہاں! مجھے معلوم ہے۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ کی مہربانیوں کو بھول جاؤں گا۔"

"جی!"

دوسرے دن قتیل کے ہمراہ گھر آیا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے شیشوں پر Welcome Home کا بینر آویزاں تھا۔ قتیل کی امی اور بھابھی نے مجھے خوش آمدید کہا۔ قتیل کی امی نے میرا سر چوما، میری سلامتی کا اللہ کے حضور شکرانہ ادا کیا۔

اس رات ہم نے مل کر خوب مزے مزے کے کھانے کھائے اور قتیل کی امی نے مزید کھانے بنا کر میرے فریزر میں بھی رکھ دیئے تھے۔ چائے کے بعد قتیل، امی اور بھابھی کو چھوڑنے چلا گیا۔ میں نے فون پر رشتہ داروں اور دوستوں کو گھر آنے کی اطلاع دی۔ سبھی خوش تھے۔ قتیل کا اور میرا ساتھ خوب رہا۔ وہ صبح کالج چلا جاتا تھا۔ میں بیساکھیوں کی مدد سے پارک میں جا کر گھومتا، ڈاکٹروں نے ہدایت کی تھی میرے لئے گھومنا ضروری ہے لیکن موسم عموماً ایسا کرنے کی اجازت نہ دیتا۔

ڈاکٹروں نے میرے پلستر کھولنے کی تاریخ مقرر کی۔ قتیل میری خوشی میں برابر کا شریک تھا۔ شام کے کھانے کے بعد ہم ٹی وی دیکھ رہے تھے، قتیل صوفے پر نیم دراز تھا۔ ایک دم ہڑبڑا کر صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"یار تمہارا پلستر کھل رہا ہے، کیوں نہ پارٹی کی جائے۔" وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر فون کی طرف لپکا اور اپنی امی سے پارٹی کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

"بھائی میرے! پارٹی جیکسن ہائٹس میں ہو گی —— امی اور بھابھی انتظام کریں گی، ہمیں دوستوں کی لسٹ تیار کرنا ہے۔"

"تمہارے ذہن میں فتور ہے، خوامخواہ سب کو تکلیف دے رہے ہو۔"

"ارے سٹوپڈ رسالو، عورتوں کو ایسے کاموں میں لطف آتا ہے، یہ ان کی تفریح کا سبب ہے۔ کام ان کو مصروف رکھتا ہے اور عورتوں کو مصروف رہنا چاہیے۔"

"اگر تم اتنے افلاطون ہو تو یہ بتاؤ کہ تاریخ بھی مقرر کی ہے یا نہیں؟"

"تمہارا پلستر بدھ کو کھلے گا پارٹی ہفتے کی شام کو ہو گی۔ میں نے سب کو کہہ دیا ہے۔"

میری ٹانگ کا پلستر اترا، میرے جسم نے جیسے بھاری بوجھ سے نجات حاصل کی۔ گھر آکر سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ ٹب کو Bubble Bath سے لبالب بھر اور رسالہ لے کر ایک لمبا غسل کیا۔ پھر ہم نے مل کر چائے بنائی۔ شامی کباب گرم کیے، چائے کے دوران دوستوں کو فون کیے۔ اس شام رات کے کھانے کے بعد میں نے سعیدہ کو فون کیا وہ ڈیوٹی پر تھی۔

"میں نے سوچا آپ مجھے بھول چکے ہیں؟" وہ ہنس رہی تھی۔ میں نے اسے پارٹی پر آنے کی دعوت دی، وہ خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی۔ "کیسے آؤں گی، میں کسی کو جانتی بھی نہیں۔ وہ کیا سوچیں گے؟"

"آپ مجھے جانتی ہیں، آپ قتیل سے مل چکی ہیں۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے؟ یہ تو صرف بیمار اور تیماردار کا معاملہ ہے۔"

پھر کہا کہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ہفتے کی شام کو ڈیوٹی پر ہو گی۔ میں نے اصرار کیا کہ ہفتہ کی شام چھٹی لے اور مجھے فون کرے۔ رات گیارہ بجے کے قریب اس کا فون آیا، اس نے اپنی ڈیوٹی کسی دوسری نرس کے ساتھ تبدیل کر لی تھی۔

پارٹی کے دن سبھی شاداں آئے۔ سب نے میری بحالی صحت پر اطمینان کا اظہار کیا۔ پارٹی میں سارے دوست ایک دوسرے سے آشنا تھے لیکن سعیدہ اس گروپ میں اجنبی تھی۔ میں نے سب کو مخاطب کیا، ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر سعیدہ سے متعارف کرایا۔

"دوستو! یہ ہیں میری تیماردار۔ ان کے پاس جادو کی چھڑی ہے۔ ہسپتال میں جب میری پلیٹ میں ابلی ہوئی مچھلی آتی تھی تو ان کی جادو کی چھڑی اسے نرگسی کوفتے میں تبدیل کر دیتی تھی۔ بند ڈبے میں بدرنگ، بدذائقہ، بدنما کسٹرڈ کبھی حلوہ، کبھی گلاب جامن میں بدل جاتا تھا۔ میں ان کا بے حد مشکور ہوں انہوں نے میرے کام و دہن کو بھی تندرست رکھا۔" سب نے تالیاں بجائیں۔ سعیدہ شرما کر میرے پیچھے چھپ گئی۔

دو ماہ کی طویل غیر حاضری کے بعد میری سٹڈی میں اضافہ لامحالہ تھا۔ قتیل بھی گھر جا چکا تھا۔ کالج سے واپس آکر رات گئے تک سٹڈی میں مصروف رہتا۔ کالج کی جملہ دلچسپیوں سے سراسر کنارہ کشی کر لی تھی لیکن کمی پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے قتیل سے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ وہ لاابالی آدمی صرف اتنی تسلی دے سکا کہ اگر اس سمسٹر میں اے نہ لیا تو کون سا طوفان آجائے گا۔ ٹریڈ سنٹر اور ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ بدستور استادہ رہیں گی۔ اگلے سمسٹر میں کمی پوری کر لو گے۔ دن سست روی سے گزرتے رہے۔ سردی کی لمبی راتیں یخ بستہ ہوتی رہیں۔ موسم کی بے رحمی نے فضا کو خوشگوار بنائے رکھا۔ ہفتہ کی رات گئے فون کی گھنٹی بجی۔ یہ سعیدہ تھی۔ کہہ رہی تھی کہ اسے موقع نہ ملا کہ پارٹی کی دعوت کا شکریہ ادا کرتی۔

"آپ کا آنا میرے لئے خوشی کا باعث تھا۔ آپ کو شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"یقین کریں، اتنے اچھے لوگوں سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ یہ بتائیں پارٹی جس گھر میں تھی وہ آپ کے رشتہ دار ہیں؟"

"نہیں پارٹی میرے دوست قتیل کے بڑے بھائی جلیل صاحب کے ہاں تھی۔"

"جلیل صاحب بے حد مہربان انسان ہیں۔ انہیں شاید پتہ چل گیا تھا کہ میں کالج سٹوڈنٹ نہیں ہوں اور نہ ہی آپ کے دوستوں کو جانتی ہوں۔ انہوں نے اور ان کی بیگم نے خاص طور پر میرا خیال رکھا۔۔۔ ان کی بیگم کیا کرتی ہیں؟"

"وہ جلیل صاحب کا ہاتھ بٹاتی ہیں، ایک لحاظ سے بزنس پارٹنر ہیں۔"

"کیا آپ انہیں میرا سلام پہنچا دیں گے؟ میں مشکور ہوں گی۔"

"ضرور ایسا کروں گا۔۔۔ میں جانتا ہوں آپ مصروف ہیں، چھ دن ہفتہ میں کام کرتی ہیں، وہ بھی تکلیف دہ رات کی ڈیوٹی۔ کبھی وقت نکالیں، نرگسی کوفتے بنائیں۔"

"اوئی اللہ!"

"میں آپ کو فون کروں گا، پھر پروگرام بنائیں گے۔"

"بہت اچھا، شب بخیر!"

طویل عرصہ میں سعیدہ کو فون نہ کر سکا۔ چند بار موقع ملا بھی تو کسی وجہ سے مناسب نہ سمجھا لیکن اس سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔ کرسمس کی چھٹیاں قریب آ رہی تھیں۔ میں نے سوچا فون کر کے یہ تو معلوم کروں کہ وہ چھٹیوں میں کیا کرے گی؟ میں نے رات گئے فون کیا۔ اس نے بتایا کہ انہیں کرسمس میں صرف دو چھٹیاں ہوتی ہیں۔ ایک کرسمس ایو "Christmas Eve" اور دوسری کرسمس کے دن۔ وہ بھی قسمت سے، سعیدہ چونکہ مسلمان تھی، اس لئے کرسچین ہالی ڈیز پر وہ عموماً کام کرتی تھی۔ میں نے اسے اپنا پروگرام بتایا۔ پاکستان جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیلی فورنیا رشتہ داروں سے ملنے کا قصد کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کرسمس سے چند دن قبل چھٹی لے رہی ہے، چھٹی کا کوئی خاص مقصد نہیں صرف آرام کرنا چاہتی ہے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ وہ چند روز میرے ساتھ چھٹی کی ابتدا کرے۔۔۔ امتحان کا بوجھ سر سے اترا تو میں نے فراغت کی سانس لی۔ کیلی فورنیا جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ یونیورسٹی کے بند ہوتے ہی سارے جانے والے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ اس رات میں نے سعیدہ کو فون کیا۔ اس سے دریافت کیا اس کی چھٹی کب سے شروع ہو رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کی چھٹی پیر کے دن سے شروع ہو گی۔ میں نے اسے پیر کی شب کو کھانے پر بلایا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر حامی بھر لی۔ میں نے اسے سب وے میں آنے کا راستہ تفصیل سے بتایا۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی پوچھنے لگی۔ "اور لوگ کہاں ہیں؟"

"اور تو کوئی نہیں آ رہا، صرف قتیل اور ان کی بھابھی آ رہی ہیں، ان کے بھائی جلیل صاحب کو بھی آنا تھا لیکن کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ آ سکیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد قتیل اس کی بھابھی اور بھانجا آ گئے۔ ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ دوستانہ اور بے تکلف ماحول کے باوجود سعیدہ کچھ کھنچی کھنچی سی تھی۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد قتیل کی بھابھی نے قتیل کو چلنے کو کہا۔ جلیل صاحب نے واپس لوٹنا تھا وہ ان کی واپسی سے پہلے گھر جانا چاہتی تھی۔ ان کے جاتے ہی سعیدہ نے بھی اجازت چاہی۔

"آپ کو کل چھٹی ہے، ذرا چائے بناتے ہیں۔ چائے کے بعد آپ کو جا کر چھوڑ آؤں گا۔"

میرے اصرار پر وہ رک گئی۔ چائے کے دوران اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"آپ کہاں رہتے ہیں پاکستان میں؟"

"اپنے گھر" میں نے جواب دیا۔

"اوئی اللہ! میرا مطلب ہے کون سے شہر میں؟"

"ایبٹ آباد کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔"

"ایبٹ آباد کے قریب؟" وہ جیسے چلا اٹھی۔ "میری پرورش ہری پور میں ہوئی ہے۔"

"ہری پور۔" اب میں چلا اٹھا۔

"اگر آپ کا تعلق ہری پور سے ہے تو آپ نے مانسہرہ کا نام سنا ہو گا؟"

"نام۔۔۔ میری والدہ مانسہرہ سے ہیں" اس نے پوری آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے بنانے کی کوشش کر رہی ہے اتنا بڑا اتفاق ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔

"مانسہرہ میں آپ کی والدہ کہاں رہتی تھیں؟" میں نے اس کا جھوٹ پکڑنے کی سعی کی۔

"لوہار بانڈہ میں اور آپ؟"

"لوہار بانڈہ میں۔" میرا دل اور زور سے دھڑکنے لگا۔ مانسہرہ میں شاید ہی کوئی ایسی فیملی ہو جو ہماری فیملی سے شناسا نہ ہو۔

"آپ سچ کہہ رہی ہیں یا گپ لگا رہی ہیں؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں، لیکن ایسا اتفاق ناممکن ہے۔"

اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا کھلتا ہوا رنگ، گھنے سیاہی مائل بھورے بال، موزوں ناک، موٹی موٹی شربتی آنکھیں، بھرپور گلابی ہونٹ، مناسب قد و قامت۔

"کہاں تھا آپ کا گھر لوہار بانڈہ میں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن میری امی جب اپنی بہن سے ملنے جاتی تھیں تو ہم تحصیل کے قریب ان کے گھر پر ٹھہرتے تھے۔ مانسہرہ میں مجھ پر باہر نکلنے کی سخت پابندی تھی۔ اور آپ؟"

"لوہار بانڈہ میں پہاڑی کے دامن میں ہمارا گھر ہے۔ جب میرے والد صاحب نے گھر بنایا تھا اس وقت آس پاس کوئی مکان نہ تھا۔ ہمارے مکان کے پیچھے بڑا احاطہ ہے جس میں اصطبل ہے۔ مہمان خانہ ہے اور پہاڑی نالے کے اوپر چبوترا ہے۔ ہمارے مکان سے ذرا ہٹ کر نواب لب کے چھوٹے بھائی کا مکان ہے۔ یہاں ان کے بچے رہتے تھے اور مانسہرہ ہائی سکول میں پڑھتے تھے...... آپ کی والدہ کی بہن مانسہرہ میں کیا کرتی ہیں؟"

"وہ تحصیل دار صاحب کے گھر ملازم تھیں اور ان کا خاوند ہسپتال میں ڈرائیور تھا۔"

"آپ کو مانسہرہ کتنا یاد ہے؟"

"بالکل معمولی، بس اتنا یاد ہے کہ ہم جامع مسجد کے پاس بسوں کے اڈے پر اترتے تھے۔ پہاڑی نالہ عبور کر کے بازار سے گزر کر تحصیل کی طرف جاتے تھے، میں بالکل چھوٹی سی تھی، میری ماں مجھے اچھی طرح چادر میں لپیٹ کر ساتھ چلاتی تھیں۔"

"اور آپ کے والد؟"

"مجھے میرے والد بالکل یاد نہیں۔ ماں نے صرف اتنا بتایا ہے کہ وہ چلے گئے تھے اور پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ میں نے اپنے والد صاحب کو بالکل نہیں دیکھا۔ میری یادوں کا سلسلہ ہری پور کے محلہ خانان سے شروع ہوتا ہے، جہاں میری والدہ محمد سلیم خان کی حویلی میں کام کرتی تھیں۔ میں نے اسی حویلی میں آنکھ کھولی، وہیں تعلیم حاصل کی۔ میری ماں کے خاوند نے ہسپتال کے ذریعے مجھے نرسنگ میں داخلہ دلایا۔ میں نے دو سال لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں کام کیا۔ پھر محمد سلیم خان کے رشتہ داروں میں ایک بھائی وزیر تھے، جن کی بدولت میں یہاں آگئی۔"

"تو آپ محمد سلیم خان کے رشتہ داروں کے ساتھ رہ رہی ہیں؟"

"نہیں اسپتال کے پاس ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ ہے، ہم تین لڑکیاں مل کر اس اپارٹمنٹ میں رہتی ہیں۔ محمد سلیم خان کے رشتہ داروں سے کبھی کبھی ملتی ہوں۔ وہ سارے کے سارے بے حد مصروف ہیں۔ ان کے دو گیس اسٹیشن ہیں جو چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں۔ دو یا تین گروسری اسٹورز ہیں۔"

جب سعیدہ کو اس کے اپارٹمنٹ میں چھوڑ کر لوٹ رہا تھا تو نہ جانے کیوں بار بار میرے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ سعیدہ گپ لگا رہی ہے یا اپنے آپ کو چھپانے کی سعی کر رہی ہے۔ اس کے بیان کردہ واقعات ایک مربوط کہانی سہی لیکن اصلیت کہاں ہے؟ اس کا امریکہ آنا بھی قابل غور ہے۔ پھر خیال آتا کہ غلط بیانی سے اسے کیا حاصل؟ میرا ذہن دیر تک اس نشیب و فراز میں بھٹکتا رہا۔ جو بھی تھا میرے دل میں اس کیلئے ہمدردی ضرور جاگ اٹھی تھی اور ایک تعلق سا محسوس کرنے لگا تھا۔

کرسمس کی چھٹیاں میں نے اپنے ماموں زاد کے ہاں برکلے میں گزاریں۔ برکلے کا خوبصورت شہر برکلے یونیورسٹی کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے اور اس کی شہرت کی دوسری وجہ امریکہ کی نئی نسلوں کی ایجاد کردہ تحریکیں ہیں جو برکلے میں جنم لیتی ہیں اور پھر دھیرے دھیرے دنیا بھر کے نوجوان طبقے میں سرایت کر جاتی ہیں۔ آج بھی برکلے یونیورسٹی کے سامنے ٹیلی گراف سٹریٹ پر بے گھر بے در ہپی لڑکے لڑکیاں سائیڈ واک پر دنیا کے سارے تفکرات سے بے نیاز دھرنا مارے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے بال بھانت بھانت کے رنگوں سے رنگین، ان کی ناکوں، کانوں، ہونٹوں، زبان اور ناف سے سستے زیورات جھولتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے عجوبہ روزگار نوادرات اور بعید از قیاس آئل اور واٹر کلر پینٹنگز کے سٹال لگائے فائن آرٹس کے مسائل پر لمبے لمبے مباحث میں مصروف رہتے ہیں۔ اس مخلوق کی بے نیازی قابل دید ہے۔

برکلے کے ہر گھر کی کھڑکی میں نوادرات سے مزین رنگین روشنیوں والے کرسمس ٹریز رجائیت اور مسرت کے علم بردار استادہ پرمسرت تہوار کے ضامن تھے، گھروں میں مسکراہٹوں اور قہقہوں سے لبریز نہ ختم ہونے والی دعوتیں جاری تھیں۔ بازار، سٹورز، ہوٹل، کیفے، ریسٹورنٹ کرسمس کیرول سے جھوم رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا جہاں ابدی سرمستی میں ڈوبا ہوا ہے۔

میری کرسمس کی چھٹیاں خوشگوار گزریں، بہت سی دعوتوں میں شرکت کی، گھر پر بھی آئے دن دعوتیں ہوتی رہیں۔ سال نو کی پارٹی یونیورسٹی ایونیو پر منعقد ہوتی۔ ہال میں کوئی دو ہزار کے قریب مرد و عورتیں جمع تھیں۔ خون منجمد کرنے والی سردی کے باوجود لوگ سڑکوں پر وائن کے گلاس لیے خوش دلی سے سال نو کی آمد کے منتظر تھے۔ بینڈ نے زوردار دھماکے سے گنتی شروع کی۔ دس، نو، آٹھ، سات ـــــ ہر کم ہونے والے سیکنڈ کے ساتھ سازوں کی جھنکار میں اضافہ ہوتا گیا۔ تین، دو، ایک پھر چاروں اور نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ ساران گونج اٹھے، غبارے چھوڑے گئے، عورتوں مردوں نے مل کر پوری قوت سے Noise Makers بجائے۔ ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ ایک دوسرے کا منہ چوما۔ شمپین کی بوتلوں سے کارک اڑے۔ جھل مل جھل مل شمپین کے فوارے برسنے لگے۔ گلاس بلند ہوئے سال نو کو خوش آمدید کہا گیا۔ ایک دوسرے کو سال نو کی مبارکباد دی گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا شہر سرمستی میں جھوم رہا ہو۔

کرسمس اور سال نو اختتام کو آیا۔ اب مجھے واپس نیویارک جانا تھا۔ میرا کالج میرا منتظر ہوگا۔ برکلے کی کرسمس سے مسحور نیو جرسی کے ہوائی اڈے پر اترا تو نیویارک بدستور کرسمس کی رعنائیوں کے ساتھ مہک رہا تھا۔ گھر آکر قتیل کو فون کیا۔ وہ مسرت سے چلا اٹھا "کس وقت آئے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ تیار ہونے میں کتنی دیر لگے گی؟ میں نے امی سے کہہ دیا ہے کہ شام کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ کچھ اور لوگ بھی آرہے ہیں۔ جلدی پہنچو۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن قتیل کو کون سمجھائے؟ اس نے جھٹ سے فون امی کو دے دیا۔ انہوں نے باوقار آواز میں خیریت دریافت کی۔ "بیٹا تیار ہو کر جلدی چلے آؤ، ہم انتظار کریں گے۔" اب ایسی مہربانی سے کون انکار کرے۔ جلدی جلدی غسل کیا، کپڑے بدلے، جب وہاں پہنچا تو گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ آج قتیل کی بھابھی کی سالگرہ تھی۔ بس اسی بہانے یہ سالگرہ ایک طرح کا ڈانس ڈنر بھی تھا۔ قتیل نے مجھے علیحدہ لے جا کر سرگوشی کی کہ "بھابھی نے بہت سی لڑکیوں کو اور ان کی ماؤں کو بلایا ہے۔ سب کی نظریں تم پر رہیں گی۔ تم تو جانتے ہو کہ میرا خاندان اول درجے کا Match Maker خاندان ہے۔ تمہارے چہرے پر مسکراہٹ کندہ رہنی چاہیے۔ تمہاری چال ڈھال اور گفتگو میں ٹھہراؤ ہونا چاہیے۔ بھابھی سب کو بتا رہی تھیں کہ جاگیردار خان محمد سلیمان خان کا بیٹا آرہا ہے۔"

"پتہ مجھے یہ لیکچر دے رہے ہو تمہیں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ تمہارا گھر ہے اور لڑکیاں یا ان کی مائیں تمہاری طرف بالکل نہ دیکھیں گی؟"

"میری فکر نہ کرو! میں خان محمد سلیمان خان جاگیر دار کا بیٹا نہیں۔ ایسے مقام پر ہم خاک نشینوں پر کسی کی نظر کیا ٹھہرے گی؟" اس نے ہنس کر کہا۔

زبردست پاکستانی دعوت تھی، مزے مزے کے کھانے میز پر سجے تھے۔ سب نے جی بھر کر کھانا کھایا۔ خوش دلی سے باتیں کیں، کھانے کے بعد میز صاف کی گئی، کمرے کی روشنیاں دھیمی کی گئیں۔ باورچی خانے سے سجا سجایا، موم بتیوں سے مزین کیک لایا گیا۔ سب نے تالیاں بجائیں Happy Birthday گایا گیا۔ قتیل کی بھابھی نے ساڑھی کے پلو اور موتیوں کے لمبے ہار کو سنبھالتے ہوئے کیک کاٹا، مبارک باد، مبارک باد کے نعرے گونجے۔ میں نے چپکے سے بھابھی کو مبارک باد دی، گلہ کیا کہ "سبھی تحفے لائے ہیں سوائے میرے ——"

بھابھی نے کمال مہربانی سے میرا کندھا تھپتھپایا۔ "تمہارا آنا ہی میرے لئے تحفہ ہے۔" مہمان رخصت ہونے لگے۔ قتیل اور بچے بھاگ بھاگ کر ان کے کوٹ اور مفلر اور رین کوٹ لا لا کر انہیں دے رہے تھے۔ جب مہمان چلے گئے تو ہم چائے لے کر قتیل کے کمرے میں چلے گئے۔

"یار! تمہاری تیمار دار کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہی تھیں کہ مریض کب آئیں گے؟" قتیل نے شرارت سے کہا۔

"وفاداری بشرط استواری والی بات ہے۔ چلیں کم از کم کوئی تو یاد کرتا ہے۔"

میں نے نمک مرچ لگا کر اسے اپنی چھٹیوں کے بارے میں بتایا۔ سان فرانسسکو کی ابھرتی ڈوبتی سڑکوں کا ذکر کیا۔ گولڈن گیٹ برج کی Look Out پر یخ بستہ ہواؤں میں کھڑے ہو کر چاکولیٹ پینے کا ذکر کیا۔ برکلے کی بے نیاز سی مخلوق کے قصے سنائے۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات گہری ہو رہی تھی، سردی بڑھ رہی تھی۔ میں نے اجازت چاہی۔ امی نے خاص طور پر احتیاط سے کار چلانے کی تاکید کی۔ میں گھر پہنچا تو بارہ بجنے والے تھے۔ ٹیلی فون کی Message Light اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ یہ سعیدہ کا پیغام تھا۔ میں نے اسے فون کیا۔ بہت خوش ہوئی۔ میری چھٹیوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں نے اسے اس کی چھٹیوں کے بارے میں پوچھا۔

کہنے لگی "کچھ شاپنگ کی، کمرے کی صفائی کی، کچھ کھانے بنائے۔

"کرسمس پارٹی میں نہیں گئیں؟"

"نہیں تو کرسمس ایو اور کرسمس ڈے دونوں ڈیوٹی پر رہی۔ البتہ کرسمس سے پہلے جو ہسپتال کی کرسمس پارٹی تھی اس میں گئی تھی۔ ہمارے عملے نے کرسمس کا شاندار پروگرام پیش کیا۔"

"اور کیا کیا؟" میں نے سلسلہ گفتگو جاری رکھنے کی سعی کی۔

"اور کیا بس جی اداس رہا مجھے کرسمس میں تنہائی کا احساس زیادہ ہوتا ہے سارا شہر دلہن کی طرح سجا ہے۔ لوگ ہر جگہ خوشی سے جھومتے نظر آتے ہیں لیکن یہ خوشی شاید میری نہیں۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہیں ہوتا۔ میری روم میٹ بیٹی سٹوری ٹیلی فون کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں کہ کوئی فون کر کے انہیں بلائے۔ وہ بے طرح مصروف رہتی ہیں، اور —— اور آپ بھی نہ تھے۔ قتیل صاحب کو فون کر کے آپ کے آنے کی تاریخ پوچھی تھی۔" وہ خاموش ہو گئی۔

مجھے احساس ہوا کہ وہ تنہائی محسوس کر رہی ہے۔ اسے کسی سے باتیں کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کی ڈیوٹی آج بدستور سات بجے ختم ہونے والی تھی۔

"کل تمہاری چھٹی ہے نا؟" میں نے دریافت کیا

"جی۔"

"تو کل نرگسی کوفتے کا بندوبست کیا جائے؟"

"اوئی اللہ —— آپ کو نرگسی کوفتے بدستور یاد ہیں۔"

"بالکل یاد ہیں اور کل نرگسی کوفتے پر ہاتھ آزمانے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔"

اور ماسٹر کے سرسوں کے ساگ اور جوار کی روٹی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے شرارت سے ہنس کر کہا۔

"اور لسی؟"

"اوئی اللہ —— اس سردی میں لسی، میرے تو جسم میں کپکپی دوڑ گئی ہے۔"

"ساگ یا نرگسی کوفتے؟" میں نے کہا۔

"یہ مجھ پر چھوڑ دیں، میں بندوبست کر لوں گی۔"

"تو میں کیا کروں گا؟"

"آپ سلاد بنائیں بازار سے گلاب جامن لائیں اور بس!"

"منظور!" میں نے نعرہ لگایا۔ "آپ کس وقت آئیں گی؟"

"سات بجے ٹھیک رہے گا؟" —— "میں آجاؤں گا —— آپ کو لینے؟"

"اتنی تکلیف؟"

"تو میں آپ کو کندھوں پر اٹھا کر تھوڑا ہی لاؤں گا۔"

"اچھا تو سات بجے ——"

"شوفر حاضر ہو جائے گا۔"

"اوئی اللہ، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ خدا حافظ۔"

"شب بخیر!"

"شب بخیر!"

برستی بارش میں سات بجے سے چند منٹ بعد میں سعیدہ کے اپارٹمنٹ پہنچا۔ میں تہیہ کر لیا تھا کہ اوپر نہیں جاؤں گا۔

میں نے گھنٹی بجائی۔ Intercom پر بتایا۔ سعیدہ نے گرمجوشی کا اظہار کیا۔ اوپر آنے کو کہا لیکن میں نے پارکنگ کا بہانہ کر کے اسے جلدی نیچے آنے کو کہا۔ وہ تین بڑے بڑے تھیلے اٹھائے مشکل لفٹ سے نکلی۔ میں نے بھاگ کر سامان اس سے لے لیا۔ سرخ اوور کوٹ اور بالوں میں نمایاں ہو گئے وہ بڑی جاذب نظر لگ رہی تھی۔ اس کے جسم سے قیمتی پرفیوم کی خوشبو فرحت بخش تھی۔

"آپ نے کتنے لوگوں کو کھانے پر بلایا ہے؟" میں نے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے جواب نہ دیا۔ مسکرا کر سر جھکا لیا۔ ہم نے سامان کار میں رکھا اور نیویارک کی بے پایاں ٹریفک کا حصہ بن گئے۔ میں نے ایک مقام پر لین تبدیل کی تو سعیدہ نے دھیرے سے کہا۔ "احتیاط سے۔"

"ایک تجربہ کار نرس کی موجودگی میں مجھے بالکل خوف محسوس نہیں ہو رہا۔"

"اگر نرس زخمی ہو گئی تو ——؟" اس نے اپنی آنکھیں مجھ پر مرکوز کر کے کہا۔

"اوہ —— اگر یہ بات ہے تو ضرور احتیاط کرنا لازمی ہے ورنہ بہت سے مریض دلربا نرگسی کوفتوں سے محروم ہو جائیں گے۔"

"نرگسی کوفتے تو صرف خاص الخاص مریض کیلئے ہی پکتے ہیں۔"

اپارٹمنٹ میں آکر سعیدہ نے کوٹ اتار کر صوفے پر رکھا۔ وہ ہلکے گلابی چینٹ سوٹ میں ملبوس تھی۔ بال قرینے سے سنوار کھے تھے۔ بالوں میں سرخ گلاب، چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ، پرفیوم کی دھیمی دھیمی خوشبو اور ہونٹوں پر مہربان مسکراہٹ کے ساتھ وہ مسرور اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ ہم نے کھانے کا سامان کچن میں رکھا۔

"یہ روسٹر تو سٹر ہے، یہ مائیکرو ویو ہے، اس دراز میں سلور ویئر ہے، پلیٹیں یہاں ہیں، گلاس

لوپروالی شلف پر ہیں۔"

"چلیں آپ جاکر ڈرائنگ روم میں بیٹھئے، میں میز لگاتی ہوں۔"

"نہیں جی ایہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے آپ کو بلایا ہے۔ کھانا بھی آپ پکائیں اور یہاں بھی آپ کام کریں۔ یہ قابل قبول شاید نہ ہو۔"

"دیکھیں مجھے اس کا تجربہ ہے۔ اب آپ جاکر ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ ٹی وی دیکھیں جس طرح اسپتال میں کرتے تھے اور میں اسی طرح کھانا لگا کر آپ کو بلاؤں گی۔"

"جیسے آپ کی مرضی، لیکن مجھے خفت محسوس ہو رہی ہے۔"

"کوئی خفت نہ محسوس کریں۔ چلیں......"

اس نے میرا بازو پکڑ کر باورچی خانے سے نکال دیا۔ ڈرائنگ روم میں آکر میں اپنی ٹانگ سے پیڈ اتارنے لگا۔ سعیدہ کی نظر مجھ پر پڑ گئی، وہ ہنس کر بولی، ٹانگ میں لگی لوہے کی پلیٹ سردی میں سرد ہو جاتی ہے نا؟"

"جی ہاں! آپ کی مہربانی سے! اس لئے پیڈ لگا کر باہر جاتا ہوں۔"

"بس گرم رکھیں، گھبرانے کی بات نہیں۔"

"بس اس نرسوں والی زبان مجھ پر اور نہ آزمائیں۔" وہ مسکرا کر باورچی خانے میں روپوش ہو گئی۔ سعیدہ نے قرینے سے میز لگائی۔ پلاؤ، ساگ، نرگسی کوفتے، نان چٹنی، سلاد۔ میز بھرپور اور اشتہا انگیز لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی لانبی لانبی انگلیوں سے کھانا میری پلیٹ میں ڈال کر دیا۔ کھانے کے دوران وہ خوش دلی سے بات بات پر ہنس رہی تھی۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح جگمگا اٹھتے تھے۔ اس کی موٹی موٹی شربتی آنکھیں محو گفتار تھیں۔ کھانے کے بعد اس نے نفاست سے قہوے کی پیالی میرے سامنے رکھی اور میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ بارش کا تسلسل اور ہوا کے بپھرے ہوئے ریلے بے رحمی سے کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرا رہے تھے۔ گرم کمرے کی آسودگی، سعیدہ کے جسم سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو اور قہوے کی تلخی ماحول کو خمار آلود کر رہی تھی۔ اس کی لانبی لانبی انگلیوں کا لمس جیسے ماحول کو سہلانے لگیں۔ شاخوں پر منجمد برف کے شگوفے دھیرے دھیرے پگھلنے لگے، کلیاں انگڑائی لے کر چٹک اٹھیں۔ پھول کی پتیاں بکھر کر میرے ہونٹوں پر ٹھہر گئیں، میرے چاروں اور بھونرے منڈلانے لگے، خوبصورت پروں والے پرندے مہین مہین آواز میں گانے لگے۔ دھنک، مٹھاس، دور کہیں ابھرتی ڈوبتی موسیقی، چیل کے درختوں میں سرسراتی سریلی ہوا تاحد نظر پھیلے ہوئے وادیوں کے بے داغ سبزے کی مخمل سبک بادلوں میں ابھرتی ڈوبتی نیم گرم ہوا کی لوری، گرم اور گہری رات سکون کی باہوں پر سر رکھ کر مدہوش ہو گئی، سناٹا دلربائی سے چاروں اور آکے ٹھہر گیا۔

میں نے اپنے گالوں پر نرم نرم انگلیوں کا لمس محسوس کیا۔ اس کی سانس میری گردن کو چھو رہی تھی۔ میں نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں، اس کی موٹی موٹی، منور شربتی آنکھیں مجھ پر جھکی تھیں۔ اس نے مسکرا کر کہا "ناشتہ تیار ہے۔"

اگلے دن کافی بریک پر قتیل نے کہا۔ "ایسا کیوں ہے کہ کرسمس کی چھٹیوں کے دن مختصر ہوتے ہیں اور کالج کے دن طویل......؟"

"تم لاء کے طالب علم ہو، تم اس قانون کی موشگافی کرو۔ تمہارے چچا غالب نے کہا ہے "گردش رنگ چمن ہے ماہ و سال عندلیب۔"

"آج کل تمہارے چہرے پر شاعری کی تو ضیاء دے رہی ہے...... کیا بات ہے......؟"

"ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہیں۔"

قتیل نے ہاتھ جوڑ کر کہنیاں میز پر ٹیک کر سر جھکا کر کہا "او لارڈ، تو ہی بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو راہ راست پر لا......" پھر سنجیدہ ہو گیا۔ "بہت سا ہوم ورک کرنا ہے...... تمہارا اپارٹمنٹ یا میرا گھر؟!"

"میرا اپارٹمنٹ!" ہم نے کتابیں سنبھالیں اور سب وے کا رخ کیا۔

زندگی ایک بار پھر اپنی ڈگر پر آگئی۔

چاچی خانم کا خط آیا۔ چاچی خانم کا خط صرف اہم موقعوں پر آتا تھا۔ لکھا تھا گرمیوں کی چھٹی میں ضرور آنا ہو گا۔ میرے والد صاحب کا سالانہ تھا۔ گاؤں کے سارے مزارعے آرہے تھے۔ مسجد کے امام صاحب سے بات ہو چکی ہے۔ ختم قرآن ہو گا۔ میرے والد صاحب کی قبر پر دیگیں چڑھائی جائیں گی۔ شہر کے معززین بھی تشریف لائیں گے۔ اس لئے میرا وہاں ہونا لازمی ہے۔"

خط پڑھنے کے بعد پاکستان جانے کی شعوری تیاریاں کرنے لگا۔ میں نے سعیدہ کو پاکستان جانے کے بارے میں بتایا۔ اس نے اداس ہو کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں نے بہت سی کہانیاں کہہ ڈالیں اور میری کوتاہ دامنی پر میری گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی۔

اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر بہت سے رشتہ دار اور احباب جمع تھے، سب سے گلے مل کر اس گرمجوشی کا سرور ملا جو نیویارک کے **Concrete Jungle** میں ناپید تھا۔ جب ہماری کاریں مانسہرہ کے بازاروں میں داخل ہوئیں تو دکانداروں نے آگے بڑھ کر ہاتھ ہلا ہلا کر سلام کئے۔ سب کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ مدت بعد اپنے بچپن کی یادوں کے جھرمٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بے خبر خاموش پہاڑی نالے، وہ چیل کے اونچے اونچے درخت، وہ جانی پہچانی پہاڑی، دوست رو بکریوں کے ریوڑ۔ دروازے پر چاچی خانم قرآن اٹھائے کھڑی تھیں، میں قرآن کے سائے میں گھر داخل ہوا۔ گھر میں کام کرنے والی لڑکیاں بھاگ بھاگ کر چیزیں درست کر رہی تھیں، شرما شرما کر خان جی سلام علیکم! خان جی سلام علیکم کہہ رہی تھیں۔ بڑے کمرے میں چائے کا بندوبست تھا۔ کمرہ جاننے والوں سے بھرا تھا۔ سب کی آنکھوں میں سوال تھے۔ کئی نیویارک کی جادو بھری زندگی کو کسی روزن سے دیکھنے کے مشتاق تھے۔ میں ہنس ہنس کر کسی کی دل جوئی کا سامان کر رہا تھا۔ کئی میرے ایکسیڈنٹ کی خبر سے متفکر تھے۔ میرے بڑے بھائی ذیشان خان بھاری شلوار قمیض، موٹی موٹی کرخت مونچھوں والے چہرے کے ساتھ بڑے باوقار لگ رہے تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے بھائی کا ہر ادنیٰ اشارہ قانون کی طرح اٹل تھا۔ وہ خاندان اور مزارعین کی زندگیوں کے سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ چائے ختم کر کے میں اپنے کمرے میں تھوڑی دیر آرام کرنے چلا گیا۔ میرا پلنگ، میری کتابیں اسی ترتیب سے رکھی تھیں۔ حویلی میں خوب رونق تھی۔ کل میرے ابا کا سالانہ تھا۔ مجھے سارا دن بھائی جان کے ساتھ بہت سے لوگوں سے ہاتھ ملانے تھے۔ ان کے دکھ درد سننے تھے، نیویارک کے بارے میں بار بار باتیں دہرانی تھیں۔ میں کپڑے تبدیل کر کے لیٹ گیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ سعیدہ کی ماں یہیں کہیں رہتی ہو گی۔ اس کے والد جیسے گئے پھر لوٹ کر نہ آئے؟ اپنی بچی کو دیکھا تو نہیں؟ جانے اس کے والد کا نام کیا تھا۔ میں نے تو اس کی والدہ کا نام بھی نہ پوچھا تھا۔

چاچی خانم کو شہر کے ہر خاندان کا پورا پورا علم تھا۔ وہ گاؤں کے سارے مزارعوں کے شجرۂ نسب سے بخوبی واقف تھیں۔ ان کو ضرور معلوم ہو گا کہ سعیدہ کی ماں کہاں رہتی تھیں؟ میں چاہتا تھا کہ واپس جا کر سعیدہ کو اس کے خاندان کے بارے میں مزید معلومات دوں۔ یقیناً وہ خوش ہو گی۔ اور میرے ذہن میں جو ہلکی سی الجھن ہے وہ بھی دور ہو جائے گی۔

چاچی خانم نے آکر مجھے جگایا، شام ہو رہی تھی وہ سارے چائے پر میرے منتظر تھے۔ چائے کے دوران ایک بار پھر ساری توجہ مجھ پر رہی۔ بار بار مجھے ایکسیڈنٹ کے بارے میں تفصیلات بتانا پڑیں۔ چائے کے بعد بھائی جان نے کہا باہر جا کر لوگوں سے مل لو، ہمارا مہمان خانہ مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ سب نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملائے۔ بڑے بوڑھوں نے سر پہ ہاتھ

پھیر کی دعائیں دیں۔ میرے لباجی کی بے وقت موت پر اظہار ملال کیا۔ بھائی جان کے حسن انتظام کو سراہا۔ بھائی جان کی تعریف سراسر خوشامد کی مظہر تھی۔ بھائی جان تعریفی کلمات سن کر مزید غرور سے سر ہلاتے اور آگے بڑھ جاتے۔ بھائی جان چپلی اتار کر تکیے سے ٹیک لگا کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ مزارعے چارپائی کے گرد زمین پر بیٹھ گئے۔ مجھے یہ طور طریقہ پسند نہ آیا لیکن یہ ہمارا کلچر تھا۔ بھائی جان نے بکے کو بلایا۔ بکا ہمارا پرانا ملازم تھا۔ اس کا نام برکت اللہ تھا لیکن بکے کے نام سے مشہور تھا۔ چوڑے چہرے، دراز قد، مضبوط شانوں والا بکا اپنی لال داڑھی کو لہراتا ہوا حاضر ہوا۔ بھائی جان نے بکے سے مولوی صاحبان کے بارے میں دریافت کیا۔ بکے نے بتایا کہ مولوی صاحب صبح صبح آجائیں گے۔ قرآن خوانی ٹھیک دس بجے شروع ہو گی۔ باورچیوں نے سارا سامان لاکر رکھ دیا ہے۔ بکرے بھی آگئے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا ہے کہ وہ خود بکرے حلال کریں گے۔ بکا تفصیلات بتا رہا تھا اور ساتھ ساتھ بھائی جان کی ٹانگیں بھی دبا رہا تھا۔ بھائی جان کی یہ شاہانہ ادا مجھے ایک آنکھ نہ بھائی۔ لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا؟ صدیوں کا بگڑا ہوا فرسودہ معاشرہ بدستور فرسودہ راہوں پر رینگ رہا تھا اور ہم سارے اس کے ذمہ دار تھے۔

دوسرے دن صبح صبح احاطہ لوگوں سے بھر چکا تھا۔ بکرے زور زور سے چلا رہے تھے۔ بچے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ بوڑھے ٹولیوں میں بیٹھے چائے اور کڑوے تمباکو کی چلم کے کش لگا رہے تھے۔ بعض رنگین شیشوں والی ڈبیوں سے خوشبودار نسوار کی چٹکیاں منہ میں دبا کر تھوک رہے تھے اور اپنے جوان بچوں کے تاریک مستقبل پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ میں باہر آیا تو بھائی جان بچھے ہوئے پلنگ پر نیم دراز تھے۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے مجھے تلقین کی تھی کہ میں سارا وقت ان کے ساتھ رہوں تاکہ لوگوں کو احساس رہے کہ ہم دونوں بھائی یک جان ہیں۔ مولوی صاحب نے آکر مجھ سے مصافحہ کیا۔ بھائی جان سے بکرے حلال کرنے کی اجازت چاہی۔ مولوی صاحب نے بکرے ذبح کئے۔ سب نے دعا کیلئے ہاتھ بلند کئے۔ پھر بکروں کو شہتیروں سے لٹکا کر مہارت سے ان کی کھالیں اتاری گئیں۔ مولوی صاحب بکروں کے چاروں طرف گھوم گھوم کر پڑھ پڑھ کر پھونک رہے تھے۔ دوسری طرف بڑیل کی بڑی بڑی چٹائیاں بچھائی گئیں تھیں۔ جہاں قرآن خوانی ہونے والی تھی۔ میرے لباجی کا سالانہ کسی پیر بزرگ کے عرس سے کم نہ تھا۔ میں مزارعین کو لباجی کی قبر کے سیمنٹ کو چومتے دیکھ کر لرز اٹھا۔ بھائی جان قبر کے پاؤں کی طرف چہرے پر مصنوعی افسردگی لئے میرے ہمراہ بیٹھے تھے۔ لوگ باری باری آکر افسوس کر رہے تھے۔ بھائی جان سر کی خفیف جنبش سے ان کے اظہار افسوس کو قبولیت بخش رہے تھے۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ دیگیں کھولی گئیں۔ بھائی جان کیلئے ایک طباق میں گوشت کے موٹے موٹے ٹکڑے اور چاول لائے گئے۔ انہوں نے بے اعتنائی سے چاول کے چند دانے منہ میں ڈالے اور سر ہلا کر تقسیم کا حکم جاری کیا۔ لوگ دیگوں کے گرد جمع ہو کر تقسیم کا کام کرنے لگے۔ بھائی جان نے مجھے گھر جانے کا اشارہ کیا۔ دیگوں کا کھانا مزارعین، مولوی صاحبان اور طالب علموں اور شہر کے چیدہ چیدہ گھرانوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ خاندان کے لوگوں اور اہم سرکاری افسران بالا کیلئے کھانا گھر میں تیار کیا گیا تھا۔

ڈپٹی کمشنر صاحب کے آتے ہی کھانا مردان خانے میں لگایا گیا۔ میرے خوشامد پسند بھائی اب سرکار افسران بالا کی خوشامد میں مصروف تھے۔ موضوع گفتگو ہرگز مرنے والے خان محمد سلیمان خان جاگیردار نہ تھے۔ بلکہ موضوع گفتگو اراضی کے انتقال، دیوانی مقدمات، سڑکوں کی تعمیر کے ٹھیکے اور جنگلات کی کٹائی تھا۔

دو دن اسی سرگردانی میں گزرے۔ جب سارے مزارعے جا چکے تو ذرا سکون میسر آیا۔ مجھے بار بار احساس ہو رہا تھا کہ میں اس معاشرے، ان رسم و رواج اس طلوع غروب کا حصہ نہ تھا۔

پہاڑی نالے کا چبوترا ہی میرا اڈا رہا۔ میں سب سے آنکھ بچا کر کتاب لے کر چھتری کے نیچے بیٹھ کر پڑھنے کی کوشش کرتا۔ نالے میں تیرتی بطخوں اور راج ہنس کو تیرتا دیکھتا رہتا یا پھر دور شاہراہ ریشم پر دندناتے بدنما ٹرک اور بدصورت لاریوں کی ناآسودہ گڑگڑاہٹ سنتا رہتا۔ میرا جی جلد از جلد نیویارک جانے کو چاہ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں آکر میں اپنا آپ کھو رہا ہوں۔ لیکن مجھے کم از کم ایک ماہ یہاں ٹھہرنا تھا۔ پھر خیال آتا کہ یہ بیزاری بلاوجہ ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ یہ میری مٹی ہے۔ یہاں میرے لباجی اور میری ماں جی دفن ہیں۔ میں اس جائیداد کا وارث ہوں۔ نیویارک میں میرا کون ہے؟ در اصل میں وہاں اجنبی ہوں —— پھر مجھے سعیدہ کا خیال بھی آتا۔ اس نے تاکید کی تھی کہ گھر پہنچتے ہی خط لکھنے۔ "میں انتظار کروں گی۔"

ایک شام بکا میرے لئے چائے لے کر چبوترے پر آیا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ میں نے اسے بتایا کہ نیویارک میں میں جس ہسپتال میں تھا وہاں میری نرس جو تھی وہ پاکستانی تھی۔

"نیویارک کے بڑے ہسپتال میں پاکستانی نرس؟" بکا ہکا بکا ہو کر مجھے گھورنے لگا۔

"ہاں وہاں بہت سے پاکستانی آباد ہیں۔ میری نرس کا نام سعیدہ ہے۔"

"سرکار آج کل تو ساری دنیا میں پاکستانی پھیلے ہوئے ہیں۔"

"لیکن برکت، اس کی ماں مانسہرہ میں رہتی تھی، تحصیل کے پاس ——"

"ہاں جی ہوگی" بکے کی لاتعلقی نے مجھے خاصہ مایوس کیا۔

"بڑے سرکار آرہے ہیں۔" بکا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بھائی جان کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے چبوترے کی طرف آرہے تھے۔ انہوں نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور میرے ساتھ بیٹھ گئے۔

"یہ بکا کیا بک رہا ہے؟" انہوں نے مذاقاً کہا۔ بکا مسکراتا ہوا ان کیلئے چائے بنانے لگا۔ بھائی جان نے بکے کو رخصت دی اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"سفیدے کے امیر محمد خان کی بیٹی کے بارے میں چاچی خانم نے کئی بار کہا ہے کہ تم سے بات کروں۔ امیر محمد خان اور ہمارے جنگلات کا علاقہ ضلع بالاکوٹ میں ساتھ ساتھ ہے۔ امیر محمد خان خاندانی رئیس ہیں۔ ان کی بیٹی نسرین فرنٹیئر کالج پشاور میں پڑھاتی ہے۔ اس کے دونوں بھائی انگلینڈ میں ہیں۔ سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ چاچی خانم اور تمہاری بھابھی کی مرضی ہے کہ ان سے رشتے کی بات کی جائے؟" بھائی جان سوالیہ نشان بن کر مجھے گھورنے لگے۔

"بھائی جان! ابا جان کے بعد آپ میرے بڑے ہیں۔ چاچی خانم کا میرے دل میں بے حد احترام ہے لیکن اس بارے میں اقرار یا انکار کرنا اس وقت میرے لئے دشوار ہے۔ مجھے تعلیم مکمل کرنا ——؟" بھائی جان نے میری بات کاٹ دی۔ "اوئے بدبخت! تمہیں کون کل شادی کرنے کا کہہ رہا ہے۔ ہم صرف ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

ہم دونوں چند لمحے خاموش رہے۔ "خطا معاف بھائی جان! اس وقت کسی قسم کا فیصلہ مجھے قبل از وقت لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ بھائی جان نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے تم چاچی خانم سے بات کرو۔ وہ ان کو بلانے یا سفیدے جانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔"

"چاچی خانم کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی ہماری دیکھ بھال میں صرف کر دی۔ ہمیں بچوں کی طرح پالا۔ نہ شادی کی، نہ خاوند کی رفاقت سے ہمکنار ہوئیں۔"

"درست ہے" بھائی جان بولے۔ "لیکن ہمارے لباجی نے بھی ان کی محبت کا حق ادا کیا۔ ہماری اماں جی کی زندگی میں بھی چاچی خانم کو ہمارے خاندان میں حرف آخر کی حیثیت حاصل تھی اور اب بھی ہے۔ جو بات ان کے ہونٹوں سے نکلتی ہے میں فرمانبرداری سے پورا کرتا ہوں۔ وہ ہمارے گھر کے سیاہ و سپید کی مالک ہیں۔" انہوں نے چائے کی چسکی لی۔

"انھوں نے نہ خاوند دیکھا نہ اولاد دیکھی۔ اپنی زندگی، اپنی جوانی کی ساری انرجی اس گھرانے پر نچھاور کر دی ہے۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں بھائی جان!"

"اگر میں درست کہہ رہا ہوں تو تمھیں اندازہ ہے کہ اس بات کو رد کرنے سے انھیں کتنا گہرا دکھ ہو گا؟" بھائی جان کی آواز جذباتی تھی۔ میں اس اچانک حملے کیلئے تیار نہ تھا۔ ہم دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بھائی جان نے خود ہی گفتگو کا موضوع بدلا۔

"تمھیں یاد ہو گا گذشتہ سال دریائے سرن میں سیلاب آیا تھا۔ شنکیاری کے پاس کھڑی فصلیں زیرِ آب آ گئیں۔ کچے مکان ریت کے گھروندوں کی طرح پگھل گئے۔ جانور پانی میں بہہ گئے۔ خاصا جانی نقصان بھی ہوا۔ افراتفری تھی، اس سال دہقان فصل نہ اگا سکے۔ ان کے پاس کھانے کو نہ گندم ہے نہ جوار۔ حکومت نے جو رقم دینے کا اعلان کیا ہے وہ ان تک پہنچتے پہنچتے وزراء کی کوٹھیوں اور ہری پور کے گسترین خاندان کا حصہ بنی کیونکہ گسترین خاندان کے افراد نے یہ رقم تقسیم کرنا تھی۔ اب صورتحال یہ ہے کہ دہقان زمین بیچنے پر راضی ہیں۔ تحصیل دار صاحب نے مجھے خاص طور پر آ کر اطلاع دی ہے۔ موقع اچھا ہے، میرا خیال ہے ہم دونوں جا کر علاقہ دیکھ لیں۔"

"تو ان دہقانوں کا کیا بنے گا؟" میں نے سوال اٹھایا۔

"کیا بنے گا؟ رقم ان کے ہاتھ پر رکھیں گے اور بے دخل کریں گے۔"

"انھوں نے اپنی ساری زندگی اس زمین پر اپنا خون پسینہ چھڑکا اور آپ انھیں چند لمحوں میں بے دخل کر دیں گے؟"

بھائی جان نے مجھے گھور کر دیکھا "تو اور کیا؟"

حویلی سے ایک بچی بھاگتی ہوئی ہماری طرف آئی۔ چبوترے کے پاس رک کر اپنی چنی کا کنارا منہ میں دبا کر شرماتی ہوئی کہنے لگی۔ "بی بی جی نے آپ کو اندر بلایا ہے۔" بھائی جان نے حسبِ عادت سر ہلایا۔

بڑے کمرے میں میری بڑی بہن خورشید، ان کے خاوند ادریس خان (جو فارسٹ ڈیپارٹمنٹ میں کوئی ڈائریکٹر وغیرہ تھے) اور چند اور قریبی رشتے دار بیٹھے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی چاچی خانم بولیں۔

"امیر محمد خان کے گھر سے جواب آیا ہے۔ انھوں نے ہم سب کو کھانے پر بلایا ہے۔ میں نے ہاں کر دی ہے۔ کل ہم سفینے جائیں گے۔"

چاچی خانم کا حرف آخر پتھر پر لکیر تھی۔ کوئی کچھ نہ بولا اور نہ ہی بولنے کی ضرورت تھی۔ آخر کار بھائی جان بولے۔

"چاچی شان کی مرضی پوچھ لیں نا.....!"

"اس میں مرضی پوچھنے کی کیا بات ہے ایسا موقع بار بار نہیں آتا۔"

پتھر پر ایک اور لکیر نمودار ہوئی۔

"چاچی مجھے جانے میں بالکل قطعاً کوئی اعتراض نہیں لیکن منگنی وغیرہ کی بات فی الحال نہ چھیڑیں، مجھے ذرا سوچنے کی مہلت دیں۔" میں نے کہا۔

"ہم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے تمھیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔"

"ان دو خاندانوں کا ملاپ بالاکوٹ کے جنگلات پر کتنا اثر انداز ہو گا۔ ادریس خان بیٹھے ہیں ان سے بات کر لیں۔"

"آپ کا کہنا بجا ہے لیکن مجھے تھوڑا سا وقت درکار ہے۔"

"نیویارک میں رہ کر تم انگریز تو نہیں بن گئے؟" چاچی نے کہا۔ سبھی تھوڑا سا مسکرا دیئے۔ کمرے کی بوجھل کشیدگی میں کسی حد تک کمی واقع ہوئی۔ ادریس خان نے جنگلات کے متعلق اور لکڑی کی فروخت کے بارے میں میرے علم میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ بھائی جان نے بالاکوٹ میں حویلی تعمیر کرنے کی تجویز پیش کی۔ میں نے ساری باتیں سنیں اور پلے باندھ لیں۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ ہم کل امیر محمد خان کے گھر جائیں گے لیکن منگنی کی بات تاحال التوا میں رکھیں گے۔

باجی خورشید نے ایک بار پھر میری ٹانگ کے بارے میں پوچھا اور سب کو مطلع کیا کہ نیویارک کے ڈاکٹروں نے میری ٹانگ کی ہڈی کو لوہے کی پتری لگا کر جوڑا ہے۔

"تو وہ پتری کہاں ہے؟"

"میری ٹانگ میں"

"یہ پتری کب تک رہے گی۔"

"ایک سال تک۔" عورتوں نے توبہ توبہ کی۔ موضوعِ گفتگو چونکہ ہسپتال تھا اس لئے میں نے غنیمت جان کر سعیدہ کی والدہ کے بارے میں کریدنا چاہا۔

"ہسپتال میں میری نرس پاکستانی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں مانسہرہ سے ہوں تو وہ بڑی متعجب ہوئی، کہنے لگی اس کی ماں بھی مانسہرہ سے ہے لیکن اس کی پرورش ہری پور میں ہوئی ہے۔ مانسہرہ اسے بالکل یاد نہیں۔"

"توبہ خدایا، کیا اتفاق ہے۔ بالکل فلموں والی بات ہے۔" باجی خورشید نے ہنس کر کہا۔ "اس کی ماں کا کیا نام ہے؟"

"یہ معلوم نہیں۔"

"نرس کا کیا نام ہے؟"

"اس کا نام سعیدہ ہے۔ اس کی ماں فوت ہو چکی ہے۔ ایک چاچی تھی جو مانسہرہ میں رہتی تھی۔ شاید وہ بھی فوت ہو چکی ہے۔"

میں محسوس کر رہا تھا کہ چاچی خانم کو جیسے اس گفتگو سے الجھن محسوس ہو رہی ہے۔

"اس نرس کی پرورش ہری پور میں ہوئی تھی؟" چاچی نے جھک کر سوال کیا۔

"جی ہاں! اس کی ماں وہاں کسی کے پاس رہتی تھی۔ ہاں یاد آیا محمد سلیم خان کے ہاں..."

اچانک چاچی خانم اٹھ کر کمرے سے نکل گئیں اور ان کے پیچھے زیتونہ بھی چلی گئی۔ زیتونہ چاچی خانم کی خاص خادمہ تھی۔ دن رات چاچی خانم کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی تھی۔ چاچی خانم صرف زیتونہ سے مسکرا مسکرا کر کھسر پھسر کرتی تھیں۔ زیتونہ چاچی خانم کے کمرے میں ہی سوتی تھی۔ چاچی خانم کے اچانک اٹھ کر چلے جانے سے سارے قدرے متعجب بھی ہوئے لیکن جلد ہی ہم تھکن کی باتیں کرنے لگے۔ اچانک بارش برسنے لگی۔ بچوں نے شور مچانا شروع کیا۔ باجی خورشید نے مسکرا کر میری طرف دیکھا "سردیوں میں جب بارش برستی تھی تو شان میری منتیں کرتے تھے کہ باجی ذرا چھلیاں بنائیں، یاد ہے نا؟"

"بالکل یاد ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ بارش برس رہی ہے لیکن چھلیاں نظر نہیں آ رہیں۔" سب نے مل کر قہقہہ لگایا۔

سعیدہ کی ماں کے تذکرے پر چاچی خانم کا اچانک کمرے سے نکل جانا میرے ذہن میں وسوسے پیدا کر رہا تھا۔ چاچی خانم کا سعیدہ کی ماں یا سعیدہ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ سوچا مناسب وقت پر زیتونہ سے پوچھنا چاہیے لیکن زیتونہ چاچی خانم کی گہری رازدار تھی۔ زیتونہ چاچی خانم کی مستعد خفیہ پولیس کا کام بھی کرتی تھی۔ حویلی میں کام کرنے والے مرد عورتیں زیتونہ سے قدرے خائف تھے۔ بچا بھی ہمارا اپنا خادم تھا ہم سارے اس کے ہاتھوں پلے بڑھے تھے۔ اگر چاچی خانم نے کھل کر بات نہ کی تو میں نے بچے سے بات کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن چاچی خانم سے بات کرنا لازم تھا۔ میں موقع کی تاک میں رہا کہ کسی وقت چاچی سے اکیلا بات کروں گا۔ چاچی نے میری مشکل آسان کر دی۔ امیر محمد خان کی دعوت کے بعد ایک صبح

چاچی خانم میرا ناشتہ لے کر زیتونا کے ساتھ میرے کمرے میں آگئیں۔ زیتونا نے میز لگائی اور ادھر ہٹ کر چاچی کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

ناشتہ کے دوران انہوں نے امیر خان کے خاندان کی تعریفوں کے پل باندھے۔ ان کے سلوک، رکھ رکھاؤ اور تہذیب کے بارے میں ایک ایک بات نوٹ کر کے مجھے بتائی۔ مجھ سے وقتاً فوقتاً سوال بھی کرتی رہیں جن کا جواب میں سعادت مندی سے دیتا رہا لیکن زیتونا کی موجودگی میں چاچی سے سعیدہ کی ماں کے بارے میں بات کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ میں نے زیتونا کو گرم چائے لانے کو کہا۔ جونہی وہ دروازے سے نکلی میں نے جھٹ چاچی سے سوال کیا۔

"جب ہم سعیدہ کی ماں کے بارے میں بات کر رہے تھے، آپ اچانک تیز تیز قدم اٹھاتیں کمرے سے نکل گئیں۔ کیا آپ سعیدہ کی ماں کے بارے میں جانتی ہیں؟"

چاچی خانم کا رنگ فق ہو گیا، لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور غیر جذباتی آواز میں کہا۔ "نہیں، کوئی ایسی بات نہیں، میں سعیدہ یا اس کی ماں وغیرہ سے بالکل واقف نہیں۔" وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"شان بیٹے بہتر یہی ہے کہ تم اس لڑکی —— کیا نام ہے اس کا —— سعیدہ سے قطع تعلق کر لو، کیا ہوا جو اس کی ماں ضلع ہزارہ سے ہے۔ وہاں تمہارے اچھے اچھے دوست ہیں۔ تمہاری تعلیم مقدم ہے۔ تعلیم ختم کرو اور آکر اپنے بھائی ذیشان کا ہاتھ بٹاؤ، وہ اکیلا ہے اور بہت سی ذمہ داریاں ہیں اس کے سر —— تم واپس آؤ تمہارا گھر آباد ہو، میں یہ خوشی دیکھوں میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔"

زیتونا چائے دانی لے کر آئی اور میز پر رکھ کر اس پر ٹیکوزی رکھ دی۔ اسی شام میں نے بے کو ساتھ لیا، نالہ عبور کر کے ڈاک بنگلے کی طرف چہل قدمی کیلئے نکل گئے۔

"تمہیں کالا بابا یاد ہے نا؟" میں نے کہا۔

"جی یاد ہے، اللہ بخشے نیک آدمی تھا۔ ساری زندگی حویلی میں جاگیردار صاحب کی خدمت میں گزاری۔"

"اس کا ایک بیٹا بھی تھا —— ؟" میں نے سوال کیا۔

"جی بڑے سرکار نے اسے سکول داخل کرایا۔ پھر ایبٹ آباد کالج گیا، آج کل محکمہ جنگلات میں کوئی افسر ہے لیکن آپ کا نمک نہیں بھولا۔ جب بڑے سرکار کی وفات ہوئی تو ایک دن ایک رات پلنگ سے لگ کر بیٹھا رہا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔"

"کیا تم ہسپتال میں کام کرنے والے ڈرائیور کو جانتے ہو مجھے اس کا نام بھول گیا وہ بھی اکثر آتا تھا، ابا جی سے ملنے، یہ میرے اسلامیہ کالج پشاور جانے سے پہلے کی بات ہے۔" میں نے چالاکی سے پینترا بدلا۔

"جی وہ بدر منیر تھا —— وہ بھی چل بسا، اللہ بخشے!"

اب بے میری گرفت میں تھا۔

"ہاں یاد آیا۔ کیا بدر منیر کی بیوی ہمارے ہاں کام کرتی تھی؟"

"نہیں جی اس کی بیوی نہیں —— اس کی ——" بے جیسے سکتے میں آگیا۔ میں خاموشی سے چلتا رہا۔

"تم ڈاک بنگلے کے خانساماں کو جانتے ہو نا —— ؟"

"جی اچھی طرح ——"

"اسے اچھی سی چائے بنانے کا کہنا۔" میں چیل کے درختوں کے جھنڈ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ خانساماں بے کے ساتھ مسکراتا ہوا آیا۔ جھک کر ہاتھ ملایا۔ خیریت پوچھی اور چائے بنانے چلا گیا۔ بے بھی جانے لگا لیکن میں نے اسے روک لیا۔

"بیٹھ جاؤ برکت!" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"جو میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں صاف صاف اور دیانتداری سے بتانا ہوگا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"جو حکم کریں سرکار ہم آپ کے نمک خوار ہیں۔"

"بدر منیر کی بیوی کی بہن ہمارے ہاں کام کرتی تھی؟" میں نے رک رک کر کہا۔

"جی ——" بے کی آواز ٹوٹ گئی۔

"اس عورت کی شادی کب اور کہاں ہوئی تھی؟"

"جی —— میرے خیال میں اس کی شادی بالکل نہیں ہوئی سرکار!"

"اس کی شادی نہیں ہوئی لیکن وہ ایک لڑکی کی ماں ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

بے کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے، اس نے اپنی پگڑی کی جھول سے آنکھیں صاف کیں، خانساماں چائے لے کر آیا۔

"سرکار! آپ امریکہ میں ہیں؟" اس نے سارے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"جی نیویارک میں ہوں۔"

"سرکار جب آپ جائیں تو مجھے بھی ساتھ لے جائیں، آپ کی خدمت کروں گا۔"

"جی تو بہت چاہتا ہے کہ گھر میں کوئی ہو، کھانا بنائے، صفائی وغیرہ کرے لیکن امریکہ جانے کے قانون بڑے کڑے ہیں۔"

"سرکار آپ کیلئے کون سے قانون —— ؟"

خانساماں شاید لمبی بات کرنے کی تمہید باندھ رہا تھا لیکن میری بے رخی دیکھ کر واپس چلا گیا۔ میں نے معنی خیز نظروں سے بے کی طرف دیکھا، وہ میری نظروں سے چھپنا چاہتا تھا۔ لیکن ناکام رہا۔

"سرکار" وہ بے طرح رونے لگا۔ "یہ بی بی جی کا حکم ہے کہ گھر کی چار دیواری سے یہ بات باہر نہ نکلے۔ اگر بی بی جی کو علم ہو گیا تو میرے بال بچے برباد ہو جائیں گے —— میری زندگی ختم ہو جائے گی۔" وہ بدستور آنکھوں خشک کرتا رہا۔

"برکت!" میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "یہ بات گھر کی چار دیواری میں ہی رہے گی۔ میں بھی اس گھر کا فرد ہوں اور ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں، یہ بات صرف تمہارے اور میرے درمیان رہے گی۔ میرے ہونٹ اسے کبھی نہ دہرائیں گے۔"

میرے کہنے پر اس کی تھوڑی سی ڈھارس بندھی۔

"سرکار!" اس کی روہانسی آواز میں کہا۔ "اللہ اور اس کا رسول ﷺ میرا مددگار ہو۔ مرنے والوں کے پیچھے ایسی باتیں کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول میری کوتاہی معاف کریں۔" وہ پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے اسے اپنے آپ پر قابو پانے کا وقت دیا۔

"سرکار!" اس نے حلق صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اس دن بی بی جی نے سوائے میرے اور زیتونا کے سب ملازموں کو بڑے سرکار کے ساتھ بچوں سمیت گاؤں "اشر" پر بھجوا دیا۔ دوپہر کے بعد زیتونا نے آکر مجھے کہا کہ بی بی جی بلا رہی ہیں۔ میں اندر گیا تو سکینہ فرش پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کے پاس ایک گٹھڑی پڑی تھی اور بی بی جی کے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈی تھی۔ جو وہ اسے دے رہی تھیں۔ حضور سکینہ بڑے سرکار کی خدمت گار تھیں۔ آپ کی والدہ کی وفات کے بعد سکینہ ہی بڑے سرکار کی خدمت کرتی تھیں۔" وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "یا اللہ مجھے معاف کرنا۔ یا رسول اللہ مجھے بخش دینا۔ بی بی جی نے کہا کہ سکینہ ہری پور جا رہی ہے۔ اسے لے جا کر بس میں بٹھانا اور جب تک بس نہ چلے وہیں رہنا۔ پھر بی بی جی سکینہ سے مخاطب ہوئیں۔ "چل اٹھ چل وقت جا رہا ہے اور سن لیا تم نے۔ تم نے دوبارہ شہر کا رخ نہیں کرنا۔ اگر مجھے رتی بھر شبہ ہوا کہ تم الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔

بقیہ صفحہ نمبر 94 پر

چیونٹیوں کی قطار

امر محبوب ٹیپو

روشن دان سے کچھ نیچے دیوار میں ایک دراڑ ہے۔ یہاں سے یہ چیونٹیاں نکلتی ہیں اور پھر نیچے آکر زمین کے قریب ایک اور سوراخ میں غائب ہو جاتی ہیں۔

میرا قد کوئی پانچ فٹ آٹھ انچ ہے، ہاتھ اٹھاؤں تو تقریباً پونے سات فٹ کی اونچائی تک پہنچتا ہے، لیکن یہ دراڑ میری پہنچ سے بھی کوئی فٹ بھر اونچی ہے۔ روشن دان سے کوئی چھ انچ نیچے میں نے حساب لگایا ہے کہ اوپر سے نیچے تک یہ چیونٹیاں کوئی آٹھ فٹ کا سفر طے کرتی ہیں۔

وقت کا اندازہ لگانے کیلئے میرے پاس کوئی چیز نہیں جس سے معلوم ہو پائے کہ ایک چیونٹی کی اوسط رفتار کیا ہوتی ہے۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ انہیں اوپر سے نیچے تک پہنچنے میں کوئی دس منٹ لگتے ہوں گے۔ پھر سوچتا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ پانچ منٹ ہی لگتے ہوں، پانچ یا دس کیا فرق پڑتا ہے، وقت کی اہمیت کہاں ہے۔

اگر وقت ڈوری کی طرح کی چیز ہوتی تو میں اس کو لمبا بچھا دیتا اور دوہرا کر کے اس کے کئی حصے کر دیتا۔ جو حصے پسند آتے انہیں رکھتا باقی تمام پھینک دیتا۔ لیکن یہاں تو وقت ناپنے کیلئے گھڑی چاہیے یا کوئی ایسا آلہ جو ایک مستقل رفتار کے ساتھ چلے۔ ایسا کوئی آلہ میرے پاس موجود نہیں۔ کبھی کبھی میں اپنا ہاتھ ڈھیلا لٹکا کر گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس سے وقت کا کوئی اندازہ ہو سکے لیکن پھر جلد ہی تھک جاتا ہوں اور وقت کے گزرنے پر اپنے ہاتھ کے پنڈولم کی پابندی بنالیتا ہوں اور اسے آزاد چھوڑ دیتا ہوں۔ "میں آزاد نہیں تو کیا، میں نے وقت کو تو آزاد چھوڑا ہوا ہے" میں سوچتا ہوں۔

کبھی کبھی اپنے ہاتھ کے پنڈولم کی مدد سے میں نے چیونٹیوں کی رفتار ناپنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمیشہ یا تو چیونٹی پر سے نظر اٹھ جاتی ہے یا پھر ہاتھ کی گنتی بھول گیا۔ صرف دو دفعہ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ مکمل کر پایا ہوں۔ ایک بار 745 بار میں ایک چیونٹی نیچے تک پہنچی تھی اور دوسری بار 650 مرتبہ میں۔

اب میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے ہاتھ کی رفتار بدل گئی یا چیونٹیوں کی رفتار بدلتی رہتی ہے۔

چیونٹیاں اوپر سے نیچے تک ایک ہی قطار میں آتی ہیں۔ مجال ہے کہ کوئی اس سے نکل کر ادھر ادھر ہو جائے، ان کو لائن میں رکھنے کیلئے نہ سپاہیوں کی ضرورت ہے اور نہ وارڈن کی کسی دھمکی کی۔ ایک جگہ سے ایک چیونٹی گزر جائے تو لازم ہے کہ باقی بھی ادھر ہی سے گزریں۔ یہ بات میں نے کئی دن کے مشاہدے کے بعد دریافت کی ہے۔

اب میں اس فکر میں لگا ہوں کہ اندازہ کر پاؤں کہ ایک وقت میں اس قطار میں کتنی چیونٹیاں آتی ہیں لیکن یہ بھی آسان کام نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک انچ میں کوئی دس یا بارہ چیونٹیاں آتی ہیں۔ اس عدد کی بنیاد پر میں صرف اندازہ ہی لگا سکتا ہوں کہ پوری قطار میں کتنی آتی ہوں گی۔

یہ چیونٹیوں کی سائنس بھی کیا خوب علم ہے، اس کا اندازہ مجھے ابھی چند روز پہلے ہی ہوا ہے۔ میں اس علم کی جستجو میں اس کوٹھری کے تمام عذاب بھول گیا ہوں۔ بلکہ اب سوچتا ہوں کہ باقی کی قید بھی اسی کوٹھری میں گزر جائے تو مجھ پر کتنا کرم ہو گا۔

میں قیدی نمبر 1212 ہوں۔ مجھے اس جیل خانے میں اب کوئی بارہ سال ہونے کو آئے ہیں، تین ہفتے پہلے میری مست آرائیں سے لڑائی ہو گئی تھی اور میں نے اسے چاقو لگا دیا تھا۔ اس کی سزا میں وارڈن نے مجھے چالیس دن کیلئے اس اندھیری کوٹھری میں بند کر دیا۔ میرے حساب کے مطابق آج شاید 23واں دن ہے۔

ویسے تو میں کب کا دن گننا چھوڑ دیتا لیکن ان چیونٹیوں نے میرے تمام احساسات کو بے حد حساس بنا دیا ہے۔ یہ چیونٹیاں رکتی نہیں۔ یہاں تک کہ رات کے گھپ اندھیرے میں بھی میں نے دیوار پر ہاتھ رکھ کر محسوس کیا تو یہ چیونٹیاں مجھے اپنی قطار میں چلتی ہوئی محسوس ہوئی ہیں۔ پھر میں اپنے ہاتھ کو وہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ اندھیرے میں ان کے راستے میں ایک ناگزیر رکاوٹ حائل ہو جاتی ہے۔ پر میں نے محسوس کیا ہے کہ کچھ میرے ہاتھ کے اوپر سے کچھ اطراف سے ہوتی ہوئی نیچے پہنچتی ہیں اور ایک قطار کی صورت میں اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا ہے۔ اس سے مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ اندھیرے میں نہ صرف دیکھ سکتی ہیں بلکہ قطار بھی بنا سکتی ہیں۔ ان کی یہ صلاحیت معلوم کر کے میں دنگ رہ گیا ہوں۔

انسانوں میں فوج کے سپاہیوں کے علاوہ شاید ہی کسی اور میں اتنا نظم و ضبط دیکھا گیا ہے۔ لیکن فوجیوں میں بھی کیا نظم و ضبط ہوتا ہے ان کے ہاتھوں سے بندوقیں لے لو پھر دیکھو کہ کون کس کا کہا مانتا ہے۔

میں نے پچھلے تین ہفتوں میں چیونٹیوں سے جتنا کچھ سیکھا ہے شاید ہی زندگی میں کسی اور چیز سے سیکھا ہو گا۔ جب اس کوٹھری سے باہر نکلوں گا تو ضرور ایک بدلا ہوا انسان ہوں گا۔ دوسرے اس بات کو تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن مجھے پکا یقین ہے۔

وقت ناپنے کیلئے ایک مستقل رفتار سے چلتی ہوئی چیز چاہیے۔ یہ بات میں نے ان چند ہفتوں میں دریافت کی ہے۔ اس کوٹھری میں ایک مستقل رفتار سے چلتی ہوئی چیز صرف یہ چیونٹیوں کی قطار ہے۔ اگر یہ رک گئی تو وقت رک جائے گا۔ پھر اس کوٹھری میں تمام چیزیں ساکت ہو جائیں گی، سوائے میرے، میں وقت کو اپنی مرضی پر چلاؤں گا۔ جب میں ہلوں گا تو وقت چلے گا نہیں تو ساکت ہو جائے گا۔

روشن دان کے قریب سے نیچے آنے والی چیونٹیاں ایک مستقل رفتار کے ساتھ چلتی ہیں ان کی اس رفتار کے ساتھ میری زندگی کا نظم و ضبط وابستہ ہے۔ یہ زندگی کی علامت ہیں۔ جب میں صبح اٹھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ رات بھر میں اس قطار میں بارہ ہزار چیونٹیاں گزر گئی ہیں۔ کیونکہ میں نے پیمانہ بنایا ہے کہ ایک گھنٹے میں ایک ہزار چیونٹیاں گزرنی چاہئیں۔ جب میں سمجھتا ہوں کہ ایک ہزار چیونٹیاں گزر گئیں ہیں تو کہتا ہوں کہ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ یا جب میں

سمجھتا ہوں کہ ایک گھنٹہ گزر گیا ہے تو کہتا ہوں کہ دیوار پر ایک ہزار چیونٹیاں گزر گئیں ہیں۔ جب دیوار پر سے بارہ ہزار چیونٹیاں گزر جاتی ہیں تو میری کوٹھری کا دروازہ کھلتا ہے اور مجھے کھانا ڈالا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اسے ان چیونٹیوں نے ہی کھانا لانے کیلئے تعینات کیا ہے۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ یہ چیونٹیاں ہی باہر کی دنیا کا نظام چلاتی ہیں اور میں اس کائنات میں ان کا واحد پجاری ہوں اور باقی انسانیت تک پیغام پہنچانے والا ہوں۔

اب میں سوچتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں پیدا ہی اس پیغام کو پہنچانے کیلئے ہوا تھا کیونکہ بچپن ہی سے مجھے اپنی زندگی کا کوئی مصرف نظر نہیں آتا تھا۔ کبھی اپنے آپ کو ایک کام میں مگن پاتا تھا کبھی دوسرے۔ اسی طرح ایک بار میں کسی آزادی کے کام میں شامل ہو گیا تھا۔ نا جانے یہ آزادی کیا چیز ہوتی تھی۔ سارے وقت آزادی، آزادی کہتا رہتا تھا اور چند اور لوگوں کے گروہ کے ساتھ گھوما کرتا تھا۔ آزادی کے علاوہ ہم دو لفظ اور استعمال کیا کرتے تھے ۔۔۔ اب میں بھول رہا ہوں انہیں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ حقوق اور دوسرا ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ جمہوریت ۔۔۔ پتہ نہیں کیا مطلب ہوا کرتا تھا ان سب لفظوں کا لیکن اس زمانے میں مجھے خوب یاد تھا اور بڑے زوروں میں ان کے استعمال میں مگن رہتا تھا۔

پھر ایک روز ہم کسی ہوٹل میں چائے پی رہے تھے کہ چند سادہ کپڑے والے لوگوں نے اپنے ساتھ چلنے کو کہا، اس طرح میں جیل میں پہنچا۔ آج سے پورے بارہ سال پہلے۔ کس مصرف کیلئے یہ میں اس وقت بالکل نہیں جانتا تھا۔

اب جو سوچتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سب کچھ ان چیونٹیوں نے کروایا۔ وہ سب آزادی، جمہوریت وغیرہ کی باتیں ۔۔۔ اس لئے کہ میں جیل آؤں اور پھر جیل میں مجھے بارہ سال رکھا گیا تاکہ میں اس عظیم کام کیلئے تیار ہو جاؤں۔ پچھلے بارہ سال مجھے احساس رہتا تھا کہ میں کوئی عظیم کام کرنے والا ہوں، اب سمجھ میں آیا کہ وہ عظیم کام کیا تھا۔

بارہ سال کی تیاری کے بعد میں اس کوٹھری میں لایا گیا تاکہ باقی انسانیت کیلئے سمجھ پاؤں کہ وقت کی اصل اہمیت کیا ہے اور اس کا پیمانہ کن اصولوں پر مبنی ہے۔

اور پھر سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ بارہ سال کا عدد بہت مقدس ہے کیونکہ بارہ ہزار چیونٹیاں گزرتی ہیں تو دن سے رات ہوتی اور رات سے دن، چیونٹیوں کا علم سیکھنے سے پہلے مجھ سے بارہ سال تیاری کرائی گئی اور پھر مجھے کیوں چنا گیا اس عظیم کام کے واسطے ۔۔۔ اس لئے کہ میرا نمبر 1212 تھا اور ہاں گھڑی میں بارہ گھنٹے ہوتے ہیں ۔۔۔ یہ کس لئے" اب سوچتا ہوں تو کچھ میں آتا ہے۔

اس رات خبر آئی کہ جیل کا انسپکشن ہونے والا ہے۔ وارڈن نے راتوں رات تمام جیل کی صفائی کے آرڈر دیئے۔ سپاہی قیدی نمبر 1212 کی کوٹھری میں بھی آئے اور پانی اور لمبے لمبے برشوں کی مدد سے تمام دیواریں اور فرش صاف کر دیا۔

اگلے روز قیدی نمبر 1212 کی کوٹھری سے آوازیں آئیں، "وقت رک گیا ہے۔ ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ وقت رک گیا ہے۔ اب میں وقت چلاؤں گا ۔۔۔ اب ۔۔۔ میں وقت چلاؤں گا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ یہ دیکھو وقت چلا ۔۔۔ چلنا شروع ہو گیا ۔۔۔ یہ دیکھو رک گیا ۔۔۔ رک گیا ۔۔۔"

پھر شام کو دوبارہ آوازیں آئیں۔ "اب تک صرف دس ہزار چیونٹیاں گزری ہیں ۔۔۔ ابھی دو ہزار باقی ہیں ۔۔۔ ابھی دو ہزار باقی ہیں ۔۔۔ یہ چیونٹیاں رک کیسے گئیں ۔۔۔ چیونٹیاں رک کیسے گئیں۔"

پھر اندر سے آوازیں آتی رہیں جیسے کوئی چیز دیوار سے ٹکرا رہی ہو۔ اور قیدی کہہ رہا تھا "وقت چل رہا ہے ۔۔۔ چیونٹیاں چل رہی ہیں ۔۔۔ چیونٹیاں چل رہی ہیں ۔۔۔ وقت چالو ہو گیا ہے اب چیونٹیوں کی قطار نہیں ہے، دھار ہے ۔۔۔ دھار ہے ۔۔۔"

رات کو جب سپاہی اس کو کھانا دینے گیا تو قیدی کا مردہ جسم زمین پر پڑا پایا اس کے سر سے بہت سا خون بہہ چکا تھا۔

بعد میں قیدی نمبر 1212 کی فائل لائی گئی تو پتہ چلا کہ یہ قیدی آزادی و جمہوریت کی کسی تحریک کے دوران پکڑا گیا تھا اور تقریباً سولہ سال سے بغیر کسی کیس کے جیل میں قید تھا ۔۔۔ قانون کے دفاع میں اخباروں میں کچھ خبریں آئیں کہ یہ وہ بدقسمت شخص تھا جسے وقت بھول گیا۔

◆ ◆ ◆

بقیہ : صلیب ملامت

چل اٹھ اب۔"

زبیدہ نے سکینہ کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ میں نے گٹھڑی اٹھائی اور وہ روتی ہوئی میرے پیچھے حویلی سے نکل آئی۔ بکا سر جھکا کر جیسے وضو دار رہا تھا۔ "میں بھی بال بچے دار ہوں الٹے پھیر دی پہچان رکھتا ہوں۔ سرکار سکینہ پکی عمر میں ماں بننے والی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک چھپل میں لپٹی میرے پیچھے چلتی رہی۔ بے نے سر جھکا کر آنکھیں موند لیں۔

◆ ◆ ◆

توازن اور نشانات کے بعد
برصغیر پاک و ہند کے ممتاز نقاد
محمد علی صدیقی
کی تحریروں کا تازہ مجموعہ
"مضامین"
پتہ: ادارۂ عصر نو، ۵۹۲ اے بلاک جے، شمالی ناظم آباد، کراچی

ایک تھی لڑکی

افتخار نسیم

"میں تیار ہوں دلیپ!" ایک آواز آئی۔

میں نے چونک کر پردے کی طرف دیکھا۔

وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ نہیں وہاں کوئی ہے میں نے پھیلے اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ اپنی عینک کے شیشوں کو صاف کیا حالانکہ میری عینک بالکل ٹھیک تھی۔

"بوڑھا ہوتے جانا بھی ایک عذاب ہے۔" میں نے جھنجلاہٹ سے سوچا۔

میں بیس سال بعد سید ذوالفقار علی شاہ سے ملنے آیا۔ گھر وہی تھا۔ دیواروں کے اوپر اسی طرح انگوروں اور Money Plant کی بیلیں تھیں۔ چھوٹے سے پھاٹک کے ساتھ اسی طرح "آشیانہ" لکھا ہوا تھا۔ ہرے طوطے اسی طرح انگوروں کی بیلوں سے لپٹے ہوئے ہرے گچھے لگ رہے تھے۔ دیواروں پر جگہ جگہ پلاسٹر اکھڑ کر گر گیا تھا اور سفیدی نظر آرہی تھی۔ جب میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پھاٹک سے اسی طرح آواز آئی جیسے کوئی بوڑھا کھانس رہا ہو۔

"یہاں کوئی چیز تبدیل نہیں ہوتی۔"

میں نے سوچا۔

مگر کچھ تو تبدیل ہوا تھا۔ تامی نے بھونک کر استقبال نہیں کیا اور نہ ہی میں نے اپنا گیند پھینک کر اس کو اس کے پیچھے دوڑایا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا آیا۔

"امجد صاحب ہیں"۔

"جی وہ تو یہاں نہیں رہتے، انگلینڈ چلے گئے ہیں۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"کب سے؟"

"جی دس سال ہو گئے ہیں۔"

"ان کے بھائی ذوالفقار ہوا کرتے تھے؟"

"جی وہ ہیں۔"

"انہیں کو میں امریکہ سے ملنے کیلئے آیا ہوں۔"

"جی آپ کا نام؟" میں نے اسے اپنا نام بتایا۔

لڑکے نے اونچا سا پاجامہ اور لمبے بازوؤں والی قمیص، اس کے اوپر بغیر آستین والا سویٹر اور پاؤں میں قینچی چپل پہن رکھی تھی۔ مجھے ایک دم حسین بابا یاد آگیا۔

"تم حسین بابا کے کیا لگتے ہو؟"

"میں ان کا پوتا ہوں۔"

"تمہارے والد؟"

"وہ پچھلے سال گزر گئے۔" میں اور وہ ایک برآمدے میں سے گزر رہے تھے، چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ جیسے ہم کسی مقبرے سے گزر رہے ہوں۔ وہ سب لوگ کہاں چلے گئے؟ گیارہ بہن بھائیوں، چودہ کزن، دو نانیاں، تین بھائی ان کی بیویاں اور بچے، حسین بابا، اس کی بیوی اور بچے اور گاؤں سے آنے والے اتنے سارے مہمان، یہ سب کہاں چلے گئے؟

اتنے بڑے اور کھلے مکان میں مجھے گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ لڑکے نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا، ایک دبیز پردے کو ہٹایا۔ گانے کی ہلکی سی آواز آرہی تھی۔ سامنے دیوار پر ذوالفقار کی نوجوانی کی تصویر تھی۔ ایک طرف اس کے والد کی تصویر، جو مجھے ہمیشہ اچھی لگتی تھی۔ اس کا والد ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ کمر کے ساتھ تلوار لٹک رہی تھی۔ سر پر ایک زبردست کلف لگی پگڑی، اچکن اور نیچے شلوار پاؤں میں کھیڑی — مجھے یہ تصویر 1857ء کے راجے مہاراجوں کی یاد دلاتی تھی۔

"میرے ابا جان بہت بڑے زمیندار تھے۔" امجد تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیتا۔ "ہاں ہمارے پودینے کے باغ تھے۔" یہ ایک لطیفہ تھا جو ادھر سے آنے والوں کی لن ترانیاں سن کر مقامی لوگوں نے گھڑ لیا تھا۔ ایک ماسٹر امداد کی تصویر تھی۔ کھلے گلے کی سفید قمیص چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ، پنسل کٹ مونچھیں، چہرہ فربہی مائل۔ اس کی شکل واقعی سکول ماسٹروں والی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ اسی پیشے کیلئے پیدا ہوا تھا۔ فرش کے اوپر دری اور دری کے اوپر ایک دبیز پشمین کارپٹ جو جگہ جگہ سے گھس گیا تھا لیکن اس کا قیمتی پن ابھی تک جھلک رہا تھا۔ لکڑی کا سٹینڈنگ لیمپ جس میں ایک مدقوق سا بلب کمرے کی اداسی اور پر اسراریت میں اور اضافہ کر رہا تھا۔

جی چاہا کہ ایک لمحے کیلئے تمام پردوں کو ہٹا دوں تاکہ تازہ ہوا اور دھوپ اندر آجائے۔ لیکن اس کمرے کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ میں نے اپنی آنکھوں کو کمرے کی روشنی کے ساتھ Ad-just کیا۔ ایک کونے میں ٹی وی پڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دیوار کے ساتھ الماری میں کچھ ویڈیو کیسٹ پڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ دیوار پر بغیر فریم کے بلیک اینڈ وائٹ تصویریں لگی ہوئی تھیں، ایک طرف ایک پرانا گراموفون پڑا ہوا تھا۔

میں نے ذرا قریب ہو کر تصویروں کو دیکھا۔ تمام تصویریں پرانے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تھیں۔ مجھے اپنی اس نااہلی کا اعتراف ہے ایک تو یہ ہے کہ گھر والوں نے کبھی فلم دیکھنے کیلئے جانے ہی نہیں دیا اور دوسرا میرا انیس سال ملک سے باہر رہنے کی وجہ سے مجھ میں پاکستانی اور ہندوستانی فلموں کا مزا اور شوق Develop نہ ہو سکا لیکن ہندوستانی پرانی فلموں کے گانوں کا میں دیوانہ تھا۔ اور یہی دیوانگی مجھے ذلفی کے قریب لے آئی۔

میں فجر کی اذان کے بعد اٹھ جاتا بلکہ اٹھا دیا جاتا تھا۔ سخت سردی ہو یا گرمیوں کے موسم میں صبح کی نیند اور ہوا۔ میں ہمیشہ اٹھ کر محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے جاتا۔ اس کے بعد سیر کرتا اور باغ میں بیٹھ کر کتاب پڑھنا میرا معمول تھا۔ لیکن سات بجے گھر پہنچ کر ریڈیو سننا میرے معمول میں نماز کی طرح شامل تھا۔ ریڈیو سیلون سے سات بجے صبح سے ساڑھے سات بجے تک ہندوستانی پرانی فلموں کے گانے چلائے جاتے تھے۔ 1960ء کا زمانہ تھا۔ سائنس اور

ادب میں ایک انقلاب برپا ہو رہا تھا۔ میرے دل میں ابھی تک دنیا کو دیکھنے کے بعد والی سختی نہیں آئی تھی۔ بات بات پر آنکھیں جاگتے میں خواب دیکھنے لگتی تھیں۔ لڑکے اور لڑکیوں میں واضح فرق کا اتنا تفصیلی علم نہیں تھا جو اب ہے۔

1960ء میں پوری دنیا ہی ایک رومانوی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ چنانچہ سہگل، مکیش، کانن دیوی، کملا جھریا، پنکج ملک، روز ان کے گانے سنتا اور سوچتا یہ لوگ کیسے رہتے ہوں گے۔ ان کے جذبے کیا ہوں گے ان کو بھی سچا پیار ملا ہو گا کہ نہیں؟ لڑکوں میں بڑا ہونے کی کچھ مراعات تھیں ان میں سے ایک ریڈیو سننا بھی تھی جس سے میں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

پرانے گانوں سے پیار ہی میری اور اس کی دوستی کی قدر مشترک بن گئی۔ ہوا یوں کہ ایک دن میں اور امجد ان کے لان میں کرکٹ کھیل رہے تھے میں باؤلر تھا۔ امجد نے بال کو ہٹ کیا تو گیند برآمدے میں جا گری اور لڑھکتی ہوئی ایک ذرا سے کھلے ہوئے دروازے کے اندر چلی گئی۔ میں گیند کے پیچھے بھاگا، دروازے کو تھوڑا اور کھول کر اندر گھسا تو گانے کی ہلکی سی آواز آئی "جھوٹے ہیں سب سپنے سہانے"۔ یہ زہرہ بائی تھی میں پہچان گیا۔ میرا تجسس اور بڑھ گیا یہ کون سن رہا ہے؟ کمرے میں دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ روشن دان سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی۔ دیواروں پر مختلف تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ابھی میں اپنی آنکھوں کو اندھیرے سے مانوس کر رہا تھا کہ ایک آواز آئی۔

"تم آگئے ہو، دیکھو میں نے تمہارے لئے دوبارہ جنم لیا ہے۔"

میں ڈر گیا۔ بھوت پریت پر مجھے بہت یقین تھا۔ واپس پلٹا ہی تھا کہ اس آواز نے پھر کہا "لڑکے اپنی گیند واپس لے کر نہیں جاؤ گے۔"

اتنے میں گانا ختم ہو گیا اور سوئی اٹک سی گئی۔ کسی نے گیند میری طرف پھینکی اور میں اسے اٹھا کر بھاگ گیا۔ واپس آکر میں نے امجد سے پوچھا۔ "اس کمرے میں کون ہے؟"

اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ "اس کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ اب کبھی اس کمرے میں مت جانا اور نہ ہی اس کا کسی کو بتانا کہ تم وہاں گئے تھے۔"

لیکن میں سوچ رہا تھا کہ جب ساری دنیا کے ریڈیو سٹیشن "جنگلی" کے "یاہو" سے گونج رہے ہیں۔ یہ کون ہے جو پرانے گانے سن رہا ہے۔ چنانچہ اب میں نے یہ معمول بنا لیا کہ امجد کو آواز دینے سے پہلے اس کمرے کے باہر والی کھڑکی سے لگ کر ایک آدھا گانا سن لیتا۔ کبھی "محبت کے ماروں کا حال یہ ہوتا ہے" کبھی "غم دیئے مستقل کتنا نازک ہے دل" کبھی کملا جھریا کبھی اما دیوی کبھی سہگل۔۔۔۔۔!

ایک دن میں حسب معمول وہاں گانا سننے کیلئے آیا تو عدالت فلم کا یہ گانا لگا ہوا تھا "جانا تھا ہم سے دور بہانے بنا لئے۔"

یہ نیا گانا تھا اس لئے میں وہاں سے چل پڑا۔ ابھی ایک قدم اٹھایا تھا کہ آواز آئی "کیوں یہ پسند نہیں آیا۔"

میں نے گھبرا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی سلاخوں کے پیچھے پردہ پڑا ہوا تھا۔ "تمہارا نام کیا ہے لڑکے؟"

میں نے اپنا نام بتایا اور "آپ کا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"میرا نام مدھوبالا ہے۔ ممکن ہے نرگس، نسیم، کامنی کوشل، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم مجھے پرچھائیں کہہ لو۔"

آواز اتنی ڈرامائی تھی مجھے ایسے لگا میں کسی روح سے بات کر رہا ہوں۔ "سنو تم روز یہاں گانے سننے کیلئے آتے ہو میں تمہیں دیکھتی ہوں۔ تمہیں پرانے گانے اچھے لگتے ہیں اگر تم اس گانے والی کا نام بتا دو تو ہماری دوستی پکی۔"

اس نے گانا لگایا۔ اس آواز کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔

"کانن دیوی"

پردے کے پیچھے خاموشی تھی۔

"غلط ہے کیا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں میں حیران ہوں تم نے کیسے جانا؟"

"جی میں روز سیلون سنتا ہوں"

میرا سینہ فخر سے پھول گیا۔ اب میرا یہ معمول بن گیا اور جیسے امجد نے بھی اس بات کو قبول کر لیا اس لئے وہ میری دیری کا برا نہ مانتا تھا۔ آدھ گھنٹہ گانے سنتا "اس" سے باتیں کرتا، کبھی وہ کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے مجھے مٹھائی دے دیتی کبھی حلوہ، کبھی کھیر، کبھی چائے۔۔۔۔

اب گانوں کے ساتھ ساتھ پرانی فلموں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اب میں امجد سے ملنے کم اور "اس" سے ملنے زیادہ جاتا تھا۔ مجھے حیرانی اس بات کی تھی کہ اس کے گھر والے مجھے اس بات سے منع کیوں نہیں کرتے۔

سیدوں کا گھرانا اپنی عورتوں کی پردہ نشینی کیلئے کافی مشہور تھا۔ اول تو وہ کبھی فلم دیکھنے جاتی ہی نہیں، کبھی موقع ہوتا تو شہر کے واحد "منروے" پر کالے پردے لگا دیئے جاتے اور ایک شو پورے کا پورا۔۔۔ سید اقتدار علی شاہ کے گھرانے کیلئے وقف کر دیا جاتا۔ امجد کا دوست ہونے کے ناطے سے میں بھی ان کے ساتھ ہو لیتا لیکن وہ مجھے کبھی نظر نہیں آئی۔

ادھر کچھ دنوں سے ابا کی تبدیلی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ گھر کا سامان باندھا جا رہا تھا۔ سکول سے ہم سب بہن بھائیوں کی رپورٹیں اور سرٹیفکیٹ لئے جا رہے تھے۔ گھر میں ایک اودھم مچا ہوا تھا۔

میں چھ سات دن "اس" سے ملنے نہ جا سکا۔

ابھی میں کھڑکی کے پاس پہنچا تھا کہ اس کی آواز آئی۔ "آگئے ہو میرے مرنے سے پہلے آگئے ہو۔ اچھا کیا میں نے تمہاری کتنی راہ دیکھی۔ شاموا تم نے دنیا نہیں دیکھی۔ ڈاکٹر تم نے اس کی آنکھوں کو نہیں دیکھا۔

محفل میں جل اٹھی شمع پروانے کیلئے
پریت بنی ہے دنیا میں مرجانے کیلئے

"پہلے حصے کا مجھے پتہ نہیں، دوسرا حصہ دیدار کا ہے اور گانا نرملا کا" میں نے حسب عادت جواب دیا۔

"تم اتنی دیر کہاں رہے؟ میری دنیا تجھ بن روئے۔"

"ہم جا رہے ہیں ابا کا کراچی تبادلہ ہو گیا ہے۔"

ایک لمبی خاموشی چھا گئی باہر بادل گھرے ہوتے جا رہے تھے۔

"تم اندر آجاؤ"۔ میں برآمدے سے ہوتا ہوا اس کے کمرے کے دروازے کو کھول کر اندر چلا گیا۔ کمرے میں مدھم سی روشنی تھی۔

گھر گھر کے چھائی بدریا بالموا نہ جا
روتے ہیں نین باورے ان کو سمجھا جا

"جانتے ہو یہ کس فلم کا گانا ہے؟"

"نہیں!"

"ایک ننھی لڑکی کا"
"آج میں تمہارے سامنے آ رہی ہوں۔ اب تو تم چلے جاؤ گے، مجھے چھوڑ جاؤ گے۔ سب مجھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ماسٹر ابرار بھی مجھے چھوڑ کر پردیس سدھارے۔ میں نے اپنا من اور تن ان پر نچھاور کر دیا تھا لیکن وہ بھنورا میرا نہ بن سکا۔ سات سمندر پار چلا گیا۔"

ہم چاند کو ان کے دھوکے میں گھبرا کے اشارہ کرتے ہیں
بھگوان تمہاری دنیا میں رو رو کے گزارا کرتے ہیں

سٹینڈنگ لیمپ کی روشنی میں ایک پاؤں باہر آیا، اس نے پازیب پہنی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر سیاہ لہنگا تھا جس پر گوٹے سے کام کیا ہوا تھا۔ پھر ہاتھ آئے ان پر مہندی لگی ہوئی تھی اور بازوؤں میں گجرے۔ پھر سرخ رنگ کی چولی اور چولی کے اوپر زرد دوپٹہ جیسے ہندوستانی فلموں کی ہیروئنوں نے پہن رکھا ہوتا ہے۔ پھر وہ ایک دم میرے سامنے آ گئی۔ میں چونک گیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں سوچ رہا تھا۔

"مجھے علم ہے تم کیا سوچ رہے ہو میں کیا ہوں؟ عورت ہوں یا مرد؟ یا کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں بتاتی ہوں میں کیا ہوں؟ میں وہ مذاق ہوں جو قدرت نے عزت دار اونچے شملے والے سیدوں کے ساتھ کیا ہے۔۔۔۔ میری جنس مکمل ہونے سے پہلے ہی اس دنیا میں پھینک دیا۔ میں ایک عورت ہوں جو مرد کے جسم کے اندر قید ہے۔ میں جانتی ہوں اب تم مجھ سے کبھی نہیں ملو گے لیکن یہ سمجھ لو کہ اگر کہیں خدا ہے تو اس نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ میں ایک برزخ میں ہوں، اگر تم کبھی واپس آ بھی گئے تو مجھے یہیں لٹکا ہوا پاؤ گے۔ میں نے ایک ہی شخص سے پیار کیا تھا، ماسٹر ابرار سے اور اسے بھی میرے بابل نے دیس نکالا دے دیا۔ اب تم چلے جا رہے ہو کبھی وقت ملے تو مجھے ملنے کیلئے ضرور آنا۔"

"ہاں میں ضرور آؤں گا۔ لیکن آپ کا نام" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نام سے کیا ہوتا ہے۔۔۔۔ تم مجھے کچھ بھی کہہ سکتے ہو" اس نے گھمبیر سی آواز سے کہا جس میں درد بھی تھا اور گھمبیرتا بھی۔۔۔۔

"جی ہم کل کراچی جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اودھر آؤ!"

میں اس کے پاس گیا۔ ایک خوشبو نے مجھے احاطے میں لے لیا۔ اس نے میرے ماتھے کو چوما۔ "اب تم کہیں بھی جاؤ تم میرے ہو۔"

میں جلدی سے باہر نکل گیا۔ اور اب اتنی دیر کے بعد اس سے ملنے کیلئے آیا ہوں۔

"تم کتنے بدل گئے ہو؟" اندھیرے میں سے آواز آئی۔

"ہاں"

"کتنے بچے ہیں تمہارے؟"

"تین ہیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔"

"مبارک ہو!"

"کبھی مجھے بھی یاد کیا؟"

"کوئی دن ایسا نہیں ہو گا کہ میں نے یاد نہ کیا ہو۔۔۔۔"

میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم اتنے جذباتی تو نہیں تھے۔"

"دنیا جو دیکھ لی ہے۔"

"ڈاکٹر تم نے اس کی آنکھوں کو نہیں دیکھا۔ بتاؤ یہ کس فلم کا ڈائیلاگ ہے؟"

"مجھے کچھ علم نہیں میں یہاں پہیلیاں بوجھنے نہیں آیا۔ میں صرف یہ کہنے آیا ہوں تم نے تمام عمر اپنے ماضی کے بھوتوں کے ساتھ گزار دی ہے۔ تم جیسے ہزاروں بلکہ کروڑوں لوگ اس دنیا میں زندہ ہیں اور تم نے ایک کمرے میں اپنے آپ کو مقید کر رکھا ہے۔ باہر آؤ کبھی آج کی دنیا بھی دیکھو۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"مجھے علم ہے۔" ایک دبیز خاموشی نے مجھ سے کہا۔

"مجھے یہی خطرہ تھا ایک دن تم مجھ پر اپنا حق جتانے کیلئے آ جاؤ گے۔ اب تم چلے جاؤ، تم وہ نہیں رہے۔۔۔۔ تمہارا تصور تم سے زیادہ خوبصورت ہے۔ میں نے اپنے پچیس سال ماسٹر ابرار کی یاد کی طرح تم پر نچھاور کر دیے۔"

مجھے ایک دم اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں اس کے ساتھ کیوں جھگڑ رہا ہوں؟ میرا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔

"مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ تم نے تمام عمر پرچھائیوں کے ساتھ گزار دی۔ میں امریکہ سے آ رہا ہوں۔ وہاں اتنا بڑا انقلاب آیا ہوا ہے کہ دو بالغ شخص اپنی رضامندی سے اپنی ترجیحی جنس کے ساتھ رہ سکتے ہیں اور ایک تم ہو کہ وقت کے قدموں کے نیچے ایک دری کی طرح بچھ گئے جسے وہ روندتا ہوا چلا گیا۔ مجھے بتاؤ وہ سب لوگ کہاں ہیں؟"

"ٹھہرو! مجھے دیکھو۔" وہ ایک دم ٹیبل لیمپ کی روشنی میں آ گئی۔ وہ تو ویسے کی ویسے تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی سلوٹ یا جھری نہیں تھی۔

"میں نے بھی وقت سے انتقام لیا ہے۔ اسے مقید کر کے اس کی حد سے بہت آگے نکل گئی ہوں۔"

مجھے اپنے بوڑھے ہونے کا شدید احساس ہوا۔

"جیسے تم لوگ اپنے آپ کو اپنے بچوں میں تبدیل کر دیتے ہو، تمہارے بچے تمہاری عمر کا اضافہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح تم کبھی نہیں مرتے، امر ہو جاتے ہو۔ اسی طرح میں بھی امر ہو گئی ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو تمام دنیا میں ڈھال دیا۔ میں زمان و مکان جنس و جنس سے اوپر اٹھ گئی ہوں، یہ جو تم میرا ماضی کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتہ دیکھ رہے ہو میں جو ہر وقت پرانی فلمیں دیکھتی اور پرانے گانے سنتی ہوں۔ اس میں مجھے اپنا مستقبل، آنے والا کل نظر آتا ہے۔ جیسے ایک دائرے میں کھڑے ہو کر آدمی اس دائرے کے ہر زاویئے کو دیکھ سکتا ہے۔ ویسے میں بھی اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو دیکھ سکتی ہوں۔ تم نے اتنے سال اپنا "باہر" فتح کرنے میں لگائے ہیں۔ وہی سال میں نے اپنا "اندر" تسخیر کرنے میں لگا دیئے۔ جسے تم پرچھائیاں کہہ رہے ہو ممکن ہے وہی اصل جسم ہوں۔ ممکن ہے یہی آوازیں اصل ہوں اور باقی ہم سب ان کی بازگشت"

میں بھول گیا میں کہاں ہوں اور کس سے بات کر رہا ہوں۔ ایک روشنی مجھے اپنی لپیٹ میں لیتی چلی گئی۔ میرے اندر جتنے چور کونے کھدرے تھے جن میں ہمیشہ اندھیرا رہتا تھا روشن ہوتے چلے گئے۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے آپ کو مکمل تبدیل ہوتے دیکھا۔ میں ایک چھوٹا سا لاروا بن گیا، اسی رحم کے اندر میں ایک بچے میں تبدیل ہو گیا پھر میرے دو ٹکڑے ہو گئے ایک لڑکا اور ایک لڑکی بن گئے۔ پھر وہی لڑکا اور لڑکی، مرد اور عورت میں تبدیل ہو گئے۔ انہوں نے آپس میں اختلاط کیا۔ ہم دونوں میں سے ایک تیسرا شخص نکلا جس نے کہا

"میں مکمل انسان ہوں۔"

میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"شاید میں اونگھ گیا تھا۔" میں نے معذرت کی۔

"اتنا سفر جو کر کے آئے ہو۔"

میز پر چائے کے کور اسنیک پڑے ہوئے تھے۔ میں خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ میں جسے اتنا مکمل سمجھتا تھا کتنا مکمل لگا۔ میں نادم تھا اپنے تعصبات پر، اتنا مکمل ہونے پر۔

”تمہیں یاد ہے جب تم جا رہے تھے تو میں کون سا گانا سن رہی تھی۔“

”نہیں!“۔ ”آؤ میں ایک بار پھر تمہیں ماضی کے کھنڈرات میں لے جاؤں کیونکہ تم ایک بار پھر واپس چلے جاؤ گے اپنی دنیا میں ۔۔۔۔ مجھے علم ہے اب تم کبھی لوٹ کر نہیں آؤ گے۔“

اس نے ریکارڈوں کے انبار سے ایک ریکارڈ نکالا۔

گھر گھر کے آئے بدروا، ساجنوا نہ جا
روتے ہیں نین، باورے ان کو سمجھا جا

میرا دماغ گھومنے لگا۔ یہ کس قسم کا گانا ہے، وہ وقت کہاں گیا؟ میں کہاں ہوں؟ وہ سب لوگ کہاں ہیں؟ میرا وجود گھٹنے لگا۔

”اب تم جاؤ“ اس نے کہا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بڑھ کر میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ میں نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اس بوسے کو ایسے سنبھالتا ہوا باہر نکل آیا جیسے کوئی درگاہ سے تبرک لے کر آیا ہو۔

◆◆◆

رُباعی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مومنؔ

پئے شاہد و بادہ، صبر، توبہ توبہ
اس عمر میں دل پہ جبر، توبہ توبہ
ایامِ شباب اور دل جو، ساقی
فصلِ گل و جوشِ ابر، توبہ توبہ

"Revolutions have never lightened the burden of tyranny: They have only shifted to another shoulder."
(Bernard Shaw : 1903)

گر قبولِ اُفتد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
پاکستان کے ”پانچویں صوبے“
”نیویارک“
سے پہلی مرتبہ ایک مکمل، سنجیدہ اور متنوع ادبی
جریدے کی اشاعت کیلئے احبابِ ادارہ ماہنامہ ”زاویہ“
کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں
شاہد چغتائی

نظمیں

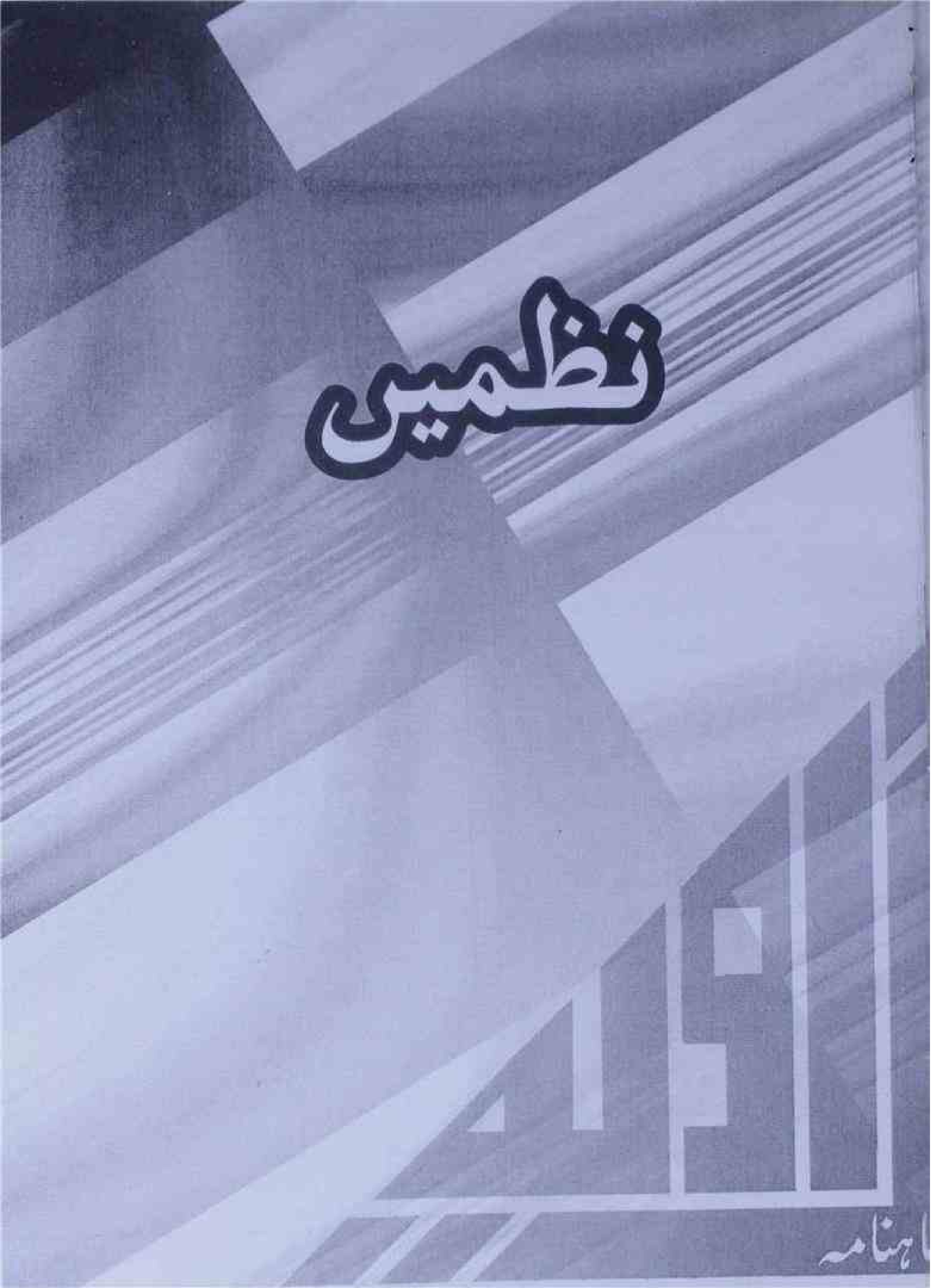

ستیہ پال آنند

ایک پینٹنگ کو دیکھ کر

دور پس منظر میں اک ویران، چٹیل، خشک میدان
نسل کش ناکارگی، بنجر زمیں، لاولد دھرتی
نزد منظر میں فقط اک خشک مردہ پیڑ ہے
جو جسم کی اپنی عمودی بے ریا جیو میٹری میں
صرف اک شولنگ سا ساکت
نظر آتا ہے، جیسے
دیکھنے والوں سے
یہ کہنے کی کوشش
کر رہا ہو
میں تو
افزائش
کی اک
ایسی
علامت
تھا، جسے
پوجا
گیا
تھا
آج
جب
میں
مر
گیا
ہوں
ساری
دنیا
مر
گئی
ہے!

سرائے سرائے ہے

جدھر دیکھتا ہوں
چکاچوند شہروں کی
جگ مگ مکاں، روشنی کے جزیرے
لوازم سبھی عیش و عشرت کے
آسائشیں زندگی کی
کھلی شاہراہوں پہ کاروں کے دریا
جوا گھر، شرابیں
فلیتے، شرارے
سبھی رقص گاہوں میں اڑتے ہوئے
نیم مدہوش جوڑے
سبھی کچھ ہے، لیکن
اگر چشم بینا سے دیکھیں، تو سب کچھ
یہاں کھوکھلا ہے
میں اندر کے اپنے
تھکے ہارے 'میں' سے یہ کہتا ہوں، بھائی!
یہاں رک کے آخر تمھیں کیا ملے گا؟
یہ پردیس کا اجنبی شہر ہے
اس میں کب تک رہو گے؟
سرائے سرائے ہے، گھر تو نہیں ہے!

جسم کے دو روپ

ستیہ پال آنند

(پہلا روپ)

جسم خود کو بانٹتا ہے
اپنی حدت، اپنی خنکی
لمس کی نرمی، تنفس کی حلاوت
بانٹنے کی نعمتیں ہیں
جسم اپنے چاہنے والوں میں یہ سب
نعمتیں تقسیم کرنا جانتا ہے
مختلف وقفوں میں اپنے ہاتھ کو کچھ روک کر
یہ جسم اپنی قوتوں کو مجتمع کرتا ہے
پھر سے بانٹنے کو
لینے والے سب برابر
ایک جیسے
ہاتھ پھیلائے
بدن کے رزق کی خیرات لینا چاہتے ہیں
جسم کی صحت بھی اس پر منحصر ہے
خود کو رزق خیر کی مانند بانٹے

(دوسرا روپ)

جسم خود میں مجتمع ہو کر ہی جینا چاہتا ہے
نعمتیں ساری ہیں اس کے پاس، لیکن
بانٹنے کو کچھ نہیں ہے
اک خزینے کی طرح
زیر زمیں رہنا ہی اس کی زندگی ہے
دھوپ کی جاں بخش حدت
یا ہوا کی نرم خنکی
اس کی قسمت میں نہیں ہے
جسم ہر پل تھوڑا تھوڑا
ذرہ ذرہ ٹوٹتا ہے
آخرش یہ ڈھیلا ڈھالا
بھر بھرا، مٹی کا تودہ، جسم
اپنی موت مر جاتا ہے
اپنے وقت کے آنے سے پہلے

گوہر سلطانہ عظمیٰ

میرے خدا!

میرے خدا!
میرے ان جذبوں کو
انا کی دھوپ سے بچانا
جن کی تخلیق تونے
خود اپنے موسموں کے رنگوں سے کی ہے
تو جانتا ہے کہ رنگوں کو کبھی کبھی
دھوپ اڑا لے جاتی ہے
میرے خدا!
میرے جذبوں کے رنگوں نے تو
تیری قدرت سے زندگی پائی تھی
ان پر انا کی دھوپ کا سایہ نہ پڑنے دینا
میں تو بس خود کو
ضبط کے آخری دور
اور صبر کی انتہا تک پرکھنا چاہتی ہوں

پھولوں کی پتیوں پر شعر لکھنے والی لڑکیاں
جب پتھر کے کھونٹوں سے باندھی جاتی ہیں
تو ان کا مالک
ان کی کمر پر
اس ظلم کی کہانی لکھتے ہوئے
کتنا مظلوم اور معصوم نظر آتا ہے

افتخار نسیم

تناسب

کسی بھی سوسائٹی میں
میرے جیسے لوگ
دس سے بیس پرسنٹ ہوتے ہیں
باقی نوے سے اسی پرسنٹ
تمہارے جیسے
اگر اسی فیصد لوگ
آبادی کا تناسب
برقرار نہیں رکھ سکتے تو
"فیر فٹے منہ"

ایک مختلف سہرا

سماج: میرے اور تمہارے درمیان
ایک بارات ہے
بینڈ باجوں کے ساتھ
سہاگ رات کو اگر حقِ زوجیت ادا نہ کر سکو
تو میرے بارے میں سوچ لینا
میں تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں
اب میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا

سندھی سے
شیخ ایاز
ترجمہ: شمشیر الحیدری

بھٹائی کی نگری

نمیں خشک دھرتی سے تھوہر نراس
چمکتی ہے بجلی کہیں آس پاس

اٹھا ساز اپنے جیالے چلے
نئے سُر نئے گیت گانے چلے

وہ مل بیٹھ کر گاؤں کی عورتیں
پھٹے کپڑے خوش ہو کے سیتی رہیں

سدا ماتا مسکراتی رہے
سدا آگ چولہوں میں جلتی رہے

دیئے پیار کے جگمگاتے رہیں
کمل روپ چہرے نہ مرجھا سکیں

بھٹائی کی نگری سدا خوش رہے
ہر اک دیس پردیس پھولے پھلے

مرے سندھ والے ازل سے ایاز
کسی کی برائی سے ہیں بے نیاز

منصورہ احمد

وہ مجھ سے مل کے بھی مجھ سے جدا ہے
کسی الجھن میں رستہ کھو گیا ہے

جو راتوں میں شعاع نور دیکھے
وہ میری آنکھ میں اس کا دیا ہے

مٹانا خد کو بھی دشوار ٹھہرا
کہ شہر دل کا وہ فرماں روا ہے

صبا خاموش، پھولوں کی زباں چپ
وہ مجھ کو بھول جانا چاہتا ہے

کرن بن کر سویروں میں ڈھلی ہوں
محبت کتنی قربت آشنا ہے

میں آنسو روک کر تارے بجھا دوں
جئے جانا مسلسل حادثہ ہے

ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں شب بھر
کہ فطرت بھی تو میری ہمنوا ہے

عجب افتاد ٹوٹی ہے زمیں پر
سمندر راستوں کو کھا گیا ہے

خیال کی بستی

شمشیر الحیدری

حقیقتوں کو طبیعت کی روشنی پہنچی
نظر کے سامنے میری عجیب منظر تھا
بہت ہی دور بھی تھی خیال کی بستی
قریب و دور فقط میرا ہی تصور تھا

عجیب قسم کی تنہائیوں کا تھا ماحول
بڑا وسیع تھا میدان، رات کا عالم
فضا میں خوف کے آثار تھے بھی پیدا
جہاں کے سارے اندھیرے وہیں پہ تھے باہم

ہوا کا سینہ پھٹا جا رہا تھا چیخوں سے
فلک کو لرزہ تھا، وہ بجلیوں کو وحشت تھی
بھنور اٹھے تھے سمندر کے اژدہے سارے
فضا کے خوف سے دھرتی بھی زیر وحشت تھی

یقیں ہے آئیں گے آئندہ آنے والے یہاں
کریں گے آ کے یہیں اپنے وقت کی منزل
کوئی تو ان کیلئے روشنی سجائے گا
کریں گے گرم جو بڑھ بڑھ کے عزم کی محفل

محبتوں کے وہ مرد ایسے پہلوان ہوں گے
کریں گے دن کو سحر تو رات کو برہم
فلک کا اوج قدم ان کے جھک کے چومے گا
نرالے نور کے مشعل جلائیں گے پیہم

دیئے کی لو تو کسی حال میں رہے قائم
یہی ہے میرے مقدر کا فیصلہ ٹھہرا
پہاڑ جیسے ارادے ہیں میرے سینے میں
ہوا کے زور سے بڑھ کر ہے حوصلہ میرا

حقیقتوں کو طبیعت کی روشنی پہنچی
نشان راہ ہے دانائے وقت کی محنت
ہے نور فکر سے روشن خیال کی بستی
صریر خامہ سے ہے جسد ارض میں حرکت

مصیبتوں کی اسی رات پہ نظر رکھئے
مجال ہے یہ دیئے کو کہ وہ رہے قائم
کرے تو کون بھلا آ کے اس قدر حیلہ
مٹا کے خود کو، دیئے کو رکھے صحیح سالم

مصیبتوں کی اسی رات پہ نظر رکھئے
یقین کا تو یہاں وہم ہی گزرتا ہے
مگر خیال کی بستی میں کیا نہ تھا ممکن
ہوا کے دوش پہ شعلے کی زندگی کیا ہے

یہاں تو نور نچوڑے ہے کوئی آنکھوں کا
انڈیلے جاتا ہے دم دم دیئے میں آب حیات
بڑھائے جاتا ہے پل پل ذرا ذرا مٹ کو
بنا کے رکھے ہیں عالم پناہ اپنے ہاتھ

دیئے کی لو ہی اگر بجھ گئی تو کیا ہو گا
ابھی تو کتنے محبت کے مرحلے ہوں گے
پھر آج رات کی موقف کا حال کیا ہو گا
صبح کے راتوں کے کس طور سلسلے ہوں گے

"Wrong Exit"

ریحانہ قمر

مگر یہ زندگی کے ہائی وے پر چلنے والے کب سمجھتے ہیں
غلط ایگزٹ پہ مڑ جائیں تو منزل چھوٹ جاتی ہے
مجھے دیکھو
مجھے بھی ایک ایگزٹ پہلے مڑ جانا پڑا تھا
اور میں بے انت رستوں پر نکل آئی
نہ جن سے لوٹنا ممکن
نہ منزل تک پہنچ پانا مرے بس میں
میں بڑھتی اور بچھڑتی ، دور ہوتی چور ہوتی جا رہی ہوں
دشتِ ناپرساں کی وسعت میں
نہ بستی کا نہ پیڑوں کا نشاں جس میں
پرندے ہیں نہ سایہ ہے نہ پانی ہے
نہ واپس لوٹ جانے کا کوئی ایگزٹ
اگر کچھ ہے تو وہ میرے سفر کی رائیگانی ہے
مری فریاد کی دم توڑتی آواز نے میری سماعت چھین رکھی ہے
نہیں ہے "نو سو گیارہ" کی سہولت بھی!
اگر ہوتی
تو بے آواز لفظوں کا مداوا کوئی کیا کرتا
کوئی سنتا تو کیا سنتا؟
مرے بالوں میں اتری (رائیگاں میرے سفر کی) دھوپ کوئی کس طرح چنتا؟
مری آنکھوں کے بجھتے رات کے آثار کوئی دیکھتا کیسے ؟
کوئی کیسے سمجھتا
زندگی کے ہائی وے پر اک غلط ایگزٹ پہ مڑ جانا قیامت ہے
کہ میں تو یہ بھی کہہ سکنے سے قاصر ہوں
"مجھے دیکھو!"

ایک نوحہ

احمد سلیم

ترے دیدار کا موسم ہے
اور آنکھوں میں دل کا رنگ لرزاں ہے
ترے جلووں کی رت مہکی ہے
اور گلیوں میں قتل کا ساماں ہے
تری انجم نظر مجھ پر جھکی
اور دھو گئی چہرہ لہو سے اور اشکوں سے
مرے دل کے خرابے میں
کہیں سڑکوں پہ پیڑوں میں الجھتا ہے کوئی ٹوٹا ہوا ابرا
کہیں جھکا ہوا چہرہ نظر کو باندھ لیتا ہے
کسی تتلی کے پر پیڑوں میں آتے ہیں
یہ ساعت تھی لبوں کے گل کے کھلنے کی
مگر اس ساعت دیدار میں ہمدم
دل پر خوں کی لالی اب ترے رخ سے جھلکتی ہے
ترے ہاتھوں میں میری انگلیوں کی کپکپی یوں مرنے لگتی ہے
کہ جیسے بچے مرتے ہیں
ترے دیدار کا موسم ہے
اور گلیوں میں دلداروں کے سر دھڑ ہاتھ اگتے ہیں
کئی بے چہرہ آنکھیں
راحت دیدار سے محروم جانے کس کو تکتی ہیں
یہ تیرے وصل کی ساعت ہے ہمدم
اور میں دل کے لبوں تک بھر رہا ہوں خون کا پیالہ
مری آنکھوں میں تیرے لب جھکے اور بجھ گئے پل میں
مرے ہونٹوں پہ تیری انگلیاں بے سود تڑپیں اور تڑپ
بکھر گئیں لہو کے کناروں سے
ترے دیدار کی رت اب رلائے گی ہمیں کتنا
یہ بستی فرش گل پہ اور کتنا خون چھڑکے گی ؟

یہی عادت ہے اس کی

منصورہ احمد

یہی عادت ہے اس کی
اک جھلک دے کر کہیں روپوش ہو جانا
کسی کوندے کی مانند
آنکھ کی چوکھٹ کو چھونا
اور چھپ جانا
کسی بے مہر جھونکے کی طرح پل میں گزر جانا
اسے کیسے کہے کوئی
کہ صحراؤں کی جلتی پیاس رم جھم سے نہیں بجھتی
اسے کیسے کہے کوئی
ہوا کے ایک جھونکے سے
ہزاروں سال کی کربل کتھا
کیسے کہے کوئی ؟

ایلن گینسبرگ کے نام

حسن مجتبیٰ

ایونیو ففتھ پر راما کرشنا کے جلوسوں میں
کھڑا تھا ایک بوڑھا
ہمشکل ایلن کا
گیروی رنگوں
جلترنگوں اور دھمالوں
گورے کالے سات رنگوں کے جلو میں
جون کی دوپہر میں چپ چاپ اور تنہا
الگ سب سے
اس طرح جیسے
وہ سارے فلسفوں کا بن گیا ہو آخری نکتہ
ایونیو ففتھ پر چلتے ہجوموں میں
میں اک کھویا ہوا بچہ
میں اس کے خیال کی انگلی پکڑ کر دور جا نکلا
کہیں سیہون کی گلیوں میں
”سر بازاری رقصم“
یہ سب کچھ خواب میں دیکھا ہوا پہلے سا لگتا ہے
”مروانا“ کی سرگوشی
میرے کانوں کو ”نروانا“ سی لگتی ہے
ایونیو ففتھ بھی میرا
سیہون کے گلی کوچے بھی میرے

پوتر سندھ کے روشن کناروں پر
لکھے رگ وید کے سب شبد بھی میرے
ہری راما کرشنا کی صدائیں بھی مری
اور سب آیاتِ قرآنی بھی میری ہیں
کہ میں چاغی کا باغی ہوں
پوکھران کا پہلا منکر ہوں
کہ میں منکر ہوں اورنگزیب کی ساری خدائی کا
وطن تیری جدائی کا میں جب بھی گیت گاتا ہوں
میں خود میں لوٹ آتا ہوں
مگر گولی کی بولی میں وہ مجھ سے بات کرتے ہیں
وہ دیواروں پہ تحریریں نہیں پڑھتے
کہ جرنیلوں کی وردی پر گدھا پیشاب کرتا ہے
نئی دہلی کی خون آلود گلیوں میں
رقص کرتا ہے کوئی سرمد
”خدا ایم من، الی چند ستم غیر“
الی چند تیری آنکھوں پر
قطب اقطاب، ولیوں کے وضو ٹوٹیں
مرے اندر کی عورت
اور یہ انگور کی بیلیں

وہی ہے چاند ہڈسن پر
روپہلی شام جیسے سندھ پر اترے
وحی جیسے پیمبر پر!

Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.

MONEY TRANSFER

MEHRAN

TRADING

Sent Money to Pakistan with Best Rate & Quality Service.

Delivery in any city of Pakistan

- Lahore
- Karachi
- Gujranwala
- Sialkot
- Gujrat
- Faisalabad
- Kharian
- Tobatek Singh
- Chicha Watni
- & Peshawar

FOR BEST RATE, CALL RIGHT AWAY

TEL: 718-507-6000 FAX: 718-779-4381

75-18A JACKSON HEIGHTS,BROOKLYN NY 11373

Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.Rs.

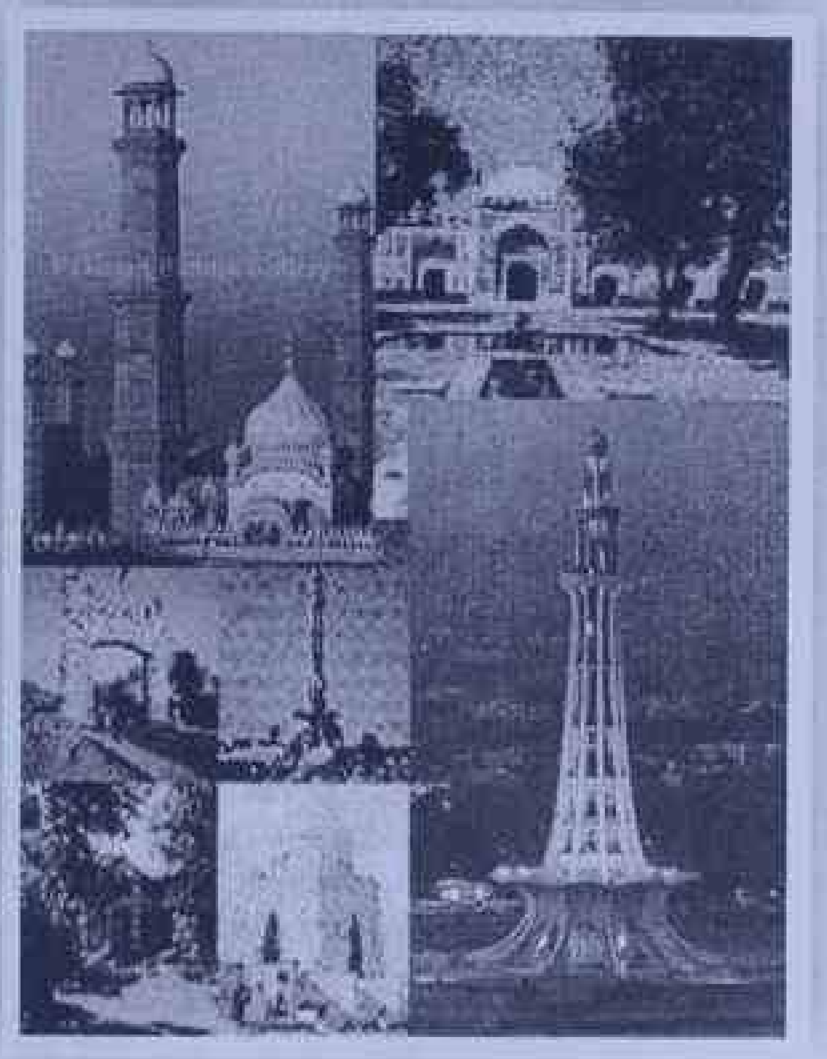

تنازعات

ماھنامہ

منیر نیازی ایک بر خود غلط

جوہر میر

منیر نیازی کے بارے میں ڈاکٹر یونس بٹ جو کچھ تحریر فرما چکے ہیں اس میں اضافہ تو نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر منیر نیازی کو ادبی اور شعری صدی کا نامور بر خود غلط قرار دے دیا جائے تو کوئی مضائقہ اس لئے نہ ہو گا کہ بر خود غلط ہونا کوئی بری بات ہوتا تو منیر نیازی ہر دو چار ماہ بعد اس کا ثبوت پیش کرنے سے احتراز کرتا، اپنے بہت ہی قابل احترام معاصرین کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے آپ کو پیانے سے باز آجاتا اور ساری توجہ دوسروں کی عیب جوئی کے بجائے اپنا ہنر مانجھنے پر صرف کر دیتا جس کے بہت ہی زنگ خوردہ ہونے میں کسی کو شک وشبہ نہیں۔ منیر نیازی کی مثال ہیرا منڈی کی اس مرحومہ جیسی ہے جو بے توجہی کے دنوں میں اپنے کوٹھے کے سامنے گلی میں بہت سا چھڑکاؤ کروادیا کرتی تھی، جب بھی کسی کا پاؤں پھسلتا اور وہ دھڑام سے گرتا وہ قہقہے لگاتی، گرنے والا جوابا موٹی اور غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتا وہ گالیاں سن کر باغ باغ ہو جاتی، ہر گالی راحت اور تسکین کے جھٹکوں کی طرح اس کے بدن کو جھنجھوڑ دیتی اور پھر اس کے کلیجے کے علاوہ کئی اور مقامات پر ٹھنڈی سی پڑجاتی، منیر نیازی کے توہین آمیز بیانات کے چھڑکاؤ کا کوئی اور مطلب نہیں ہو سکتا۔

حیرت اس بات کی ہے کہ منیر نیازی کے بیانات سے لت پت ہونے والے لوگ جوابا کچھ کہتے کیوں نہیں؟ ان کی خاموشی کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ منیر نیازی کو اس تسکین کا مستحق نہیں سمجھتے جو ہیرا منڈی کی عمر رسیدہ بائی ہی حاصل کرتی تھی، اور دوسری وجہ یہ کہ ان کے کچھ کہنے سے منیر نیازی نے اپنا "چھڑکاؤ" بند نہیں کر دینا، اس نے بار بار چھڑکاؤ کرنا ہے جوابا کچھ سننے کیلئے، منیر نیازی کے بارے میں کچھ نہ کہنے والوں کے رویے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو شخص ایک غلطی بار بار دہراتا ہے اس کا منیر نیازی یا بر خود غلط بن جانا پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔

منیر نیازی کے بر خود غلط ہونے کی تشخیص کرنے والوں کا کہنا تھا کہ موصوف کا ماشکی بن جانا دراصل ناقدری کا ہیجان ہے، رقت ہے، فرسٹریشن ہے مگر صدارتی شاباشی کے سرٹیفکیٹ کی وصولی کے بعد بھی اس کی طرف سے معاصرین کے خلاف ہرزہ سرائی کا ترک نہ کیا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ در حقیقت مستند بر خود غلط ہے، صدارتی شاباشی کا سرٹیفکیٹ اس کی ذہنی انا کی مرہم پٹی نہیں کر سکا یا پھر یہ کہ منیر نیازی نے شاباشی کے سرٹیفکیٹ کو اپنی ہرزہ سرائی کی شاباش سمجھ لیا ہے۔

اپنے تازہ ترین انٹرویو میں غالبا جنرل پرویز مشرف کی "شاباشی" حاصل کرنے کیلئے اسنے جس چھڑکاؤ کا دام بچھایا ہے معاصرین کی توجہ کا مستحق ہے، خاص طور پر ان کی توجہ کا جو بہت ہی سینئر شاعروں اور ادیبوں کے خلاف منیر نیازی کے ہرزہ سرایانہ ریمارکس کی وجہ سے اپنے مقام اور مرتبے یا اپنی شعری اور ادبی کنٹری بیوشن کے حوالے سے کہیں کمتر نظر نہیں آتے۔ منیر نیازی اگر جناب احمد ندیم قاسمی جیسے بزرگ، عظیم اور شاعر ساز شاعر کو شاعر تسلیم نہیں کرتا تو کسی اور کے شاعر مانے جانے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ وہ اگر ندیم صاحب کو افسانہ نگار نہیں مانتا تو کسی اور کے افسانہ نگار سمجھے جانے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟

شعری دنیا کے اس "آتے" نے بے نظیر اور نواز شریف کو نام نہاد جمہوریت کا آخری نمونہ قرار دیا ہے۔ نواز شریف کی نام نہاد جمہوریت کے اس احسان کا خیال بھی نہیں کیا جو صدارتی شاباشی کے سرٹیفکیٹ کی صورت میں اس پر کیا گیا ہے۔ منیر نیازی نے یہ جو کہا ہے کہ "ہم سب بے ایمان لوگ ہیں" اس کی احسان فراموشی کی منطق سے درست ہی ہے یعنی منیر نیازی شعری اور ادبی معاملات ہی میں بے ایمان نہیں سیاسی معاملات میں بھی ایمانداری اسے چھو کر نہیں گزری، وہ کوئی پڑھا لکھا آدمی ہوتا تو پاکستان میں "ہم سب بے ایمان ہیں" کے پس منظر سے آگاہ ہوتا، اسے معلوم ہوتا کہ جرنیلوں کی ذہانتوں سے مشرف باد ہونے والے معاشرے کسی کو ایماندار رہنے ہی نہیں دیتے۔ اسے پتہ ہوتا کہ پاکستان میں جمہوریت کو "نام نہاد جمہوریت" بنا دینے کا سہرا کس کے سر بندھا ہوا ہے۔ پاکستان کو کرپٹ کر دینے بلکہ کرپٹ کر دینے کی روایت کس نے ڈالی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت اصطلاحا کوئی کامل واکمل چیز نہیں ہوتی۔ یہ دنیا میں کہیں بھی کامل واکمل شکل میں رائج نہیں۔ یہ تو ایک یوٹوپیا ہے جو مسلسل مشق سے جدوجہد سے، انسانی حقوق کی بتدریج آسودگی کے ساتھ پھلتا پھولتا ہے۔ پاکستان جیسے ممالک میں تو اس کا مستقبل کبھی محفوظ نہیں رہا۔ فصلوں کے شب خونوں نے کبھی جمہوری عمل کو برداشت ہی کب کیا ہے؟ پاکستان میں تو الٹوں تلٹوں سے جو کچھ رائج رہا ہے وہ بھی برداشت نہیں کیا جا سکا۔ منیر نیازی کے یہ الفاظ اس کی ذہنی بلکہ کرپشن کا نا قابل تردید ثبوت ہیں جو اس نے جنرل پرویز مشرف کے "کچھ کر جانے" کی توقع میں کہے ہیں، وہ پڑھا لکھا آدمی ہوتا۔ اسے سیاست کا ادنیٰ سا شعور بھی ہوتا تو طاقت سے "مسلط کی ہوئی جمہوریت اور ایمانداری" کی وکالت نہ کرتا، وہ اصرار کرتا کہ معاشرے کے سیاسی اور فکری ارتقاء میں مداخلت نہ کی جائے۔ معاشرے کو اپنے تضادات کے نقطہ عروج کی طرف بڑھنے دیا جائے تا کہ وہ اپنے خمیر سے تبدیلیوں کی خبر لائے۔ منیر نیازی جیسے بر خود غلط افراد کی دانست میں جنرل مشرف نے نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹ کر نام نہاد جمہوریت کا خاتمہ کیا لیکن ایک سیاسی طالبعلم کی دانست میں تختہ ان تضادات کا الٹا گیا ہے جو معاشرے کو منطقی تبدیلیوں کی طرف لے جا رہے تھے، جو تقاضا کر رہے تھے کہ "ہم بے ایمان لوگ" ملک کے دفاع کے نام پر مزید "بے ایمانیوں" کے متحمل نہیں ہیں۔ اور "ہم بے ایمان لوگ" ایٹم بم بنا کر ملک اور عوام کو آسودگی اور خوشحالی نہیں دے سکتے اور یہ کہ عوام کے اعتماد سے محروم کر دیئے جانے والے معاشرے، حکومتیں اور مملکتیں ایٹم بموں کی طاقت سے باقی نہیں رہ سکتیں۔

منیر نیازی کی "نام نہاد" جمہوریت کے خاتمے نے ہمیں ایک بار پھر اسی مقام پر واپس پہنچا دیا ہے جہاں سے ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

عطاء الحق قاسمی کو ان کی پسندیدہ جمہوریت کا طعنہ دے کر منیر نیازی نے اپنی "حقیقی جمہوریت" پسندی کا ثبوت پیش نہیں کیا۔ منیر نیازی کی مشرف پسندی اس شبہے کا ازالہ ہے کہ خدانخواستہ وہ جمہوریت پسند بھی ہے، واقع یہ ہے کہ منیر نیازی ایک فاشسٹ آدمی ہے۔ جمہوریت سے اس کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں۔ عطاء الحق قاسمی کے خلاف اس کے ریمارکس کی اصل وجہ یہ ہے کہ نواز شریف حکومت نے انہیں ایک یورپی ملک میں سفیر مقرر کیا تھا اور منیر نیازی کو "انسداد بے رحمی طفلان" کے پیش نظر کسی سکول کا ہیڈ ماسٹر نہیں بنایا تھا، جناب عطاء الحق قاسمی جیسے پڑھے لکھے شاعر ادیب اور معلم کا سفیر بنایا جانا سیاسی تعصبات کی بنا پر تو قابل اعتراض ہو سکتا ہے لیکن پاکستان کے ایک باصلاحیت شہری کی حیثیت سے ہم ان کی بطور سفیر تقرری کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ کر سکتے تو منیر نیازی نے عین وقت پر چیلنج کر دیا ہوتا۔

ویسے سوچنے کی بات ہے، یہ منیر نیازی ہوتا کون ہے کسی کو شاعر یا غیر شاعر قرار دینے والا؟ جس شخص کی اپنی شاعری متنازعہ ہو، یہ پتہ نہ چل رہا ہو کہ وہ جو دو چار اچھے شعر اس کے نام سے منسوب ہیں اس نے کیسے کہہ دیئے ہیں کیسے جید شعراء کے بارے میں کہہ سکتا ہے کہ فلاں کبھی شاعر نہیں رہا یا فلاں فراڈیا ہے؟ "نام نہاد" جمہوریت پر پھبتی کسنے والے اس بر خود غلط کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ پاکستان کا بچہ بچہ جناب احمد ندیم قاسمی، جناب قتیل شفائی، جناب احمد فراز، جناب افتخار عارف اور جناب امجد اسلام امجد کو نہ صرف شاعر مانتا ہے بلکہ اکثر نے ان کا کلام حفظ کر رکھا ہے، جناب قتیل شفائی کو تو ہماری کتنی نسلیں گا گا کر جوان ہوئی ہیں۔ جمہوریت کو معیار مانیں (جس کا منیر نیازی دلدادہ ہے) تو قتیل شفائی سے بڑا شاعر پاکستان میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہم جمہوریت یا جمہور کے اس فیصلے کو کیسے مسترد کر سکتے ہیں جو جناب ندیم قاسمی، قتیل شفائی، جناب احمد فراز، جناب افتخار عارف اور امجد اسلام امجد کو تو شاعر مانتا ہے۔ منیر نیازی کو نہیں مانتا؟ اس کا بہت ہی واضح مطلب یہ ہے کہ منیر نیازی ایک فاشسٹ سوچ اور فکر کا آدمی ہے، جمہوریت کی نفی کرنے والے کسی شخص کو کچھ اور مانا جا سکتا بھی نہیں۔

منیر نیازی کے فاشسٹ ہونے کی ایک سے زیادہ مثالیں اس کی ہرزہ سرائی سے اخذ کی جا سکتی ہیں، مثال کے طور پر اس نے کہا ہے کہ قتیل شفائی فراڈیا ہے اسے دریا برد کر دینا چاہیے چونکہ منیر نیازی کو جناب قتیل شفائی جیسی مقبولیت اور عزت نہیں مل سکی اس لئے ان کا دریا برد کیا جانا ہی منیر نیازی کی آتش حسد کا تقاضا ٹھہرا۔ امجد اسلام امجد کو اس نے اپنے "کوٹھے" کی ساتویں منزل سے نیچے پھینکنے کی بات کی ہے۔ وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ بہت چرب زبان انسان ہیں اور یہ کہ دولت کمانا ہی ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ منیر نیازی کی اس منطق سے کیسے اتفاق کیا جا سکتا ہے؟ امجد اسلام امجد اگر واقعی (جیسا کہ منیر نیازی نے کہا ہے) چرب زبان ہوتے تو انہوں نے رفع شر کیلئے تھوڑا سا مکھن منیر نیازی کو ضرور لگا دیا ہوتا۔ نہیں لگایا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو وہ چرب زبان نہیں ہیں یا وہ منیر نیازی کو اپنی چرب زبانی کا مستحق نہیں سمجھتے۔ اور یہ کوئی ایسا گناہ نہیں جس کیلئے انہیں منیر نیازی کے "کوٹھے" کی ساتویں منزل سے نیچے پھینک دیا جائے۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے کی بات ہے، جرمنی کے (فاشسٹ) ڈکٹیٹر ہٹلر نے ابھی آنکھیں ہی دکھانی شروع کی تھیں۔ برطانیہ کے وزیر اعظم چیمبرلین کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ہٹلر سے مل کر اس کی نیت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ برلن میں یہ ملاقات ہوئی تو ہٹلر نے یہ ثابت کرنے کیلئے کہ اس نے اپنی قوم کو کس قدر منقلب کر لیا ہے ایک شخص کو قریب بلایا اور حکم دیا کہ سامنے والی عمارت سے چھلانگ لگا دے، وہ شخص عمارت پر چڑھا اور چھلانگ لگا کر مر گیا۔ چیمبرلین لرز کر رہ گیا۔ اس عمارت کی سات منزلیں تھیں، منیر نیازی کے منہ سے امجد اسلام امجد کو ساتویں منزل سے نیچے گرانے کی بات اتفاقاً نہیں نکلی۔ ہٹلر کے پورے فاشسٹ شعور کے ساتھ نکلی ہے۔

جناب احمد فراز اور جناب افتخار عارف کے بارے میں منیر نیازی کا کہنا ہے کہ وہ نقال ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ وہ "نقال" ہوتے ہوئے تو شہرت کے ساتویں آسمان پر پہنچ گئے مگر منیر نیازی "اور جنل" ہونے کے باوجود کوٹھے کی ساتویں منزل سے اوپر نہیں اٹھ سکا اور وہ بھی بے چارے امجد کو نیچے گرانے کیلئے، مگر وہ جو کہتے ہیں کہ "نقل را عقل باید" درست ہی کہتے ہیں، منیر نیازی اگر عقل مند ہوتا تو فاشسٹ نہ بنتا ایک اچھا شاعر بن گیا ہوتا، اپنے بر خود غلط ہونے کے ثبوت پیش نہ کرتا، جناب ندیم قاسمی، جناب قتیل شفائی، جناب احمد فراز، جناب افتخار عارف اور جناب امجد اسلام امجد کی شاعری سے استفادہ کرتا اور اچھا شعر کہنے کی کوشش کرتا۔

◆ ◆ ◆

جب تک تم انسانی نسل میں پائی جانے والی حب الوطنی کو شکست نہیں دیتے، پُر سکون دنیا دریافت نہیں کر سکتے۔

(جارج برناڈ شا)

VIP INSURANCE AGENCY INC.
AUTO • HOME • LIFE • COMMERCIAL
* Restaurant * Heavy Trucks
* Bonds * Public Transportation
* Livery * Workers Compensation
SARDAR MOHAMMAD NASRULLAH
President L U T C F
Member N.A.L.U L.U.T.C Graduate
38-15 69th Street,
Wodside, NY 11377
Tel:(718)426-5149
Fax:(718)565-1481

علامہ بشیر حسین ناظم کیلئے 10 ہزار روپے انعام کی پیشکش

ناصر زیدی

ہمارے ایک بہت پڑھے لکھے کرم فرما، دوست مہربان جناب رئیس احمد اکثر ہمیں اپنے مکتوبات گرامی سے نوازتے رہتے ہیں۔ مدت گزری ایک دلچسپ خط حضرت علامہ بشیر حسین ناظم سے "میر انیس و اقبال" کے حوالے سے گفتگو پر مبنی انہوں نے بھجوایا تھا جو علالت کے سبب ہمارے کالم میں بروقت جگہ نہ پا سکا۔ چنانچہ اس خط کو وہ "القلم" کراچی میں لے گئے۔ وہاں اختصار سے ضمیر اختر نقوی صاحب نے خط بھی شائع کیا اور جواب بھی۔ خیال آیا کہ رئیس احمد صاحب نے اولیت تو ہمیں دی تھی ہماری کوتاہی کہ ہم ان کے زریں خیالات کو قارئین تک نہ پہنچا سکے۔ مختصراً یوں ہے کہ ممتاز نعت گو اور نعت خواں بشیر حسین ناظم نے رئیس احمد سے دوران گفتگو ارشاد فرمایا کہ "کوئی بڑے سے بڑا علامہ یا خدائے سخن استاد شاعر امام عالی مقام حضرت حسینؑ کی معرفت کی اس منزل کو نہیں پہنچا جس کا حامل علامہ اقبال کا یہ شعر ہے۔

درمیان امت آں کیواں جناب
ہمچو حرف قل ہو اللہ در کتاب

رئیس احمد نے کہا "بے شک علامہ اقبال معرفت اہل بیت کی ارفع و اعلیٰ منزل پر تھے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جن شعراء نے مدح اہل بیت میں عمریں گزار دیں وہ اس علم و فکر سے نا آشنا تھے۔ خدائے سخن میر انیس لکھنوی کہتے ہیں۔

دیکھا جو نور شمسہ کیواں جناب پر
کیا کیا ہنسی تھی صبح گل آفتاب پر

میر انیس کا یہ شعر سنا کر رئیس احمد نے کہا کہ "ناظم صاحب انیس کو اپنے عہد میں نہ صرف عظیم شاعر مانا جاتا تھا بلکہ ایک عالم بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔" اس پر بشیر حسین ناظم نے کہا "خیر شاعر ہونے پر کسی کو انکار نہیں مگر انیس کے عالم ہونے پر مجھے شک ہے۔" اس کے بعد وہ "کیواں جناب" کی بات چھوڑ کر "شمسہ" پر آ گئے اور کہا کہ جس طرح عابد سے عابدہ مونث بنا اسی طرح شمس سے شمسہ مونث ہے اور پھر اس نشست میں موجود ظفر اکبر آبادی کو مخاطب کر کے بولے "یہ دیکھئے انیس کی علمیت، امام عالی مقام کو "شمسہ" کہا ہے۔" ظفر اکبر آبادی کبھی ناظم صاحب کی طرف مثبت انداز میں دیکھتے اور کبھی میری طرف۔ بشیر حسین ناظم نے مزید فرمایا کہ دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ سے بڑی چوک یہ ہو گئی کہ جو لفظ عربی میں مذکر تھا اس کو مونث بنا دیا۔ مثلاً لفظ "کتاب" عربی میں مذکر ہے اردو میں مونث۔

بہر حال رئیس احمد صاحب کا موقف تھا کہ علامہ اقبالؒ نے جہاں انفرادی صلاحیت سے اچھی شاعری کی ہے وہاں انہوں نے اردو کے دیگر اساتذہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے میر انیس کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا کچھ عجب نہیں کہ "کیواں جناب" کی ترکیب اقبال نے انیس سے اکتساب کی ہو تو اس سے کونسی اقبال کی ہتک ہو جائے گی؟"

اس خط کے جواب میں علامہ ضمیر اختر نقوی نے اپنے جریدے "القلم" میں رئیس احمد صاحب کو لکھا کہ "آپ کی یہ بات بالکل وزن رکھتی ہے کہ اقبالؒ نے میر انیس سے خوشہ چینی کی ہے۔ پروفیسر وقار عظیم نے "ماہ نو" کے انیس نمبر میں اور راقم الحروف (ضمیر اختر نقوی) نے اپنے ایک مضمون (شائع کردہ دبستان انیس راولپنڈی) میں اس سلسلے میں گفتگو کی ہے اور گفتگو کی مزید گنجائش موجود ہے۔ "کیواں جناب" کی ترکیب اقبال نے میر انیس سے حاصل کی ہے۔ آگے چل کر انہوں نے کہا کہ

"بشیر ناظم صاحب کی اپنی علمی حیثیت کیا ہے؟ ادب میں ہر ایک کا فتویٰ قابل قبول نہیں ہوتا، ان کی مختصر گفتگو ہی سے ان کی کم علمی عیاں ہے۔ انہیں اس بات کا علم نہیں کہ عربی میں لفظ "شمس" مونث ہے وہ "شمسہ" کو مونث کہہ رہے ہیں۔ اب کیا اردو میں ناظم صاحب یہ بولیں گے کہ "شمس طلوع ہو رہی ہے" حالانکہ اردو نے شمس کو مذکر تسلیم کیا ہے۔ اس لئے اب اساتذہ کے قاعدے کے خلاف کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ بشیر ناظم صاحب ایک لفظ "کتاب" کا رونا رو رہے ہیں کہ عربی میں مذکر تھا اردو میں مونث بنا دیا۔ میں بہت سے لفظ لکھ رہا ہوں یہ تمام لفظ عربی میں مونث ہیں لیکن اردو میں مذکر ہیں۔ افعی، بحر، در، اجل، شمال، عصا، عقب، فلک، قدیم، ید، یمین، جنوب، حیف، سلام، عقاب، عقرب، فرس، موسیٰ، نفس!"

اب ہے کسی کی مجال کہ ان لفظوں کو اردو میں مونث استعمال کر کے دکھائے۔ بشیر ناظم صاحب نے کیا اردو کو کچی، تنگی زبان سمجھ رکھا ہے؟ اردو کے فیصلے بہت خوبصورت ہیں۔ میر انیس نے "شمسہ" کا لفظ ہر جگہ "عکس" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

سر جا ملا جو شمسہ کیواں جناب کا
سونا اتر گیا ورق آفتاب کا

علامہ ضمیر اختر نقوی نے مونث مذکر پر خاصی بحث کی ہے اور بہت مدلل مثالیں دی ہیں۔ میر انیس کے عالم ہونے پر بھی ثبوت دیئے ہیں اور بشیر ناظم صاحب سے پوچھا ہے کہ ان کے پاس "عالم" ہونے نہ ہونے کا کون سا پیمانہ ہے۔ جس سے ناپ کر وہ یہ بتا دیتے ہیں کہ فلاں شخص عالم ہے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

آمدم بر سر مطلب۔ اپنے طویل مدلل مکتوب کے آخر میں ضمیر اختر نقوی نے علامہ بشیر حسین ناظم کیلئے ایک پیشکش کی ہے کہ اس کالم کا مدعا یہی ہے کہ وہ پیشکش ان تک اور صاحبان علم تک پہنچ جائے۔ ضمیر اختر نقوی مدیر "القلم" کراچی کہتے ہیں۔

"چند شعر میں لکھ رہا ہوں بشیر ناظم صاحب اگر ان اشعار میں پوشیدہ نکات کی وضاحت کر دیں تو "القلم" کی طرف سے انہیں دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔ (اشعار ملاحظہ ہوں)۔

معشوق کے سوا کوئی پیش نظر نہیں
یہ شوق وصل ہے کہ کسی کو خبر نہیں

سکندر کی خاطر بھی ہے سد باب
جو دارا بھی ہو تو مدارا نہیں

ذروں سے اس کے اشرفی مہر زرد ہے
مٹی طلا ہے نسخہ اکسیر گرد ہے
کیوں کر کہیں کہ غنچہ تصویر درد ہے
یاں یاسمن بھی فرط خجالت سے زرد ہے
کس طرح منقسم ہو وہ جوہر جو فرد ہے
حیران خیال فلسفی ہرزہ گرد ہے

میزان عقل میں حکماء کے تلا نہیں
یہ وہ طلسم ہے جو کسی سے کھلا نہیں

کتنے ہی تشنہ رہتے ہیں حب علیؑ سے مست
کتنوں نے دل سے محو کیا وعدہ الست

دخل اس میں روم کا ہے نہ سلطان شام کا
دنیا کی سب زمیں پہ ہے قبضہ امامؑ کا

جب چاہو سیر عالم امکاں کی دیکھ جاؤ
تازی ہو روح پاؤ قدم میں وہ لطف پاؤ

فاقوں میں ہے حواس لڑائی میں مطمئن
کہتے تھے روز قتل بھی عید کا ہے دن

یوسف سا مہ لقا کوئی زیر فلک نہ تھا
پر کیا مزا جو حسن میں ان کے نمک نہ تھا

نرگس کہیں آنکھوں کو بھلا کیا اولوالابصار
وہ دیدہ بے نور ہے یہ مطلع انوار

ایسا نہیں کوئی جسے دل ریش نہ دیکھا
دنیا کے کسی نوش کو بے نیش نہ دیکھا

فرمایا الہ اے پسر عاقل و دانا
ہے ذات خدا قادر و قیوم و توانا

گہ تحت ثریٰ اوج ثریا پہ کبھی ہیں
یاں ہیں کبھی اور طارم اعلیٰ پہ کبھی ہیں

سر شرم سے جھکائے ہیں نرگس ریاض میں
جنت سوا میں یہ بیٹھا ریاض میں

صدمے سے ہوا رنگ رخ ماہ جو کافور
اختر بھی ہے مرد مک دیدہ بے نور

کھولا کبھی نہ پھول کی جس پر چھڑی پڑی
کھولی گرہ وہ تیغ نے جب گل جھڑی پڑی

ہے فرق پہ رسول کے تکمہ سحاب کا
دیکھوں قران ہوا زحل و آفتاب کا

علامہ ضمیر اختر نقوی کی طرف سے "شعر فہمی" پر انعام کی پیشکش ایک اور علامہ بشیر حسین ناظم کیلئے ہے۔ اب دیکھئے دونوں علامہ حضرات میں فیصلہ کن معرکہ کیا رنگ لاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ

صلح کر لو یگانہ غالب سے
تم بھی استاد وہ بھی اک استاد

◆ ◆ ◆

خیال کا سفر یا توارد؟

ناصر زیدی

کبھی کبھار اس کالم میں چربہ، چوری، سرقہ، توارد اور "خیال کا سفر" کے عنوان سے اشعار کا انتخاب صاحبانِ ذوق کیلئے کر دیتا ہوں۔ یہ سلسلہ توقع سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے اور کئی رسائل و جرائد اس کی نقل اپنے ہاں چھاپ لیتے ہیں اور اگلے کالم کیلئے بے تاب و منتظر رہتے ہیں۔

خیال خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ خدائے سخن میر انیس کے لفظوں میں "آبگینوں کو ٹھیس" نہ لگنے پائے مگر موضوع ایسا ہے، بقول غالب کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر

جتنی احتیاط کا یہ کالم متقاضی ہے اس سے کہیں زیادہ احتیاط میں لفظوں کے استعمال میں کرتا ہوں، پھر بھی اگر بعض حضرات چیں بجبیں ہوں اور نیت پر شک کریں تو کیا کیا جا سکتا ہے؟ آج کے کالم میں کچھ ایسے ہی ملتے جلتے اشعار جنہیں میں محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے "خیال کا سفر" ہی کہوں گا، قارئین کی ضیافتِ طبع کیلئے درج کر رہا ہوں۔ ملاحظہ ہوں ـ

حد یہ ہے کہ ہستی کی بنا تھی جن پر
ان سب کے مجھے نام بھی اب یاد نہیں
حضرت جوش ملیح آبادی

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے محو نام بھی اکثر کے ہو گئے
احمد فراز

مرے جوہر کھلیں گے خیر و شر جب ہوں گے صف آرا
مثالِ حر میں ابنِ سعد کے لشکر میں رہتا ہوں
خاور رضوی (مرحوم)

میں حر ہوں اور ابھی لشکرِ یزید میں ہوں
مرا حسین ابھی کربلا نہیں پہنچا
حسن نثار

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں
سیماب اکبر آبادی

دل کی پرکھ تو کیا ہوئی بزمِ جمال میں
کمھلا گیا یہ پھول یونہی دیکھ بھال میں
صبا اکبر آبادی

ایک پتھر ادھر آیا ہے تو اس سوچ میں ہوں
میری اس شہر میں کس کس سے شناسائی ہے
رضی اختر شوق

میں کیسے مان لوں تم کو شناسا
تمہارے ہاتھ میں پتھر کہاں ہے؟
حسن اجمل مسرت

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
فیض احمد فیض

کوئی چلنے نہ پائے سر اٹھا کر
یہاں دستور ہوتا جا رہا ہے
ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے دستانے
مصطفی زیدی

سوچوں تو مرے قتل میں شامل ہے ایک شہر
دیکھوں تو آستیں پہ کسی کے لہو نہیں
حسن اجمل حسرت

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
فیض احمد فیض

آج انساں سوچتا ہے یہ بھی کیا ہے زندگی
لگ رہے ہیں درد کے پیوند جس میں ہر گھڑی
سجاد مرزا

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس!
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

جون ایلیا

عجب طرح کے اذیت پسند ہیں ہم بھی
کہ مٹ گئے تو مسرت ملال بھی نہ ہوا

حسن اجمل حسرت

ہر چند میر بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

میر تقی میر

فراز سنگ ملامت سے زخم زخم سہی
ہمیں عزیز ہے خانہ خراب جیسا ہے

احمد فراز

کبھی کبھی تو ہونٹوں پر اک حرف صدا رہ جاتا ہے
بات مکمل ہو نہیں پاتی اور گلہ رہ جاتا ہے

اسلم راہی

کبھی کبھی تو دامن میں اک سنگ صدا رہ جاتا ہے
دینے والا کچھ نہیں دیتا ہاتھ بڑھا رہ جاتا ہے

طارق نعیم

دیواروں سے مل کر رونا اچھا لگتا ہے
ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے

قیصر الجعفری (بھارت)

دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے
ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے

(اقلیتی شاعر) نذیر قیصر، لاہور

چھوٹی پڑتی ہے انا کی چادر
پاؤں ڈھکتا ہوں تو سر کھلتا ہے

تابش دہلوی

چادر اوقات کی تنگی نہ پوچھ
پاؤں جب ہم نے پھیلایا سر کھلا

ڈاکٹر کلیم عاجز

سر بچاتا ہوں تو گر جاتی ہے سر سے دستار
اپنی دستار بچاتا ہوں تو سر جاتا ہے

اسلم راہی

کتنی مشکل ہوئی جاتی ہے حفاظت گھر کی
اس کی دیوار بچاتا ہوں تو در جاتا ہے

طارق نعیم

وطن کے لوگ ستاتے تھے جب وطن میں تھے
وطن کی یاد ستاتی ہے جب وطن میں نہیں

انجم ماہ پوری

وطن میں آنکھ چراتے تھے ہم سے اہل وطن
تڑپتے رہتے ہیں غربت میں ہم وطن کیلئے

وحشت کلکتوی

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ

کیا بتاؤں کہ تمہیں آج کہاں دیکھا ہے
ابھی کہہ دوں تو اسی بات پہ جھگڑا ہو جائے

مضطر گلاؤٹھوی

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

اسلم کولسری

خشک بچھونا دیکھ کے بیٹا بھول گیا
کتنی راتیں ماں گیلے میں سوئی تھی

اقبال سحر انبالوی

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

قلق لکھنوی

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

علامہ اقبال

اس اک نگاہ سے لٹتا ہے قافلہ دل کا
سو رہروان تمنا بھی ڈر کے دیکھتے رہیں

احمد فراز

◆ ◆ ◆

رباعی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مولانا ابو الکلام آزاد

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
مے خانے کا رنگ روپ بدلا ایسا
میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

پروین شاکر پر فلم

ج۔م

خبر آئی ہے لاہور کی کسی فلم ساز ٹیم نے معروف شاعرہ پروین شاکر مرحومہ پر فلم بنانے کا اعلان کیا ہے۔ پاکستان کی شعری اور ادبی برادری یقیناً اس خبر کا والہانہ خیر مقدم کرے گی، مرحومہ بڑی بلند پایہ شاعرہ تھیں، فہمیدہ ریاض کے بعد اردو شاعری کو عورت کے انسانی حوالے سے انہوں نے جو لہجہ اور جو معنوی حسن عطا ہے ناقابل فراموش ہے، ہم اسے اردو شاعری کا المیہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک حادثے میں اس دنیا سے بہت جلد اٹھ گئیں۔ زندہ رہتیں تو کون جانے اردو شاعری کو کتنی وسعتیں فراہم کرتیں۔

بڑے ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں پر ہمارے ہاں فلمیں بنانے کا کوئی رواج نہیں، جنہیں جیتے جی کوئی منہ نہ لگاتا ہو مرنے کے بعد انہیں کون یاد رکھتا ہے، پروین شاکر اس اعتبار سے بڑے نصیبوں والی تھیں کہ ان کی وفات کے بعد ان کے نام پر بنائے گئے کسی فاؤنڈیشن نے ادبی ایوارڈ کا اعلان بھی کر رکھا ہے اور اب ان کی زندگی اور دردناک موت پر فلم بھی بنائی جا رہی ہے۔ اس لحاظ سے تو وہ خوش نصیب تھیں ہی کہ ان کی زندگی میں ان کی شاعری کے جتنے مجموعے شائع ہوئے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئے اور کئی کئی ایڈیشن چھپے، نظم و غزل کے بہت ہی بلند و بالا شاعر مجید امجد کو مرحوم ہوئے لگ بھگ تیس سال ہو گئے ہیں، ابھی تک ان کے پہلے مجموعے شب رفتہ کا پہلا ایڈیشن ختم نہیں ہوا، یقین نہیں آتا، ان کی زندگی اور موت کی تفصیلات سے آگاہ حضرات بہتر جانتے ہیں کہ وہ اردو ادب کا کتنا بڑا المیہ تھے۔ کاش ان پر بھی فلم بنائی جا سکتی، شکیب جلالی مرحوم بھی ایک دردناک فلم کا مکمل سکرپٹ تھے۔ اپنی موت کے بارے میں انہوں نے جیسی پیش گوئی کی تھی ویسی ہی موت پائی تھی۔ انہوں نے چلتی ٹرین کے سامنے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی اور ان کے خون کے چھینٹوں سے ایک قریبی دیوار سرخ ہو گئی تھی۔ سارہ شگفتہ بھی ایک شاعرہ تھی، وہ اپنے نثری جملوں میں ایسی ایسی بات کہہ دیتی تھی جو پروین شاکر سمیت کسی خاتون شاعرہ کے اشعار میں تلاش نہیں کی جا سکتی۔ امرتا پریتم کو بہت پیاری تھی، وہ مشرقی پنجاب گئی تھی امرتا پریتم سے ملنے کیلئے انہوں نے مرحومہ کو سنا، دیکھا اور سمجھا تو سینے سے لگا لیا، بے پناہ محبت دی، سارہ کا پہلا مجموعہ بھارت ہی میں شائع ہوا تھا، اسے بڑے دکھ لاحق تھے، وہ ماں تھی مگر اس کے بچے اس سے چھین لئے گئے تھے، بڑی لمبی بڑی روح فرسا اور دلدوز کہانی ہے۔ اس کی، اس نے کراچی میں تیز رفتار ٹرین کے سامنے اپنے آپ کو ڈال دیا تھا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی، کسی فلمساز کو اس کی زندگی پر فلم بنانے کا خیال نہیں آیا، گوہر سلطانہ عظمیٰ بھی اسی جیسی ایک شاعرہ تھی، نثری جملے لکھتی تھی، افسانے لکھتی تھی، اندر کی باتیں کیا کرتی تھی، بہت قابل اور پڑھی لکھی خاتون تھی اور بہت ہی خراب بات یہ کہ وہ اپنے آپ کو مرد کے برابر انسان سمجھتی تھی اور اپنے اس حق کیلئے لڑتی جھگڑتی بھی تھی اور اپنی ہم وطنوں کیلئے سزا کی مستحق بھی سمجھی جاتی تھی، اسے بھی وہی سزا دی گئی تھی جو سارہ شگفتہ کیلئے لکھی گئی تھی یعنی اس کے بچے اس سے چھین لئے گئے تھے۔ وہ کئی سال اپنے بچوں کیلئے تڑپتی رہی مگر اسے انصاف نہ مل سکا۔ پھر ایک دن اس نے یہاں کسی کو فون کیا، کہا مجھے امریکہ بلا لیں، پلیز کچھ کریں، ویزہ مل جائے مجھے اور میں وہاں آ جاؤں ــــ بہت سی باتیں بہت سے دکھ بیان کئے اس نے ــــ اور پھر چند روز بعد خبر آئی اسے اگلے جہان کا ویزہ جاری کر دیا گیا۔ اسے لاہور سے باہر کسی بستی میں کسی کوٹھی میں لئے ہوئے اپنے کرائے کے کمرے میں قتل کر دیا گیا، قتل کا الزام کوٹھی کے مالک کے نوخیز بیٹے پر لگا، کیس رجسٹرڈ ہوا، مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی اور ملزم کے وکیل نے مرحومہ کی کردار کشی کی ایسی مہم شروع کر دی جو کسی باعزت خاندان کی برداشت سے باہر تھی، اس کی دکھی ماں وہ غلاظت برداشت نہ کر سکی، بیٹی مر چکی تھی، یہی دکھ کافی سمجھا گیا، ملزم کے خلاف دائر کیا ہوا کیس واپس لے لیا گیا۔ ملزم کو بری کر دیا گیا۔ یہ کہانی بھی تو ایک فلم کیلئے پسند کی جا سکتی ہے؟

اقبال ساجد بھی ایک شاعر تھے، بہت اعلیٰ مگر بہت ہی گستاخ شاعر، بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا، اس میں بڑی خود اعتمادی تھی، شعری خود اعتمادی، اس کی لاابالی طبیعت سے پیار کرنے والے دکھی ہو جاتے تھے اس کی حالت دیکھ کر، وہ بہت پیتا تھا اور کام دھندہ کوئی نہ کرتا تھا، کوئی اندر کا دکھ ہی ہو گا جو کسی سے کریدا نہ جا سکا، کسی سے سمجھا نہ جا سکا ورنہ کون سی بیماری ہے جس کا علاج نہیں ــــ دس دس بیس بیس روپے میں غزلیں بیچ کر گزر اوقات کیا کرتا تھا، اپنی شاعری پیتا تھا، اپنی شاعری کھاتا تھا، سو وہ بھی ایک روز مر گیا۔ چلتی پھرتی فلم تھا۔ ذہانت کے دکھوں پر مبنی عبرت آموز فلم۔ مگر پاکستان کے فلمستان شہر لاہور میں کسی کو بھی ذہانت کی موت پر فلم بنانے کا خیال نہیں آیا۔ یاد آیا ستار طاہر بھی ایک بلند پایہ ادیب اور محقق تھا ــــ۔

"زندہ بھٹو مردہ بھٹو" کا مصنف، وہ ادیب جس نے پاکستان کے بدترین دور آمریت میں لوگوں کو زندگی اور موت کا بہت ہی ولولہ انگیز شعور عطا تھا، کہتے ہیں لاہور میں اس جیسا پڑھا لکھا آدمی اس کے جیتے جی بھی نہ تھا اور اس کے مر جانے کے بعد بھی کسی نے اس کی جگہ نہیں لی۔

وہ دنیا بھر کے عصری ادب اور عصری فلسفوں سے آگاہ تھا، بڑے بڑے محققین کی چوریاں پکڑ لیتا تھا، منہ پر کہہ دیتا تھا کس نے جرمنی کے کس ادیب کو ٹانکا لگایا ہے، کس نے فرانس کے کس محقق کی گردن کاٹی ہے، وہ اپنی ساری کمائی کتابوں پر خرچ کر دیا کرتا تھا، بیوی بچوں کی روٹی اپنی علمی کیلئے تشنگی پر خرچ کر دیا کرتا تھا، مگر پتہ چلا وہ تو اپنے آپ کو بہت ہی بے دردی سے خرچ کر رہا ہے، لوگ جانتے تھے وہ تیزی سے خرچ ہو رہا ہے مگر کوئی روکنے والا نہ تھا سو وہ چپ چاپ خرچ ہو گیا۔ اپنے سارے علم و فضل سمیت مٹی میں مٹی ہو گیا، نہ کوئی ڈرامہ لکھا گیا نہ کسی نے فلم بنائی۔ اور تو اور کسی نے ساغر صدیقی کو بھی توجہ کے قابل نہ

سمجھا جس نے درگاہوں کے راستوں پر گندگی کے ڈھیروں پر منتوں چڑھی پھونک ڈالی۔ شاعر تھا مر گیا، شاعروں کو بھی مرنا ہوتا ہے، بنائی جاتی تو ایک اچھی فلم اس پر بھی بنائی جا سکتی تھی، کراچی کے جمال احسانی کا ذکر نہ کیا جائے تو لوگ انگلیاں اٹھائیں گے، ٹھیک ہے کراچی کو فلمی صنعت میں بڑا مقام نہ مل سکا مگر کراچی میں فلمی ٹیلنٹ کی فراوانی سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا، کسی کو شک ہو تو امر محبوب کے افسانے پڑھ لے، دیکھ لے اس نے کتنے سکرپٹ لکھ رکھے ہیں، جمال احسانی بھی ایک سکرپٹ ہی تھا، خوبصورت شاعر تھا، ہمیں فروغ جیسا خوبصورت شاعر جو ہمیں فروغ ہی کی طرح جوانی میں مر گیا، پوچھتے پاچھتے مر گیا کہ امریکہ میں کسی مشاعرے کا دعوت نامہ حاصل کرنے کیلئے "لابی" کا طریقہ کیا ہے؟

کچھ نہیں کہہ سکتے کتنے ہی اعلیٰ فلمی سکرپٹ قبروں میں دفنائے جا چکے ہوں گے، کتنے ہی تسلیم نہ کئے جا سکنے والے کردار مٹی میں مل چکے ہوں گے، ہم نہیں جانتے ان کا باطن کیا تھا، ہم تو اکثر کے ظاہر سے بھی آگاہ نہیں ہیں، مگر خوشی کی بات ہے کسی نے پروین شاکر کی زندگی پر فلم بنانے کا اعلان کر دیا ہے۔ ہم ان کی زندگی کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں، ان کے اشعار سے جو کچھ اخذ کیا جا سکتا ہے اس میں اداسی کا محرومی کا دکھ فراواں ہے، اس فلم سے ان کو پورا سمجھنے میں مدد ملے گی، ان کا باطن شاید پھر بھی پوری طرح سمجھ میں نہ آ سکے۔ دعا کرنی چاہیے کہ مرحومہ کے ساتھ انصاف کیا جائے، کوئی بے رحم سی بے انصافی ان کے کھاتے میں نہ ڈال دی جائے کیونکہ وہ اب اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکیں۔

پروین شاکر کی زندگی پر بنائی جانے والی مجوزہ فلم نہ صرف عورت کے انسانی جذبے کی تشہیر میں مدد دے گی۔ ان شاعرات کو اپنا قد و قامت دیکھنے اور جانچنے میں بھی مدد ملے گی، جنہوں نے پروین شاکر بن جانے کے شوق کے باوجود کبھی پروین شاکر کے ان دکھوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جو ان کی شاعری پر چھائے رہے ہیں، غلام محمد قاصر مرحوم کہتے تھے پروین شاکر ایک عرصے سے اپنی موت کی پیشگوئیاں کر رہی تھی، جیسے اسے اپنے بہت جلد مر جانے کی بشارت ہو چکی تھی۔

امید کی جانی چاہیے کہ پروین شاکر کے فلمساز پروین شاکر کا کردار ادا کرنے والی جس اداکارہ کا انتخاب کریں وہ پڑھی لکھی ہو، اس تاکید یا امید کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ مرحومہ اپنی روزمرہ گفتگو میں انگریزی زیادہ استعمال کرتی تھیں۔ یعنی شاعری تو وہ صاف شفاف اردو میں کرتی تھیں اور بات چیت انگریزی میں، وہ پاکستان کی ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی تھیں، محکمہ کسٹمز میں بڑے اعلیٰ عہدے پر فائز تھیں اور آپ جانتے ہیں ہمارے ہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد اردو میں یا اپنی مادری زبان میں کم ہی بات کرتے ہیں، عجیب لگے گا اگر فلم میں مرحومہ کو اردو میں بات چیت کرتے دکھایا گیا۔ بہر حال یہ معاملات فلمسازوں کی صوابدید پر ہیں، ہم کون ہوتے ہیں کسی کو مشورہ دینے والے، اس لاہور میں بنائی گئی فلم مرزا غالب کا خیال آ گیا تھا جس میں لالہ سدھیر مرحوم سے مرزا نوشہ کا کردار ادا کروایا گیا تھا، پتہ نہیں فلمسازوں نے غالب سے انتقام لیا تھا یا لالہ سدھیر سے۔ وہ تو اچھا ہوا غالب اپنے بارے میں بنائی جانے والی فلم دیکھنے کیلئے اس دنیا میں موجود نہ تھے ورنہ چپ چاپ رودی میں غرق ہو گئے ہوتے.....!

◆ ◆ ◆

COMMERCIAL MORTGAGE & LOAN
SAUD HUMAYUN KHOKHAR
INTERNATIONAL BUSINESS SERVICES USA COMPANY
- Www.intl-business.com
- Mallroad.com
- The dot com shopping sm
- Mallrosdauction.com
- Visit our auction and saur mond

2075 86th Street
Brooklyn, NY 1121
Tel:(718)265-137
Fax:(718)265-137

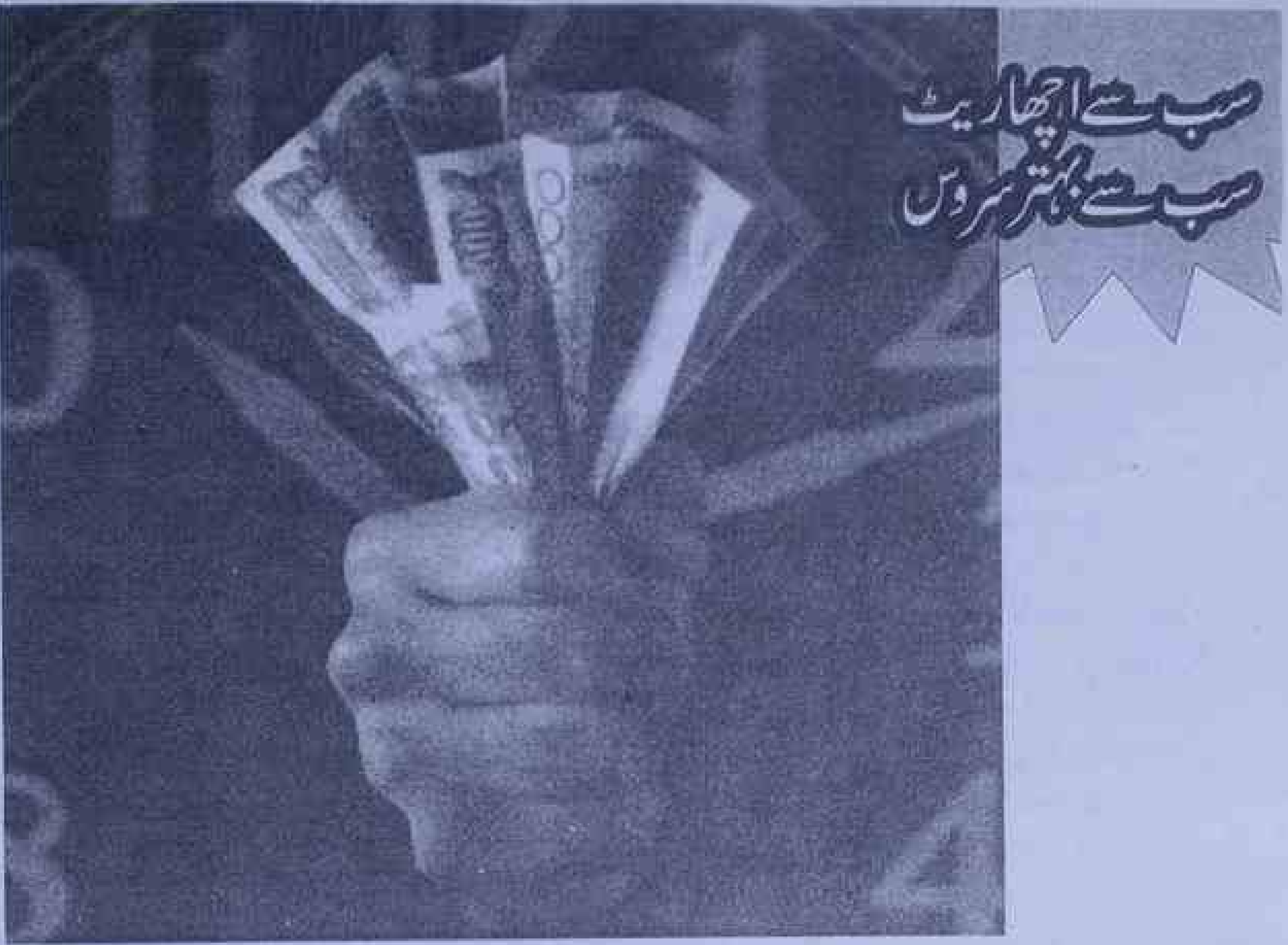

ON TIME
MONEY TRANSFER

اعتماد ضمانت اور دیانت کے اصولوں پر

ہم وطنوں کے لئے ایک اور خدمت آپکی رقم کی پاکستان فوری ترسیل

وٹامن ہومیو پیتھی سینٹر کے بروکلین آفس اور کوئنز آفس میں رقم آپ جمع کرائیں اور کم سے کم وقت میں پاکستان آپکے عزیزوں تک ہم پہنچائیں گے

یہ ہے آپکا اعتماد ہماری دیانت اور ضمانت

رابطہ کے لئے: رانا رشید اور محمد صابر

وٹامن ہومیو پیتھی سینٹر کے
ہومیو ڈاکٹر افتخار چوہدری

Ph: 718-941-1400
Fax: 718-941-1093
Out of New York
800-388-0969

Queens: 72-15 35th AVE JACKSON HEIGHTS, NY 11372
Brooklyn: 1017 Cortelyou Road,
Brooklyn, NY 11218

کتابیات

ماہنامہ

"نیویارک میرے آگے" پر ایک نظر

پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق

سید حیدر علی جو ایک عرصے سے امریکہ میں مقیم ہیں اور "سرکی کورٹ" کے عنوان سے نیویارک سے شائع ہونے والے اردو ہفتے "پاکستان ایکسپریس" میں کالم لکھتے رہے ہیں اور فی الحال "عوامی عدالت" کے عنوان سے ہفت روزہ "عوام" میں اپنا کالم تحریر کرتے ہیں۔ اب ان کالموں کا مجموعہ "نیویارک میرے آگے" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ سید حیدر علی وطن سے محبت کرنے والے، چوکس ذہن کے مالک، گرد و پیش سے باخبر اور شگفتہ طبیعت رکھتے ہیں۔ فردی حیثیت سے وہ ملنسار، بشاش اور خوش مزاج ہیں۔ ان کے دوستوں کا حلقہ وسیع ہے اور ان کا حسن اخلاق اس حلقے کو وسیع تر کرتا جا رہا ہے۔ اردو کی ترقی و فروغ کیلئے وہ سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ان کے قلم میں روانی ہے۔ ان کی تحریروں کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن شخصی طور پر ان کے خلوص اور عمل کی سطح پر ان کے فعال و مستعد ہونے سے انکار ممکن نہیں۔ ان کی شخصیت اور ان کی سوچ کی جھلک زیر نظر تحریروں میں ملتی ہے جو خود اپنی خصوصیات رکھتی ہیں۔

پہلی اور بڑی بات یہ ہے کہ امریکہ میں مقیم ہوتے ہوئے بھی جہاں مصروفیت اور دلچسپی کے ہزاروں سامان ہیں وہاں انہوں نے نہ صرف اپنی زبان اور تہذیب سے اپنے دلی تعلق کو قائم و برقرار رکھا ہے بلکہ اس قلبی لگاؤ کا عملی ثبوت ان کی تحریریں ہیں۔ غیر ملک میں رہتے ہوئے ایک نقصان یہ ضرور ہوتا ہے کہ زبان اور تہذیب کے مرکزی دھارے سے دوری ہو جاتی ہے۔ لیکن سید حیدر علی نے زبان اور تہذیب کے مرکزی دھارے سے تعلق قائم رکھنے کی کوشش کی ہے اور قومی اقدار سے بے اعتنائی نہیں برتی ہے۔ البتہ اس دوری کا فائدہ یہ ہے کہ اظہار کی نئی راہیں بھی کھل جاتی ہیں اور حالات و واقعات کو نئے زاویوں سے دیکھنے کا انداز آتا ہے۔ سید حیدر علی نے اس اظہار کی وسعت کا اظہار بھی کیا ہے اور حالات و واقعات کو نئے زاویوں سے پرکھنے کا انداز ہمیں ان کی تحریروں میں بدرجہ احسن ملتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اپنی زبان و تہذیب کے ساتھ ساتھ سید حیدر علی نے اپنے ملک اور اپنے ملکی مسائل کو فراموش نہیں کیا ہے۔ یوں کہیے کہ منظر کہیں ہو، لیکن سید حیدر علی نے "آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں" کے مصداق پس منظر اپنے ملک اور اپنے ملک میں رونما ہونے والی صورتحال ہی سے فراہم کیا ہے۔ صحافت کے رشتے سے ان کی نظر روزمرہ کے واقعات پر بھی رہی ہے لیکن وہ ان واقعات سے گزر کر ہمارے قومی خصائل کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور کہی جانے والی بات کہہ دینے کی استقامت و جرأت بھی ان میں موجود ہے۔ ان کی تحریریں اردگرد کا ماحول اور حالات حاضرہ کا جائزہ لیتی ہیں۔ مرکوز بالذات نہیں، وہ فرد اور ماحول کے رشتوں کو بہتر بنانا چاہتے ہیں اور اغراض ذات سے بالاتر ہو کر سماجی بہتری کی خواہش رکھتے ہیں۔

تیسری اور بہت اہم خوبی جو سید حیدر علی کی تحریروں میں نظر آتی ہے وہ یہ کہ معاشرے کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے انسانی اکائی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ان کی تحریریں معاشرے اور انسانوں کے تعلق کو پیش کرتی ہیں۔ اس تعلق کو وہ بار بار کے دہرائے ہوئے اور مستعار لئے ہوئے جملوں میں نہیں، اپنی ہی سوچ کی روشنی میں رقم کرتے ہیں۔ انسان ان کے نزدیک حیرت انگیز مخلوق ہے اور اس کے اعمال کی نیرنگی بھی حیرت خیز خصوصیات رکھتی ہے۔ جہاں وہ معاشرے کی خصوصیتوں کو سمجھتے ہیں۔ وہاں انسانی فطرت کی بوقلمونی اور رنگا رنگی بھی ان سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ پھر ان کا انسانی اعمال کو معاشرتی پس منظر سے منسلک کر کے دیکھنے کا وصف ان کی تحریروں کو زیادہ قابل قبول بنا دیتا ہے۔

سید حیدر علی کی تحریروں میں لائق مطالعہ ہونے کا جو انداز ملتا ہے اس میں ان کی حس مزاح نے اضافہ کر دیا ہے۔ ان کی تحریروں میں کہیں مزاح اور کہیں طنز کے جو شگوفے پھوٹتے ہیں وہ ان کی تحریروں کو جاذبیت اور دلکشی عطا کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات سے الگ ہو کر حالات کا مشاہدہ کرنے کی جو خصوصیت رکھتے ہیں اس سے ان کی تحریروں میں طنزیہ مزاح کی چاشنی بھی آئی ہے اور معاشرتی تنقید بھی۔ اس معاشرتی تنقید میں دردمندی کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ ہوریس والی پول (Horace Walope) نے کیا خوب کہا تھا کہ "دنیا ان کیلئے جو سوچتے ہیں کامیڈی ہے اور ان کیلئے جو محسوس کرتے ہیں ٹریجیڈی"۔ سید حیدر علی کی تحریروں میں بعض مقامات پر سوچنے اور محسوس کرنے کا امتزاج ملتا ہے اور یہاں ان کی تحریروں کا ادبی وصف نمایاں ہو جاتا ہے۔

سید حیدر علی کی بعض تحریروں میں نئی صورت حال اور یادیں مل کر ایک تاثراتی نقش قائم کرتی ہیں۔ اسٹیفن اسپنڈر (Stephen Spender) نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا کہ "آنکھ غزال، ذکی الحس رو نورد، افق کے سیال خط کی نوشندہ" چنانچہ سید حیدر علی کی آنکھ بھی جو کچھ دیکھتی ہے اس میں موج خیال کا اضافہ کرتی اور ایک سلسلہ شبیہ خیال تعمیر کرتی ہے۔ ان کی خیال آفرینی موجود اور گذشتہ ماحول کے سیال خطوں کے امتزاج سے نئی ترتیب پیدا کرتی ہے۔ اسی لئے مثال کے طور پر ان کی بیٹی یاسمین کیلئے اجنبی ملک میں خریدا ہوا چڑیوں کا جوڑا بھوک ہڑتال کرتا اور پھر برصغیر کے کسی فلم کی موسیقی کی دھن پر رقص کرتا ہے۔ لیکن یادوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ خود اپنے وطن کے ماحول کے نقوش تازہ کرتا اور اس فیصلے پر ختم ہوتا ہے کہ "یاسمین پارک میں اس وقت تک باقی رہے گی جب تک درجہ حرارت 40 ڈگری فارن ہائیٹ سے کم نہ ہو۔"

سید حیدر علی نے ابراہیم جلیس کا ذکر کیا ہے جن کی تحریر اور ایک مختصر عرصہ کیلئے ان کی رہنمائی نے خود ان کے قول کے مطابق زندگی میں بہت دور رس اثرات چھوڑے ہیں "اس اثر کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ سید حیدر علی بھی اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ ہم

مستقبل میں ایک معاشرہ اپنا تشکیل دینے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے جس میں ذات پات، صوبہ و زبان کا تقابل نہیں ہو گا"۔

کتابوں کی تقریبات رونمائی نیویارک میں بھی منعقد ہوتی ہے اور کراچی میں بھی۔ جہاں تک اردو زبان و ادب کا تعلق ہے شاید دونوں جگہ بے حسی کا رویہ عام ہے۔ سید حیدر علی بڑی دردمندی سے کہتے ہیں کہ "صرف زبانی جمع خرچ سے کوئی اپنی تہذیب یا زبان کو فروغ نہیں دے سکتا۔" وہ اس نتیجے پر بھی پہنچے ہیں کہ "جو نوجوان اپنی قومی زبان پر عبور حاصل نہیں کر سکتا، وہ نہ ہی کسی اور زبان اور نہ ہی کسی اور شعبہ میں خاطر خواہ صلاحیت یا کامیابی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔"

سید حیدر علی نے امریکہ میں بھی پاکستانیوں کی ہنگامہ پسندی کا ذکر کرتے ہوئے طنز کا تیر چلایا ہے کہ امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے کو مشرق وسطیٰ سے فوری طور پر بلا کر کونی آئیلینڈ میں لنگر انداز کیا جائے" تاکہ پاکستانیوں کی پریڈ یا میلے میں ہونے والے ہنگامے یا کسی نازک صورت حال کے موقع پر فوری کارروائی کی جا سکے۔" مگر سید حیدر علی ان لکھنے والوں میں سے نہیں جنہیں ساری خرابیاں اپنی قوم میں اور ساری خوبیاں دوسری اقوام میں نظر آتی ہوں۔ وہ یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ اس سال انتہا پسند سفید فاموں کی تنظیموں نے "گذشتہ تین ماہ کے مختصر عرصے میں سیاہ فام لوگوں کے 46 کلیساؤں کو نذر آتش کر کے مکمل خاکستر کر دیا۔"

سید حیدر علی نے سیاسی سماجی برائیوں پر بھی اپنے افسانہ ساز اور خیال آرا انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ لیکن ان کی مثبت سوچ ان سے یہ بھی کہلواتی ہے کہ آپ کو فخر کرنا چاہیے کہ آپ مزدور ہیں، عمائدین شہر نہیں۔ "دربار اور امام ضامن میں بھی وہ اپنے ملک کے المیے پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ کہلواتے ہیں کہ "میں دنیا کے جس حصے سے آیا ہوں وہاں آج بھی صرف دولت کو خدا تسلیم کیا جاتا ہے۔"

ان کی نظر تنقید جہاں برائیوں کا جائزہ لیتی ہے وہاں امریکہ کی زندگی کے مثبت رخوں کو نظر انداز نہیں کرتی۔ وہ کہتے ہیں کہ کون انہیں منع کرتا ہے "دودھ کی بجائے وہ پانی ہی فروخت کیا کریں لیکن یہ یاد رکھیں کہ یہ پاکستان نہیں امریکہ ہے۔" البتہ انہوں نے اس دوسری تہذیب کے سامراجی رخ، ویت نام، خلیجی جنگ اور قوموں کی جدوجہد آزادی کی مخالفت کو پیش کر کے توازن برقرار رکھا ہے۔

سید حیدر علی کے بعض جملے کہیں ایک تماچے کی حیثیت رکھتے ہیں اور کہیں ان سے ذہنی انبساط کا سامان ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارے اس کرہ ارض پر بے شمار ایسے افراد بھی ہیں جو بوب اور ڈولی کی طرح فش ٹینک میں مقید ہیں۔ "اگر اولمپکس میں رشوت خوری کا مقابلہ ہو تو اس میں پاکستانی طلائی تمغہ ضرور حاصل کرے گا۔ جب ایک اخباری نمائندہ نے ان سے پوچھا کہ محترم آپ نے کونسی مچھلی پکڑی تھی انہوں نے جواب دیا کہ پلیز ہمارے سیکرٹری سے دریافت کر لیجئے۔" "رہتے پاکستان میں ہو اور پوچھتے ہو دنیا کا صدر کون ہے۔ بے غیرت!" "بچپن میں امی پڑھنے لکھنے سے بھاگنے پر مارا کرتی تھیں اور ڈیڈی جب بھی مجھے لکھتے یا پڑھتے دیکھ لیتے ہیں تو ان کا پارہ آسمان پر چڑھ جاتا ہے۔ چوہدری صاحب کا بروکلین میں گروسری اسٹور ہے جہاں اشیائے صرف پاکستانی شلوار قمیض حتیٰ کہ گرین کارڈ اور سوشل سیکورٹی کارڈ بھی فروخت ہوتا ہے"۔ "یہ اپنے پاکستان کے صنعت کاروں کے ہنر کا کمال ہے کہ ہنوز وہ تیار شدہ اشیاء میں اس کی اصلیت کا عنصر رکھتے ہیں۔ اسی لئے وہاں کے بنے ہوئے ٹیلی ویژن سیٹ میں پلاسٹک، ملبوسات میں کپاس، دودھ میں پانی حتیٰ کہ پانی میں مٹی کی خوشبو رچی بسی رہتی ہے۔

سید حیدر علی ایک طویل زمانے سے اجنبی ملک میں آباد ہیں۔ زبان کی سرحدوں میں یوں بھی توسیع ہو رہی ہے اور گنگا کے پانی سے دھلی ہوئی زبان کا تصور اب بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اب اس میں متعدد دریاؤں، سمندروں کے پانی بلکہ سمندر پار کی ہواؤں کا ذائقہ بھی شامل ہوتا جا رہا ہے۔ سید حیدر علی نے بھی اس توسیع میں حصہ لیا ہے۔ مثلاً چھوڑنا بمعنی بے اصل باتیں کرنا، شیخی بگھارنا وہ مختلف ان مقامات پر استعمال کرتے رہے ہیں جہاں قریب المعنی لفظ "ہانکنا" مروجہ اردو میں بولا جاتا رہا ہے۔ یہ زبان میں ترقی اور اضافے کی ایک صورت ہے لیکن بعض مقامات ایسے ہیں جو زبان کی جانب زیادہ احتیاط کا تقاضا کرتے ہیں۔ اردو کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس کا عالمی معیار بنانے میں بھی اردو کے شیدائیوں کو حصہ لینا ہے۔ زبان کی وسعت کی افادیت کو قبول کرتے ہوئے بھی معیار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سید حیدر علی اور امریکہ، برطانیہ، خلیجی ممالک افریقہ کے بعض حصوں، کناڈا میں اردو لکھنے والوں کو اردو زبان، صحافت اور ادب کی نئی تاریخ بنانے کا موقع ملا ہے جو برصغیر کی زبان و ادب کی تاریخ کی طرح ایک حوالہ بن جائے گی۔ برطانیہ اور بعض دوسرے ممالک میں جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ امید ہے کہ جب امریکہ میں اس نئے حوالے کا جائزہ لیا جائے گا تو سید حیدر علی اور "نیویارک میرے آگے" کو فراموش نہیں کیا جائے گا۔

◆

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

یاس یگانہ چنگیزی

اردو شاعری کی عظیم، قد آور اور
متنازعہ شخصیت کے "جرم و سزا" پر
ماہنامہ زاویہ
کی خصوصی اشاعت بہت جلد پیش کی جارہی ہے

اردو رپورتاژ کی ایک تاریخ

پروفیسر اشرف بخاری

سچ پوچھیے تو پروفیسر ظہور احمد اعوان نے رپورتاژ نگاری کی تاریخ لکھ کر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے وہ اب کے ایک ایسی صنف ادب پر قلم اٹھا بیٹھے ہیں جس کا کوئی اور چھور نہیں۔ "نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم" جس کی اب تک کوئی منطقی تعریف متعین نہیں ہو سکی جس کے موضوعات کے تنوع اور بے اندازہ وسعت کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اس کا دائرہ کار بلا دائرہ و اقلیم ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہے اور پھر ہمیں اس یتیم صنف پر رحم بھی آنے لگتا ہے کہ اب تک اس کا شجرہ نسب ہی تحقیق نہ ہو سکا اور نہ یہ کہ یہ کس جنس سے تعلق رکھتی ہے۔ چند روز ہوئے اردو کے ایک بزرگ شاعر اور ادیب کے بارے میں کسی نے بتایا کہ وہ نثر نظم کو "مجہول صنف سخن" کہا کرتے ہیں۔ ہم رپورتاژ کے بارے میں اس حد تک تو شاید نہ جا سکیں لیکن پھر بھی اتنا کہہ سکتے ہیں کہ "عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ" "معشوق کی کمر کی طرح کوئی خوردبین اس کی ہستی کا سراغ دے سکے تو دے سکے ورنہ "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے" غور فرمائیے جس صنف ادب کے ڈانڈے بیک وقت خاکہ نگاری، صحافت، افسانہ، تاریخ، آپ بیتی، سفرنامہ، مکتوب نویسی، جلسوں جلوسوں اور میلوں ٹھیلوں کی رپورٹنگ، احوال زنداں، بیاہ شادیوں، ادبی انجمنوں کی روداد، تفریح و سیاحت، مہم جوئی، علمی و تعلیمی سفر، حج و زیارت مقدسہ، تراجم، فسانہ عجائب، شملہ کانفرنس اور سیمینار پاکستان سے جا ملتے ہوں تو وہ صنف ادب کہاں رہ گئی وہ تو مجہول صنف بلا ہو گئی تو اردو کے اسی چٹیل یا بکھرے اور جھاڑ جھنکاڑ کی تاریخ ظہور احمد اعوان نے لکھی ہے اور ایمان کی بات ہے کہ خوب لکھی ہے اور بھرپور لکھی ہے۔ متضاد آرا اور مبہم تعریفات سے اس جنگل سے گزرنا اتنا آسان نہ تھا لیکن وہ آسانی اور سلامتی سے گزر گئے۔ اعوان صاحب نے اس کتاب کے مواد کی فراہمی میں کیا کیا پاپڑ بیلے، کن کن کونوں کھدروں کو چھانا کیسے کیسے اور کن کن ہولناک مقامات سے گزرے یہ صرف وہی شخص جانتا ہے جسے تحقیق و تفتیش کی کٹھنائیوں سے پالا پڑا ہو۔

جس بیابان خطرناک سے ہے اپنا گزر
مصحفی قافلے اس راہ سے کم گزرے ہیں

اس تالیف میں اعوان صاحب نے بڑے استقلال مزاج سے کام لیا ہے جانفشانی اور محنت کا حق ادا کر دیا ہے۔ صرف ایک نظر کتابیات والے حصے پر ڈال لیجیے آپ کو اندازہ ہو جائے گا تصنیف و تالیف کا عشق کیا ہوتا ہے۔

دیباچے میں اعوان صاحب نے رپورتاژ کی جن دو تاریخوں کا ذکر کیا ہے ان میں ایک پروفیسر عبدالعزیز کی مختصر سی تاریخ اور دوسری کسی ریسرچ سکالر طلعت گل کا ایک غیر مطبوعہ مقالہ ہے جس میں رپورتاژ کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ہماری نظر سے نہیں گزریں لیکن ان کے شمولات سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مؤلفین نے بہت خست آمیز انتخاب سے کام لیا ہے یا پھر یہ کہ اردو رپورتاژوں کی ایک بڑی تعداد تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ چاہے کچھ بھی ہو یہ ان تاریخوں کا ایک ایسا نقص ہے جس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ ان کے مقابلے میں اعوان صاحب کی تاریخ زیادہ جامع، زیادہ مکمل اور زیادہ بھرپور ہے جس میں رپورتاژ کی عہد بہ عہد ترقی اور تدریجی ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے اور مختلف العہد کڑیوں کو خوش اسلوبی سے جوڑا گیا ہے۔ اس میں لکھنے والوں کا تعارف بھی ملتا ہے اور رپورتاژ کا پس منظر بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

یہ جو ہم نے اوپر کہا کہ انھوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے تو اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ایک ایسے موضوع کی تاریخ لکھی ہے جس کے بارے میں اکبر کا کہنا سو فیصد درست معلوم ہوتا ہے کہ "ڈور کو سلجھا رہا ہوں اور سرا ملتا نہیں" "میر ادیب نے "پیمانہ تخیل" میں اس کی تعریف پیش کی ہے اور کوئی بھی یہ گرہ کشائی نہیں کر سکتا کہ اس کی حدود کیا ہیں اس کی پرکھ پہچان کا معیار کیا ہے لکھنے والوں نے اس قدر بے ربط اور الجھی ہوئی تعریفات لکھی ہیں کہ رپورتاژ کی حقیقت و ماہیت کثرت تعبیر سے خواب پریشاں بن کے رہ گئی اور آخر میں "شمیم کرہانی" کے اس چکر میں قاری کے ذہن میں یہ سوال کلبلاتا ہی رہ جاتا ہے کہ رپورتاژ ہے کیا؟ سچ پوچھیے تو اس سوال کا تشفی بخش جواب وہ انگریز مصنف جان کیری بھی نہیں دے پایا جس کی کتاب کو رپورتاژ پر اب تک لکھی جانے والی سب سے مستند اور غالباً رپورتاژ پر واحد تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ اب جو مشکل اعوان صاحب کو پیش آئی یہ تھی کہ وہ کس تحریر کو رپورتاژ سمجھیں کہاں سے آغاز کریں کسے شامل کریں کسے نکالیں چنانچہ گومگو کے اس عالم میں اگر ایک طرف انگریزی تاریخ نے انھیں راست سجھایا تو دوسری طرف ان کی اپنی سلامتی طبع کام آئی رپورتاژ کی معنوی مناسبتوں اور دیگر خصوصیتوں کو نظر میں رکھ کر انھوں نے مولوی اقبال علی کے سفرنامہ پنجاب کو نقطہ آغاز مانا یہ وہی مولوی اقبال علی ہیں جن کی انگریزی دانی اور زود نویسی کی حالی نے حیات جاوید میں بہت داد دی ہے اقبال علی کا سفرنامہ پنجاب اصل میں سرسید مرحوم کے پنجاب کے سفر کی داستان ہے یہ مرحلہ طے کر لینے کے بعد انھوں نے رپورتاژ نگاروں کے بارے میں بھی خاصی معلومات فراہم کر دی ہیں اور کچھ ایسی رپورتاژوں کے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں جن میں بہت سی دستبرد زمانہ کے ہاتھوں اب عوام تو کیا خواص کی رسائی سے بھی باہر ہیں۔ ایسے نوادرات کو کتاب کی صورت میں محفوظ کر دینا بہت بڑی خدمت ہے۔ یہ ناانصافی ہو گی اگر کتاب کے اس پہلو کی تعریف نہ کی جائے کہ اپنے متنوع خصائص اور بھرپور مواد کے اعتبار سے یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس سے اردو ادب کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں رہ

اردو شعر و ادب کے چار ستون

سکتا۔ مولف نے بساط بھر اردو کے ذخیرہ ادب کو کھنگالا ہے لیکن اس کا کیا کیجئے کہ یہ موضوع اپنے اندر قیامت کا پھیلاؤ رکھتا ہے اصل میں انسائیکلوپیڈیا کی سی وسعت رکھنے والا یہ کام فرد واحد کے بس کا روگ نہیں۔ اس کیلئے ایک ادارہ چاہیے اگر اردو کے جو رسائل، جرائد اور کتابیں اب تک چھپ چکی ہیں۔ صرف ان کے نام گننے کیلئے ہی ایک بھاری بھر کم دفتر کی ضرورت ہے کجا یہ کہ ان میں رپورتاژوں کی تلاش کی جائے اس کیلئے تو عمر نوح کی ضرورت ہے تو یوں ادا ہی تھا کہ بہت سے رپورتاژ نظر سے نہ گزرے حافظے میں کچھ ایسے رپورتاژوں کے نقوش ابھر رہے ہیں جن کا ذکر کسی نہ کسی عنوان سے ہو جاتا تو بہتر تھا کہ اس کے بغیر رپورتاژ کی تاریخ میں عدم تکمیل کا احساس نہ پیدا ہونے پاتا ان تحریروں کی نشاندہی حافظہ کی مدد سے کی جا رہی ہے یہیں ممکن ہے کہ مصنف کے نام یا رپورتاژ کے عنوان میں گڑبڑ ہو گئی ہو۔ ہم اس کیلئے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

◆◆◆

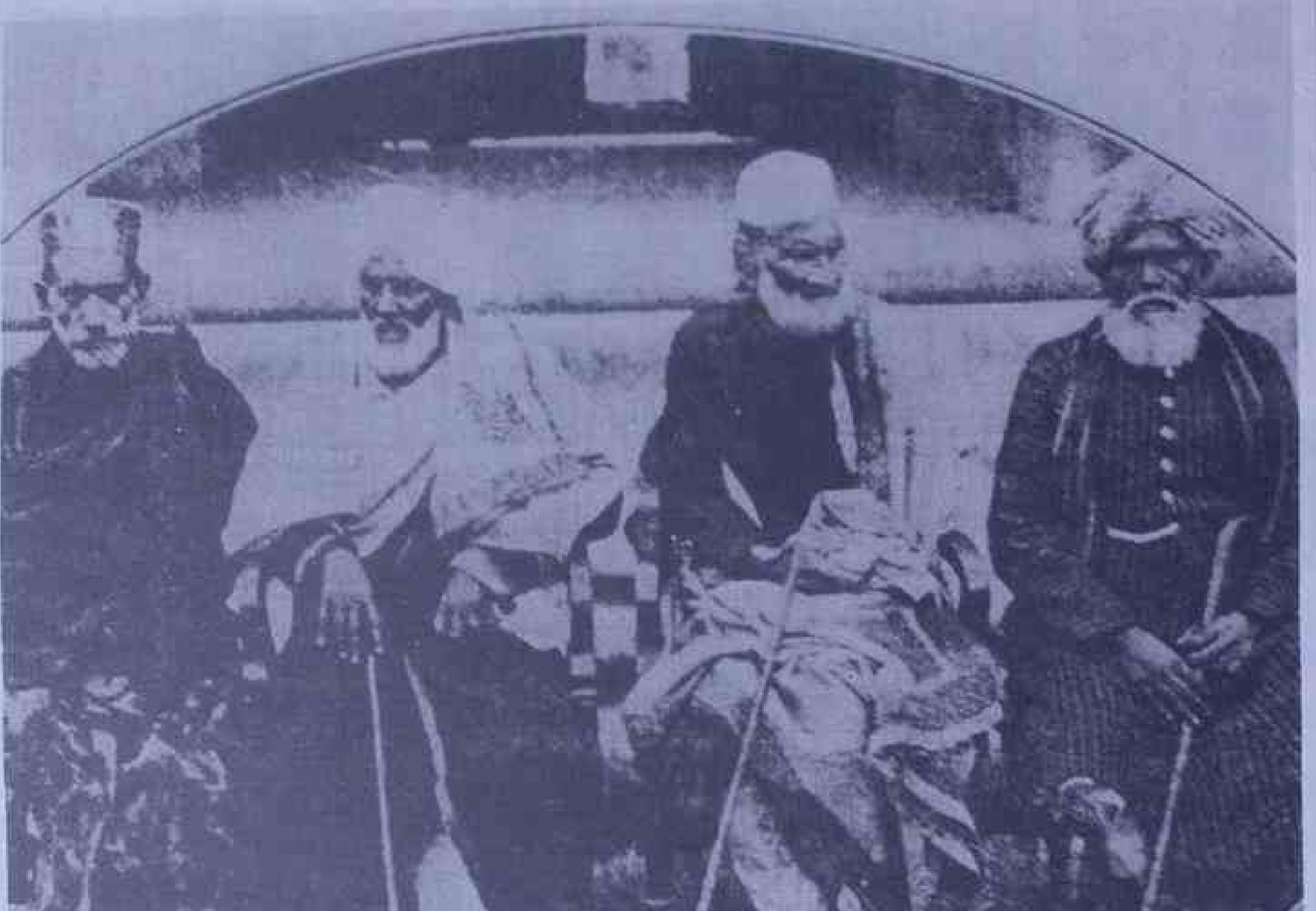

ایک تاریخ ساز تصویر :

شبلی ، میر مہدی مجروح، منشی امیر اللہ تسلیم اور حالی

NEPTUNE PHARMACY

3080 Coney Island Ave,
[Btwn. Neptune & Oceanview Aves]
Brooklyn, NY 11235

We Accept Medicaid Also.

- **We offer the best discounted prices on all prescriptions and "OTC" Drugs in town.**
- **10% Discount for Medical Professionals, Students and Senior Citizens.**

Tel: 718 332-5263 Fax: 718 368-2710

Notary, Fax & Photocopy is also Available.

SHAH JEE MOTORS

شاہ جی موٹرز

Our Name Means a Great Deal

لیمو کمپنیوں کے ساتھ
کنٹریکٹ اور ریڈیو لیز
کیلیے ہم آپکی مدد
کر سکتے ہیں۔

پریشانی کی کوئی بات نہیں!

فنانسنگ کیلیے اگر آپ کے پاس بل بجلی،
بل فون، جاب لیٹر، 1-99 پے سٹب،
ٹیکس ریٹرن بھی نہیں ہے تو کوئی بات
نہیں، ہمارے پاس تشریف لائیے

آپ کا کریڈٹ نہیں ہے یا خراب ہے
کوئی مسئلہ نہیں، ہم حاضر ہیں

No Credit / Bad Credit
Slow Credit / Bankruptcy

NO PROBLEM

گاڑی اور قیمت کی گارنٹی کا نام
شاہ جی موٹرز

بینک فنانسنگ،
بہترین سروس،
ٹی ایل سی پلیٹ کا
انتظام ہے۔

Timing
9:30am - 8:30pm

ایک ہی دن
میں
منظوری
LOW
DOWN
PAYMENT

- Best Price In Town
- Free Services for Radio Lease
- Contract with Limo Companies
- After Sale Warrenty
- Trade In
- Bank Financing Available

23-02, 37th Ave, L.I.C., NY 11101
Ph: 718-786-1787 718-786-1118 718-786-1515
Fax: 718-786-4882

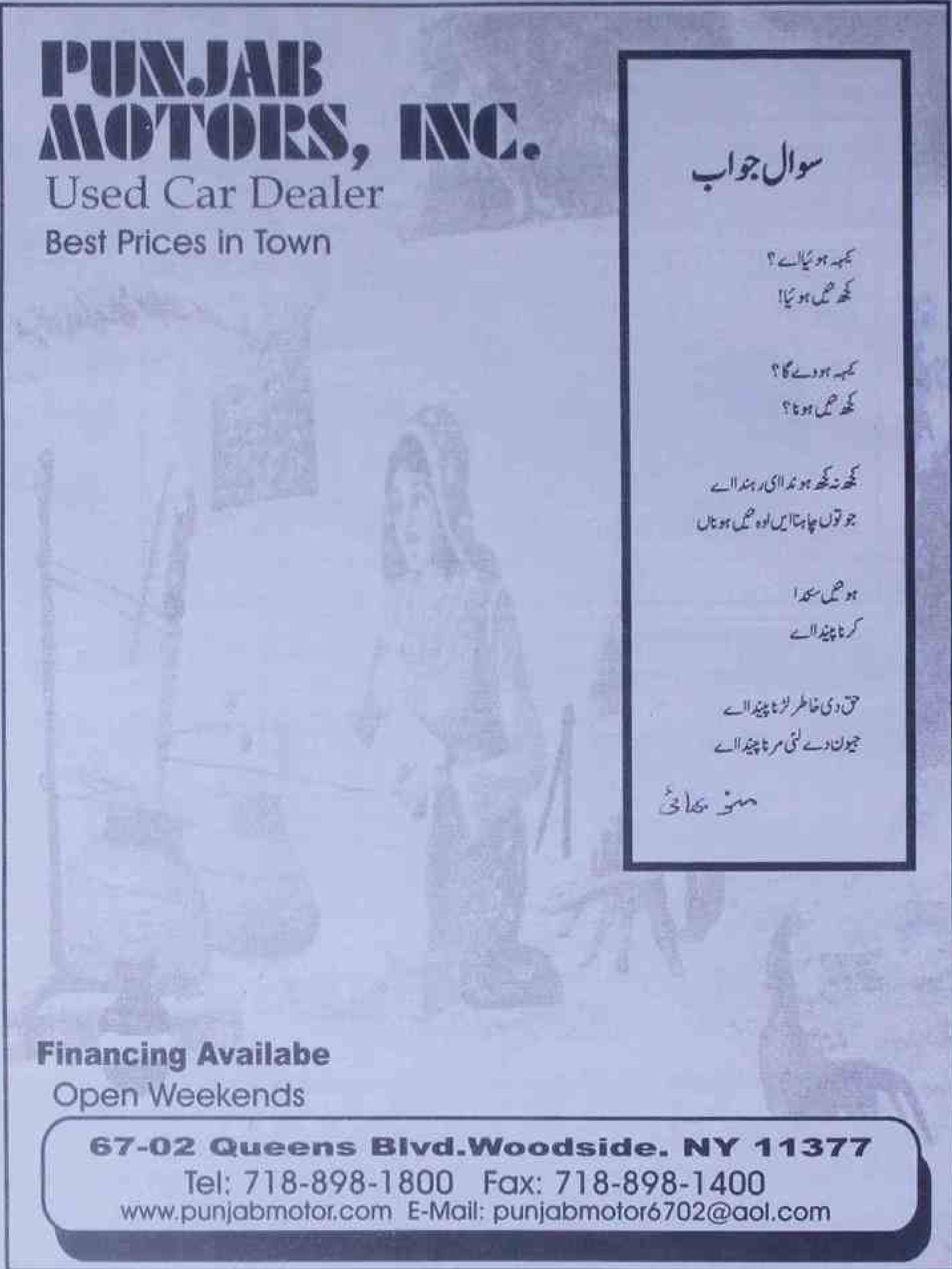

PUNJAB MOTORS, INC.
Used Car Dealer
Best Prices in Town

سوال جواب

کیہہ ہو گیا اے ؟
کجھ نہیں ہویا!

کیہہ ہووے گا ؟
کجھ نہیں ہونا ؟

کجھ نہ کجھ ہوندا ای رہندا اے
جو توں چاہنا ایں اوہ نہیں ہوناں

ہو نہیں سکدا
کرنا پیندا اے

حق دی خاطر لڑنا پیندا اے
جیون دے لئی مرنا پیندا اے

منو بھائی

Financing Availabe
Open Weekends

67-02 Queens Blvd. Woodside. NY 11377
Tel: 718-898-1800 Fax: 718-898-1400
www.punjabmotor.com E-Mail: punjabmotor6702@aol.com

LAW OFFICES OF

SHAKEEL H. KAZMI

US IMMIGRATION, CITIZENSHIP AND APPEALS, CANADIAN IMMIGRATION, REAL ESTATE, BANKRUPTCY, CIVIL & CRIMINAL CASES, BUSINESS CLOSING, DIVORCE, PARTNERSHIP & CORPORATIONS

ALL KIND OF IMMIGRATION SERVICES

IMMIGRATION Through Employment, Through Employment, Relatives, Investment and Political Asylum.

NON IMMIGRATION VISA

Tourist, Student, Investors, Temporary Workers & Executives, Work Permit, Green Card, Sponsorship For Husband, Wife & Children, Different Categories of VISA

For all your legal matters

شکیل ایچ کاظمی اٹارنی ایٹ لاء

یو ایس امیگریشن، سٹیزن شپ، کینیڈین امیگریشن، ریئل اسٹیٹ، بینک کرپسی، دیوانی اور فوجداری مقدمات، بزنس کلوزنگ، ازدواجی مسائل، پارٹنر شپ اور کارپوریشنز، مالک اور کرائے دار کے مسائل، جائیداد کی خرید و فروخت، مختار نامہ، وصیت نامہ، ٹیکس سے متعلقہ کیسز

ACCIDENTS

پھسل کر گرنا، میڈیکل میل پریکٹس، آٹو ایکسیڈنٹ، کام کے دوران حادثہ، پرسنل انجری اور ایکسیڈنٹ کیسز میں فیس صرف کامیابی کی صورت میں لی جاتی ہے۔ حادثہ کسی بھی نوعیت کا ہو موثر قانونی امداد آپ کے تحفظ کی ضمانت بن سکتی ہے

LEGAL PROBLEMS
BIG
OR
SMALL
CONSULTATION
FREE

* 72-28 BROADWAY, SUITE #4F, JACKSON HEIGHTS, NY 11372
Tel: 718-446-7474, Fax: 718-446-8416
* 67 WALL STREET, 21ST FLOOR NEW YORK, NY 10005
Tel: 212-269-7474, Fax: 212-509-3537

PUNJAB

AUTO REPAIR & TOWING

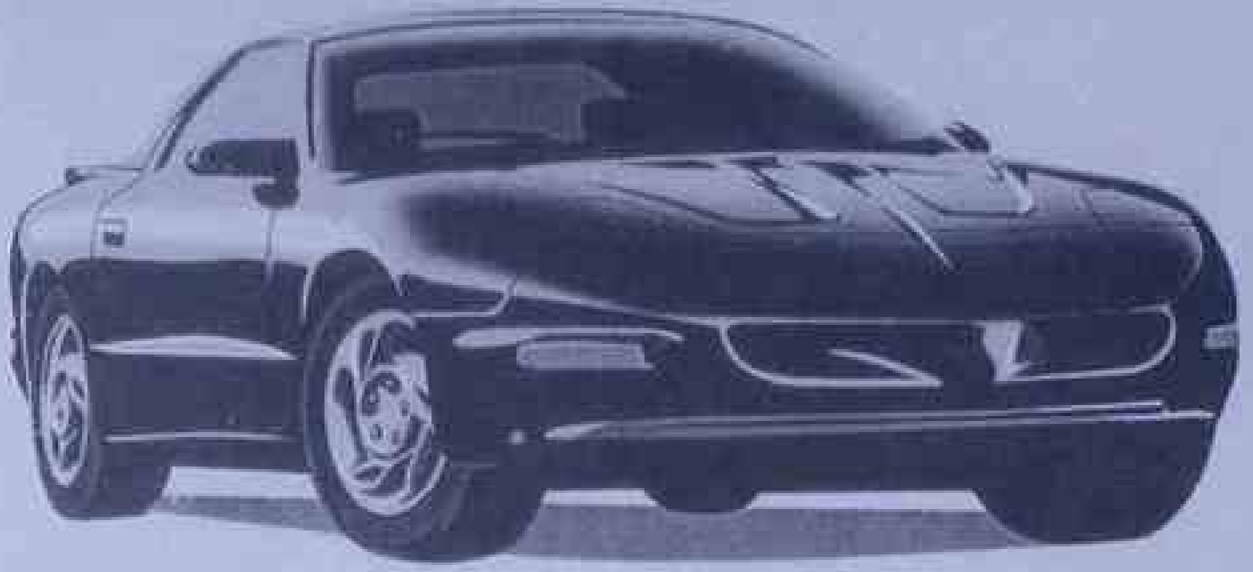

Low Price & Fully Guaranteed
Open 24 Hours - 7 Days a Week

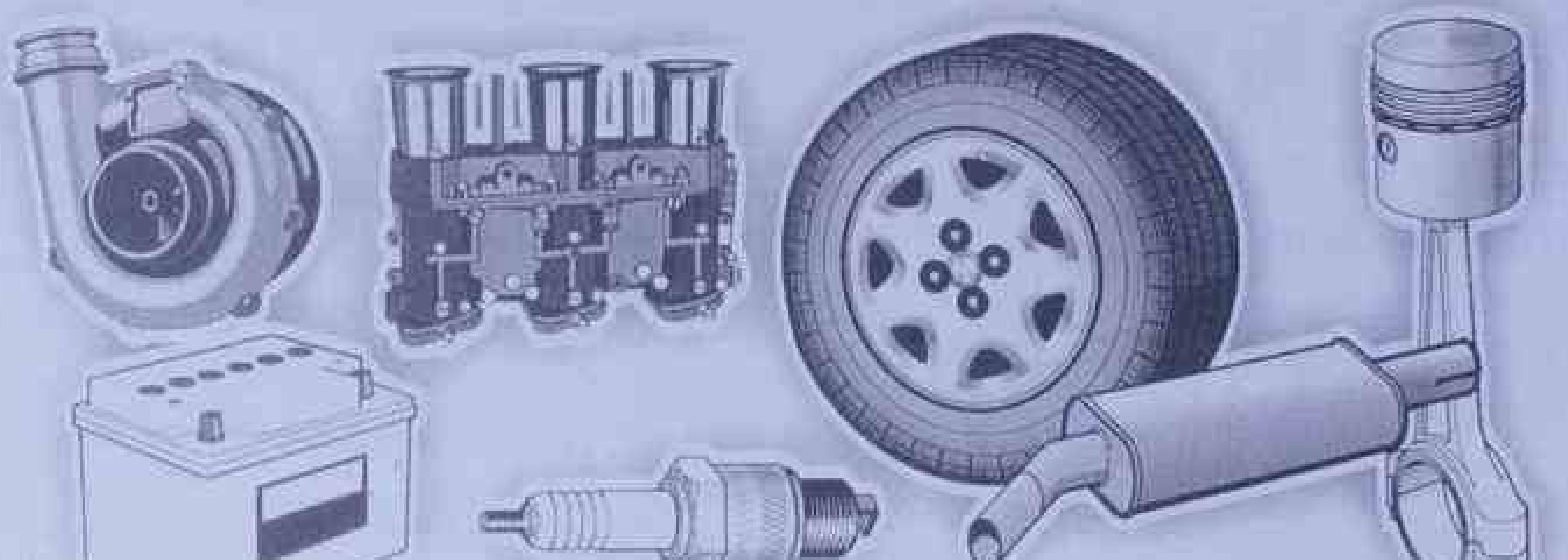

CONTACT: HAMID

134-15 Rockaway Blvd, Ozone Park, NY 11420

TEL: (718)322-4100

VITAMIN HOMEOPATHY CENTER

PITUITARY GLAND AND ITS SECRETIONS
ANTERIOR PITUITARY HORMONES
GROWTH HORMONE

اب بڑھاپے کا علاج ممکن ہے   جب تک زندہ رہیں، جوان رہیں

YOUTH FORMULA

یوتھ فارمولا

میڈیکل سائنس کی اس صدی کی حیرت انگیز دریافت

نیو انگلینڈ جرنل آف میڈیسن کے مطابق جوانی واپس لانے اور جوانی کو برقرار رکھنے پر امریکہ اور یورپ میں ہونے والی تحقیق کے بہت حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں، انسانی گروتھ ہارمون کے اثرات ان لوگوں پر بہت حیرت انگیز اثرات کے حامل رہے ہیں جو گروتھ ہارمون کی کمی کا شکار تھے۔ گروتھ ہارمون انسانی جسم میں قدرتی طور پر PITUITARY GLAND سے پیدا ہوتے ہیں جو مسلز، جلد اور ہڈیوں کی افزائش کا سبب بنتے ہیں۔ ایک خاص عمر کے بعد جب یہ ہارمون پیدا نہیں ہوتے تو جسم انسانی کے مسلز ڈھیلے پڑنے لگتے اور جلد ڈھیلی ہونے لگتی ہے۔

مسلسل تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اگر گروتھ ہارمونز کی کمی کے شکار آدمی کو گروتھ ہارمونز دیئے جائیں تو اس میں مسلز گوشت پوست ہڈی وغیرہ کے بڑھنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور چربی کم ہونے لگتی ہے۔ میڈیکل کالج آف وسکانسن اور ویٹرن افیئرز میڈیکل سینٹر ملواکی میں ہونے والی تحقیق کی رپورٹ کے مطابق ستر سال کی عمر کے کچھ افراد کو ہفتے میں تین بار انجکشن کے ذریعے گروتھ ہارمونز اتنی مقدار میں دیئے گئے جس قدر جوانی میں انسانی جسم خود پیدا کرتا ہے۔ چھ ماہ کے بعد نوٹ کیا گیا کہ ان آدمیوں میں 8.8 فیصد گوشت پوست میں اضافہ ہوا اور 14.4 فیصد چربی میں کمی واقع ہوئی، 7.1 فیصد جلد کی موٹائی بہتر ہوئی اس کے علاوہ ریڑھ کی ہڈی کے زیریں مہروں میں 1.6 فیصد موٹائی میں اضافہ ہوا ان کی طاقت ذہنی اور عام طاقت میں اضافہ ہوا۔ تحقیقات کرنے والوں کا کہنا ہے کہ گروتھ ہارمون کے اس علاج کی بدولت ان افراد کی عمروں میں کمی کے لحاظ سے دس سال کا فرق پڑا ہے۔

تحقیقات کرنے والے دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈاکٹر ڈین RUDMAN کی نیو انگلینڈ جرنل آف میڈیسن میں چھپنے والی ایک رپورٹ، دوسرے قومی اور بین الاقوامی جرائد میں بھی چھپی، اس حیرت انگیز کامیابی کا تذکرہ سائنس نیوز لیٹرز، ہوم جرنل، انگلش، سائنس، نیوز ویک، سائینٹیفک امریکن، دی نیویارک ٹائمز، ریڈرز ڈائجسٹ، مینز ہیلتھ، ڈسکور اور لائف میگزین میں بھی چھپا۔

جرائد نے لکھا کہ گروتھ ہارمون تھراپی سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بڑھاپے اور گروتھ ہارمون کی سطح کا باہمی تعلق ہے اس وقت انسانی جسم کو جو ہارمون گروتھ کی ضرورت پڑتی ہے اس کی قیمت 13,800 ڈالر ہفتہ ہے اور ان کے لینے کا طریقہ تین انجکشن فی ہفتہ ہے جو صرف امیر لوگوں کے بس کی بات ہے۔

اس کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ کوئی ایسی چیز دریافت کی جائے جو PITUTARY GLAND کو متحرک کر سکے تاکہ وہ خود گروتھ ہارمون پیدا کرنے لگے۔ اس کیلئے نیچرل یوتھ فارمولا بہترین متبادل ہے کیونکہ حالیہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ قدرتی طور پر پائے جانے والے (80) ایمینو ایسڈز ایسے ہیں جو انجکشن کے ذریعے نہیں خوراک کے طور پر کھایا جائے تو یہ جسم کے اندر جا کر PITUTARY GLAND کو متحرک کرتے ہیں اور نتیجے کے طور پر GROWTH HORMONE کی افزائش شروع ہو جاتی ہے۔

YOUYH FORMULA یوتھ فارمولا سے کیا توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں

☆ عام طور پر یوتھ فارمولا استعمال کرنے والوں کا تاثر یہ ہے کہ پہلے ماہ وہ جسمانی قوت میں اضافہ محسوس کرتے ہیں، گہری اور پرسکون نیند آنے لگتی ہے اور ذہن میں دباؤ کی حالت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

☆ دوسرے ماہ کے استعمال سے جسم کے مسلز میں مضبوطی اور سختی محسوس ہوتی ہے اور چربی والے مادے کسی قدر گھلنے لگتے ہیں۔ جلد اور چہرے کی ظاہری صورت میں بہتری کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں، کولیسٹرول کم ہونے لگتا ہے، ذہنی ارتکاز اور سیکھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

☆ تیسرے ماہ کے استعمال سے جسم کے مسلز اور گوشت ہڈی اور پوست کی افزائش کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ چربی والا حصہ گھلنے سے مسلز نمایاں ہونے لگتے ہیں اور جسم سڈول ہونا شروع ہو جاتا ہے اور زندگی میں جوانی کا لطف محسوس ہونے لگتا ہے۔

☆ تیسرے مہینے کے بعد مجموعی صحت کی بہتری کا عمل مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے۔ بڑھاپے کی واپسی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ عمل مسلسل اور درجہ بدرجہ مکمل ہوتا ہے اور بلاشبہ کچھ وقت بھی لیتا ہے اس لئے چھ ماہ تک یوتھ فارمولا کے استعمال کی سفارش کی جاتی ہے جب مکمل اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

FOR FREE CONSULTATION Queens: 718-533-0646 Bklyn.: 718-941-8155 - **Out Of New York 1-800-955-1713**
72-15 35TH AVE, JACKSON HEIGHTS, NY 11372
1017 Cortelyou Rd., Brooklyn, NY 11218

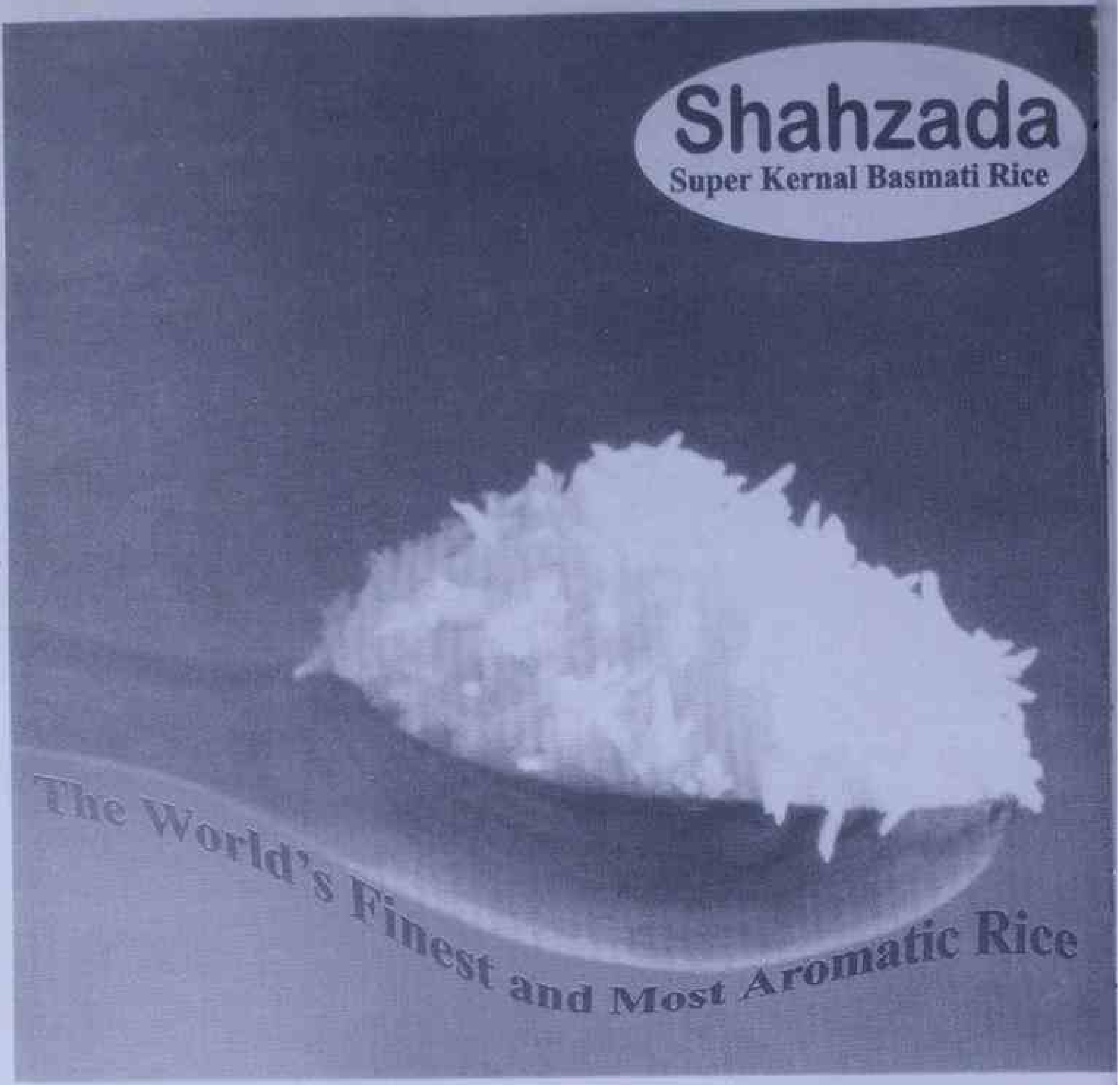
Shahzada
Super Kernal Basmati Rice
The World's Finest and Most Aromatic Rice

Quality to Taste

Shahzada

Distributed by:
Advance Food International Inc. Tel:(718)482-0123 • Fax:(718)482-4305

Habib American Bank

Habib American Bank

Member FDIC
A New York State Chartered Bank

The Local Bank with International Experience

Habib American Bank offers personalized services for its customers

- ~ Business Checking
- ~ Personal Checking
- ~ Time Deposits
- ~ Savings Accounts
- ~ IRA Accounts
- ~ Money Market Accounts
- ~ Commercial Loans
- ~ Collateral Loans
- ~ SBA Loans
- ~ Mortgages
- ~ Letters of Credit
- ~ Collections
- ~ Foreign Remittances
- ~ Wire Transfers
- ~ Safe Deposit Boxes
- ~ Traveler Checks
- ~ Cashier's Checks

Visit our convenient locations

Manhattan
99 Madison Avenue
New York, NY 10016
Tel: 212-532-4444

Queens
74-05/07 37th Avenue
Jackson Heights, NY 11372
Tel: 718-397-0890

Los Angeles
110 East, 9th St.
Los Angeles CA 90079
Tel: 213-362-1200

Prof. SHARIB RUDAULVI
COLLECTION

ریحانہ قمر اردو شاعری کے باغ کا ایک ایسا گل نو دمیدہ ہے جس کی خوشبو دور تک اور دیر تک رہے گی

امجد اسلام امجد

ریحانہ قمر جدید تر غزل کی ایک منفرد اور توانا آواز ہیں اور ان سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں

خالد احمد

ریحانہ قمر کو لمحہ موجود کی شاعرات میں بلند مقام حاصل ہے

عباس تابش

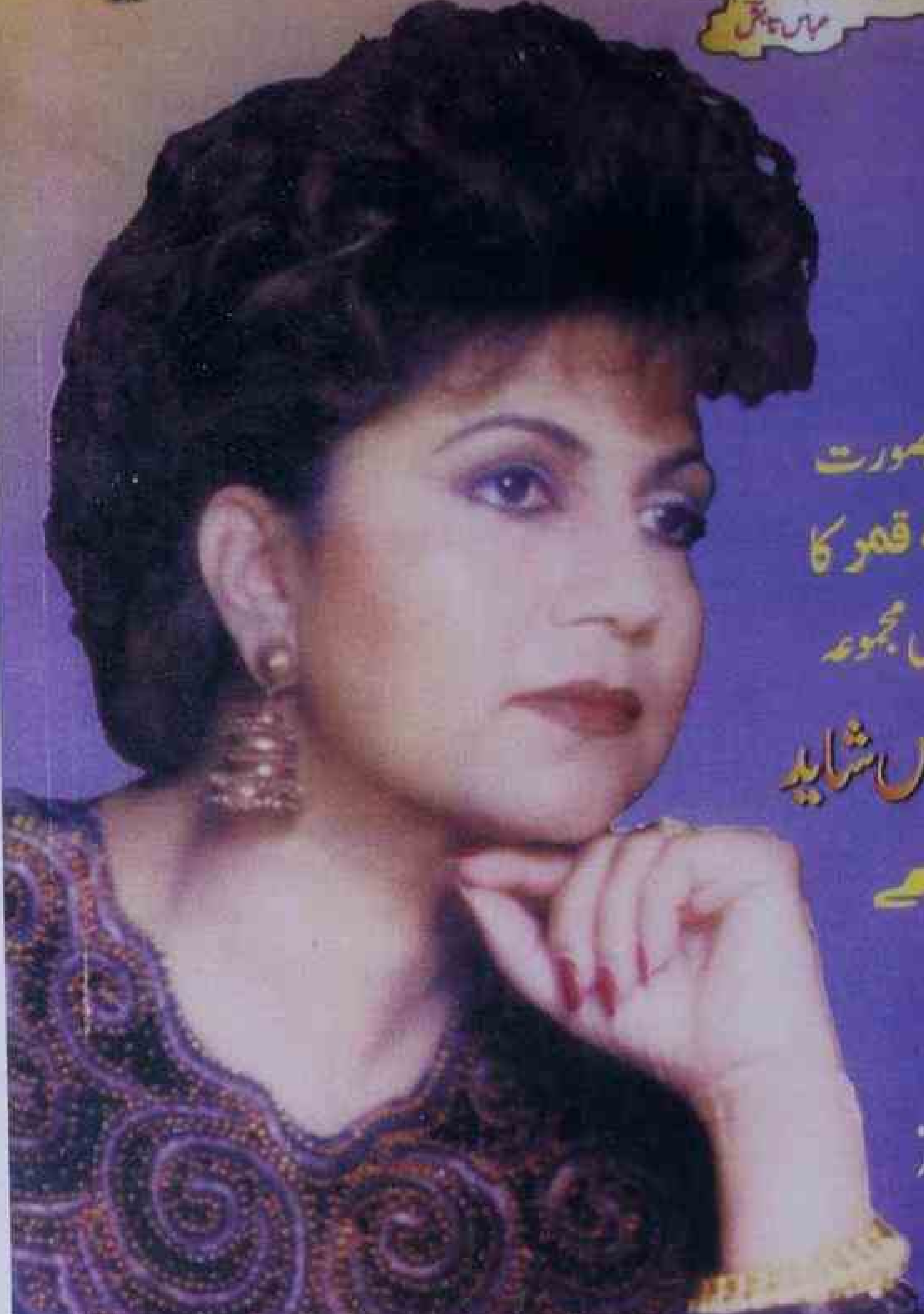

تازہ لہجے کی خوبصورت
شاعرہ ریحانہ قمر کا
تیسرا شعری مجموعہ

ہم پھر نہ ملیں شاید

شائع ہو گیا ہے

الرزاق پبلی کیشنز
110 عرفان چیمبرز
130 ٹمپل روڈ لاہور
فون 7238501

LONGINES
L'ELEGANCE DU TEMPS DEPUIS 1832
SWISS MADE

Longines
DolceVita

73-15 Broadway
(Corner of 73rd St. & Broadway)
Opp. Long Island Savings Bank
Jackson Heights, NY 11372
TEL: (718)803-0288

مون
MOON
Jewlers